خاکہ تحقیق

بابِ اوّل

عالم اسلام کے حالات

انیسویں و بیسویں صدی عیسوی میں

تعارف

اس باب میں ''عالم اسلام کے انیسویں اور بیسویں صدی کے حالات'' قلمبند کئے ہیں۔ فصل اوّل میں ''انیسویں و بیسویں صدی کے سیاسی حالات'' تحریر کیے ہیں۔ فصل دوم میں ''انیسویں اور بیسویں صدی کے معاشرتی حالات'' اور فصل سوم میں ''تعلیمی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے'' تفصیلاً تحریر کیے ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسویں میں عالم اسلام کی کیا حالت تھی۔ جبکہ چوتھی فصل میں ''انیسویں و بیسویں صدی کی برصغیر کی صورتحال'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔

لہٰذا اگلے چند صفحات میں سلطنت عثمانیہ، وسط ایشیا، افریقہ، ایران، افغانستان اور برصغیر پاک و ہند کے حالات کا مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا۔

فصلِ اوّل:

انیسویں و بیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام کی صورتحال کا جائزہ

سترہویں صدی عیسوی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی کہلاتی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں اسلامی دنیا کا بیشتر حصہ چار بڑی حکومتوں میں منقسم تھا۔ پاک و ہند میں تیموریوں کی عظیم الشان سلطنت قائم تھی۔ ایران میں صفوی خاندان کا دور تھا۔ بغداد سے الجزائر تک اور ہنگری سے عدن تک عثمانی سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا اور مغرب اقصیٰ میں مراکش سے سوڈان تک مراکش کے خاندان فلالی کی حکومت قائم تھی۔ مسلمان افتراق و انتشار سے بڑی حد تک بچے ہوئے تھے اور خوشحالی و امن کا دور دورہ تھا۔ زراعت، صنعت، تجارت اور علوم و فنون میں تیزی سے ترقی ہو رہی تھی۔ لیکن یہ عروج سیاسی و تمدنی لحاظ سے تھا۔ اخلاقی اور علمی لحاظ سے مسلمان زوال کی طرف جا رہے تھے(1)۔

مسلمانوں کا یہ عروج ایک ہزار سال تک رہا۔ دنیا کی کسی قوم کو اتنے عرصے کا عروج نہیں ملا۔ یونانیوں کا عہد عروج دو سو سال میں ختم ہو گیا۔ رومی چار سو سال تک دنیا کی عظیم طاقت بنے رہے۔ موجودہ یورپ کے عروج کو ابھی تین سو سال نہیں ہوئے۔ صرف چینیوں نے مسلمانوں کے برابر عروج حاصل کیا۔ لیکن وہ صرف چین اور اس کے قریبی علاقوں تک محدود تھا۔ برخلاف اس کے مسلمان دنیا کے بیشتر حصے پر چھائے ہوئے تھے(2)۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز تک اسلامی سلطنتیں سیاسی لحاظ سے یورپ کی مسیحی طاقتوں کی دست بُرد سے آزاد رہیں لیکن اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں اسلامی سلطنتوں کے حالات بگڑے شروع ہوئے اور انیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا انحطاط انتہائی درجے تک پہنچ گیا(3)۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کی کوئی ایک تاریخ متعین کرنا مشکل ہے۔ ۱۶۸۲ء/۱۰۹۴ھ میں ویانا کے محاصرے میں ترکوں کو ناکامی ہوئی۔ ۱۶۸۷ء/۱۰۹۹ھ میں ہنگری ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مشرق بعید میں ۱۶۸۲ء/۱۰۹۳ھ میں باٹنن پر ولندیزی حکومت قائم ہوئی۔ جبکہ مراکش اور مشرقی افریقہ کے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کو کامیابیاں ملیں۔ ایران میں ۱۷۳۵ء/ ۱۱۴۸ھ میں نادر شاہ نے زار روس کی حکومت کو ایرانی مقبوضات چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں مرہٹوں کو کامیابیاں ملیں۔ لہٰذا اس ساری صورت حال میں ۱۷۰۷ء/ ۱۱۱۹ھ یعنی اورنگزیب عالمگیر کے سالِ وفات کو اسلامی دنیا کے زوال کی تاریخ مقرر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے(4)۔

اس فصل میں چونکہ انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کی صورتحال کا جائزہ لینا مقصود ہے۔ لہٰذا اگلے چند صفحات میں سلطنت عثمانیہ اور افریقہ کی اسلامی ریاستوں، ایران، افغانستان اور برصغیر پاک و ہند کے حالات کا مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ مولانا عبیداللہ سندھی کے حوالے سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس حصے کے لیے الگ فصل قائم کی جائے گی(5)۔

تیرہویں صدی عیسوی کے وسط میں بنوعباس کی سلطنت سقوط بغداد جیسے المناک سانحے کے ساتھ ختم ہوگئی۔ جس میں ہلاکوخان کے ہاتھوں بغداد کا حشر نشر ہوتے دیکھ کر لگتا تھا کہ شاید پھر کبھی دنیا میں مہذب قومیں سر نہ اٹھا سکیں گی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ایک سلطنت عثمانیہ نے قائم ہونا تھا جس نے صدیوں تک حکومت کرنی تھی۔ عثمانی سلطنت کا آغاز ۱۳۰۰ء/۷۰۰ھ میں ہوا(6)۔

عثمانی ترک منگولیا سے آئے۔ وسطی ایشیاء کے ایرانی قبائل سے خلط ملط ہوئے۔ پھر ایشیائے کوچک میں داخل ہوئے۔ جہاں آہستہ آہستہ کچھ سلجوقیوں کو نکالا اور کچھ کو جذب کر لیا(7)۔ دراصل قونیہ کے سلطان علاؤالدین سلجوقی کے خلاف ہلاکوخان کی فوج نبرد آزما تھی اور قریب کے علاقے میں ترکوں کے ایک قبیلے کے سردار سلیمان خان نے اپنے بیٹے ارطغرل خان کو مسلمان سلطان کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ صرف ۴۴۴ سواروں کے ساتھ ارطغرل خان نے تاتاریوں کی فوج کو شکست دی(8)۔

سلطان علاؤالدین نے اپنی سلطنت قونیہ میں ایک جاگیر انعام کے طور پر دی اور یہی جاگیر آگے چل کر سلطنت عثمانیہ کے قیام کا سبب بن گئی کیونکہ ارطغرل خان نے مسلسل علاؤالدین کے لئے فوجی خدمات سرانجام دیں اور اپنے علاقے کو وسیع کر لیا(9)۔

سلطان علاؤالدین کے بعد ۱۲۳۶ء/۶۳۴ھ میں سلطان غیاث الدین کیخسرو تخت نشین ہوا۔ جس نے ۱۲۴۳ء/۶۴۱ھ میں مغلوں کو خراج دینا منظور کر لیا۔ اسی اثناء میں ارطغرل خان کے ہاں ۱۲۵۸ء/۶۵۷ھ کو عثمان خان کی پیدائش ہوئی۔ ۱۲۸۸ء/۶۸۷ھ میں جب عثمان خان تیس سال کا تھا ارطغرل خان نے وفات پائی۔ عثمان خان کو والد کی جاگیر شاہ قونیہ کی طرف سے عطا ہوئی اور اسی سال غیاث الدین کیخسرو نے عثمان خان کو رئیس العسکر بنا کر اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دی۔ سلطان غیاث الدین کیخسرو ۱۲۹۹ء/۶۹۹ھ کو مقتول ہوا تو اس کی اکلوتی بیٹی کے خاوند ہونے کی حیثیت سے قونیہ سلطنت عثمان خان کو مل گئی اور یہی ایشیائے کوچک کا علاقہ سلطنت عثمانیہ کے نام سے مشہور ہوا(10)۔

عثمانی سلطان یکے بعد دیگرے اپنی سلطنت کا دائرہ وسیع کرتے رہے۔ جب بانی سلطنت عثمان خان نے ۱۳۲۶ء/۷۲۷ھ میں وفات پائی تو سلطنت کا طول ایک سو بیس میل اور عرض تقریباً ساٹھ میل تھا۔ سلطان سلیمان اعظم کے زیر حکومت ۱۵۵۰ء/۹۵۷ھ میں سلطنت کا رقبہ چالیس لاکھ مربع میل سے تجاوز کر چکا تھا(11)۔

اس دوران ایک اور تاریخ ساز واقعہ یہ ہوا کہ سلطان محمد ثانی نے رومی بازنطینی سلطنت کے پایہ تخت قسطنطنیہ کو ۱۴۵۳ء/۸۵۶ھ میں فتح کیا اور اسے اپنا دارالخلافہ بنایا۔ یہی سلطان محمد فاتح کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بعد میں قسطنطنیہ استنبول کے نام سے مشہور ہوا(12)۔

قسطنطنیہ کی فتح کے بعد عثمانی سلطان محمد فاتح، سلطان بایزید ثانی، سلطان سلیم اول اور سلطان سلیم اعظم نے سلطنت عثمانیہ کے یورپی مقبوضات میں انتہائی اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ عیسائیوں پر عثمانیوں کی اتنی دھاک بیٹھ چکی تھی کہ وہ صرف نام سن کر کانپنے لگ جاتے تھے۔ عثمانی سلطان ویانا (موجودہ آسٹریا کا دارالحکومت) کی دیواروں تک ہو کر واپس آ گئے تھے۔ اگر یہ

سردیوں کے لیے مناسب تیاری کر کے جاتے تو ویانا کی فتح کے بعد پورے یورپ یعنی فرانس کے ساحلوں تک آسانی سے چلے جاتے اور ظالم عیسائیوں سے اندلسی مسلمانوں کی بربادی اور جلاوطنی کا بدلہ لے سکتے تھے(13)۔

سلطنت عثمانیہ کی تباہی کی پہلی گھنٹی اس وقت بجی جب سینٹ گاتھرڈ کے میدان میں عثمانیوں کو پہلی بار آسٹریا کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ یہ ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد ۱۰۹۴ھ/۱۶۸۳ء میں عثمانیوں نے ویانا پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اب ترکوں کی پہلی شان باقی نہیں رہی تھی اور اہل یورپ پر انکشاف ہوا کہ عثمانیوں کی شوکت وسطوت کو زوال آچکا ہے۔ اسی دوران یورپی حکومتوں نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے(14)۔ عثمانی سلطنت جہاں سیاسی طور پر مستحکم تھی وہیں پر اخلاقی اور علمی لحاظ سے اس کا زوال شروع ہو چکا تھا اور سترہویں صدی عیسوی میں علمی واخلاقی لحاظ سے مسلمان انتہا کو چھو رہے تھے(15)۔

انیسویں صدی کے آغاز میں اگرچہ سلطنت عثمانیہ عالم اسلام کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور اس کے مقبوضات تین براعظموں یعنی یورپ، افریقہ ایشیاء کے علاقوں پر مشتمل تھے لیکن اخلاقی، علمی اور فکری لحاظ سے اس میں بہت سی کمزوریاں آ گئی تھیں۔ خصوصاً مغرب کے فکری حملے انتہائی شدید تھے اور مسلمانوں میں انتشار کا سبب بن رہے تھے۔ سلطنت عثمانیہ ان فکری حملوں کی زد میں احمد (۳۰-۱۷۰۳ء/۱۱۴۲-۱۱۱۵ھ) کے دور حکومت میں آ چکی تھی۔ محمود اول (۵۴-۱۷۳۰ء/۱۱۶۸-۱۱۴۳ھ) نے اسے اور آگے بڑھایا۔ سلیم ثالث (۱۸۰۷-۱۷۸۹ء/۱۲۲۲-۱۲۰۴ھ) اور محمود ثانی (۳۹-۱۸۰۸ء/۵۵-۱۲۲۳ھ) کے دور میں اس فکر کی پیش قدمی جاری رہی جس کا نتیجہ بالآخر عبدالمجید خان (۶۱-۱۸۳۹ء/۱۲۷۸-۱۲۵۵ھ) کے ذریعہ اصلاحات اور تنظیمات خیریہ کی شکل میں برآمد ہوا(16)۔

اندرونی خلفشار کے ساتھ ساتھ بیرونی طور پر سلطنت عثمانیہ کا زوال انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ آسٹریا کے ایک شہزادے نے ۱۷۹۹ء میں زنطا کے مقام پر عثمانیوں کو زبردست شکست دی اور اس کے نتیجے میں کالووٹز (Karlowitz) کا جو معاہدہ امن طے پایا وہ یورپی فتح اور عثمانی سلطنت کے زوال کا سنگ میل ثابت ہوا۔ اس معاہدے کی رُو سے سلطنت عثمانیہ نے اپنے متعدد مقبوضات پر یورپی اقتدار تسلیم کر لیا۔ مثلاً یوکرائن اور پوڈولیا پر پولینڈ کا اختیار تسلیم کر لیا۔ موریا پر وینس کا قبضہ مان لیا۔ بعض علاقے روس اور آسٹریا کو مل گئے۔ اس معاہدے کا اثر بیرونی طور پر تو یہ ہوا کہ عثمانیوں کی شان و شوکت کمزور ہوگئی اور عثمانی معاہدہ کرنے کی وجہ سے دفاعی انداز اختیار کر گئے۔ چند اسلامی ممالک کی طرف اقتدار میں اضافہ ہوا لیکن یورپی مقبوضات پر عثمانی سلاطین کی گرفت کمزور پڑتی گئی اور یکے بعد دیگرے بہت سے علاقے ان کے ہاتھ سے نکل گئے(17)۔

سلطنت عثمانیہ انیسویں صدی عیسوی میں آہستہ آہستہ بکھر رہی تھی۔ ۱۸۵۴ء/۱۲۷۰ھ میں روس نے کریمیا پر قبضہ کر لیا۔ فرانس، اٹلی اور انگلستان بہت سے عرب اور غیر عرب علاقوں پر قابض ہونے لگے۔ الجیریا، تیونس اور لیبیا بھی عثمانیوں کے اقتدار سے باہر ہو گئے۔ انگریزوں نے فوجی امداد کے عوض قبرص جزیرے کا انتظام سنبھال لیا۔ ۱۸۷۸ء میں روس اور ترکی کی

جنگ میں انتہائی کمزور ہونے کے باعث ترکی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بلقان کی ریاستیں باغی ہو کر آزاد ہو گئیں۔ یونان پہلے ہی عثمانیوں کی سیاسی کمزوریوں کے باعث آزاد ہو چکا تھا۔ گویا تقریباً جنوب مشرقی یورپ سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور ترکی کو یورپ کے "مرد بیمار" کا لقب دے دیا گیا(18)۔

جہاں تک یونانی مقبوضات میں مصر، شام اور نجد و حجاز کا تعلق ہے تو انیسویں صدی کے پہلے تیس سالوں میں مصر سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا اور محمد علی مصر کا والی تھا۔ مصر کی تاریخ کو دیکھیں تو مصر بنو عباس کی خلافت کا ایک حصہ تھا۔ بنو عباس کے خلیفہ ہارون الرشید کے دور ۸۰۱ء/ ۱۸۵ھ میں ابراہیم بن اغلب نے قیروان کی گورنری کی بجائے قیروان کو ایک آزاد ریاست بنالیا اور بنو اغلب نے ۸۰۱ء/ ۱۸۵ھ سے ۹۰۹ء/ ۲۹۷ھ تک اس علاقے پر حکمرانی کی(19)۔

بنو اغلب کے بعد قیروان پر بنو فاطمہ نے ۹۰۹ء/ ۲۹۷ھ سے ۱۱۷۱ء/ ۵۱۱ھ تک حکومت کی۔ یہ شیعہ کے ذیلی گروہ اسماعیلیہ سے تعلق رکھتے تھے اور عبیداللہ مہدی نے اس سلسلے کا باقاعدہ آغاز ۹۱۰ء/ ۲۹۸ھ میں کیا۔ عبیداللہ مہدی نے یہ مشہور کیا کہ وہی مہدی موعود ہے اور اس طرح طرابلس، عروبہ، صقلیہ اور مراکش کے کئی شہروں کو فتح کر کے اپنی حکومت کو جاری کیا(20)

بنو فاطمہ کے چوتھے حکمران ابوتمیم معداللہ بن اسماعیل (المعروف المعز بن اسماعیل) نے مصر کے امراء کی درخواست پر مصر میں مداخلت کی اور کمانڈر جوہر کو بھیجا۔ کمانڈر جوہر نے قاہرہ کی بنیاد رکھی جو بعد میں فاطمی سلطانوں کا دارالخلافہ بنا(21)۔

مصر کی مہم سے فارغ ہو کر کمانڈر جوہر نے ۹۷۳ء/ ۳۶۳ھ تک شام اور حجاز کے علاقے بھی فاطمی سلطنت میں شامل کر دیے(22)۔ فاطمی سلطنت اندرونی خلفشار اور جھگڑوں کے باعث چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی اور شام، فلسطین اور دوسرے صوبے مرکزی حکومت سے الگ ہو گئے۔ سلجوقی ترکوں نے فاطمیوں کے مقبوضات پر دست درازی شروع کر دی اور دوسری طرف عرب قبیلوں نے چڑھائی کر دی۔ صلاح الدین ایوبی نے بالآخر ۱۱۷۱ء میں فاطمی سلطنت کے چراغ کو گل کر دیا(23)۔

مصر میں ۱۲۵۰ء/ ۶۴۸ھ سے ۱۵۱۷ء/ ۹۲۳ھ تک مملوک حکمرانوں کی بادشاہت قائم رہی۔ یہ مملوک مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے(24)۔ ان مملوک سلاطین کو ۱۴۸۱ء/ ۸۸۶ھ میں عثمانی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر ۲۴ جنوری ۱۵۱۶ء/ ۹۲۲ھ کو حلب کے قریب مملوک اور ترک فوج میں تصادم ہوا۔ جدید اسلحے کی وجہ سے عثمانیوں نے فتح حاصل کی اور شام پر بھی قبضہ کرنے کے بعد عثمانی فوج مصر میں داخل ہو گئی۔ اب مصر عثمانی سلطنت کا ایک صوبہ بن چکا تھا۔ اس کے علاوہ مکہ و مدینہ خود بخود اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے کیونکہ وہ پہلے سے مصر کے زیر حکومت چلے آ رہے تھے(25)۔

مصر میں عثمانی سلطنت کے تحت مختلف والی مقرر ہوتے رہے۔ ۱۵۱۶ء/ ۹۲۲ھ سے لے کر انیسویں صدی کے آغاز تک یہ سلسلہ برابر چلتا رہا۔ ۱۸۳۱ء/ ۱۲۴۵ھ میں مصر کے والی محمد علی نے بغاوت کر دی اور اس کے بیٹے ابراہیم کی زیر کمان مصری فوجوں نے شام کو بھی فتح کر لیا۔ سلطان ترکی عبدالمجید خان نے ۱۸۳۹ء/ ۱۲۵۵ھ میں مصر سے صلح کر لی اور شام عثمانی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ جبکہ دوسری طرف محمد علی نے مصر پر عثمانی سلطان کی بالادستی قبول کر لی اور مصر پھر سے عثمانی سلطنت کا صوبہ بن گیا۔ لیکن اب

صورتحال مختلف تھی یعنی برائے نام ایک مقررہ رقم کی ادائیگی اور سلطان کے خطبے کے علاوہ مصر تقریباً آزاد تھا۔ بالآخر ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء میں انگلستان کے مصر پر قبضہ کے بعد یہ علاقہ سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے نکل گیا(26)۔

انیسویں صدی کے آغاز میں نجد وحجاز میں وہابیوں کی حکومت قائم تھی اور محمد علی کی بغاوت کے وقت ۱۸۳۷ء/ ۱۲۵۳ھ میں مصر نے امیر نجد پر حملہ کر کے نجد کو دوبارہ مصر کے زیرنگیں کر لیا۔ مصر کی طرف سے نجد کے والی مقرر ہونے لگے(27)۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء/ ۱۲۸۸ھ میں سعود تخت نشین ہوا اور اس نے ترکوں سے مفاہمت کی کوشش کی لیکن اس کے قاصد کو قید کر لیا گیا اور یہ کوشش ناکام ہوگئی(28)۔

سلطنت عثمانیہ سے جو بغاوت وہابیوں نے کی اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکی میں جب اصلاحات کا دور دورہ تھا تو ترک سلاطین نے مذہب کو پس پشت ڈال کر اپنے قوانین مرتب کیے۔ جبکہ نجد وحجاز کے لوگ خلافت حقیقی چاہتے تھے اس لیے انہوں نے بغاوت کر دی اور بہت سے قتل وخون کے بعد نجد میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ۱۸۲۳ء/ ۱۲۳۹ھ سے لے کر ۱۸۹۱ء/ ۱۳۰۹ھ تک نجد وحجاز پر وہابیوں کا اقتدار رہا(29)۔ ۱۹۱۶ء/ ۱۳۳۵ھ کے بعد شریف حسین نے عربوں میں قوم پرستی کے جذبات پیدا کر کے عثمانی سلطنت سے علیحدگی اختیار کر لی(30)۔

تیونس ۱۵۷۴ء/ ۹۸۲ھ سے ۱۸۸۱ء/ ۱۲۹۹ھ تک سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا۔ سترہویں صدی کے آغاز سے باب عالی کی بالادستی برائے نام رہ گئی۔ ۱۷۱۰ء/ ۱۱۲۲ھ میں حسین بے نے نئے حکمران خاندان کی بنیاد رکھی۔ احمد بے(۱۸۳۹ء/ ۱۲۵۵ھ تا ۱۸۵۵ء/ ۱۲۷۲ھ) کے عہد میں مغربی نظریات تیونس میں پھیلنا شروع ہوگئے۔ صادق بے ۱۸۵۹ء/ ۱۲۷۶ھ تا ۱۸۸۲ء/ ۱۳۰۰ھ کے زیرنگرانی بہت سے ترقیاتی کام ہوئے جن کی وجہ سے تیونس مغربی ملکوں کا مقروض ہوگیا(31) اور ۱۸۶۹ء/ ۱۲۸۶ھ میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے تیونس کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ خیر الدین پاشا وزیر اعظم کے دور (۱۸۷۳ء/ ۱۲۹۰ھ تا ۱۸۷۷ء/ ۱۲۹۴ھ) میں کچھ بہتری آئی لیکن پاشا کے جلاوطن ہونے کے بعد تیونس کے حالات خراب ہو گئے اور قرضوں کی ادائیگی کے لیے ٹیکس لگانا پڑے جن کی وجہ سے اندرونی حالات خراب ہوئے اور ان حالات کو بنیاد بنا کر فرانس نے ۱۸۸۱ء/ ۱۲۹۹ھ میں فوجی مداخلت کی اور تیونس میں بے خاندان کی حکومت کو فرانس کے ماتحت کر دیا گیا(32)۔

مصر پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ۱۵۱۷ء/ ۹۲۳ھ میں ہوا لیکن اٹھارویں صدی عیسوی میں ترکوں کا اقتدار کمزور پڑنے لگا۔ مملوک ترکوں نے مصر کو نیم آزاد علاقہ بنالیا۔ فرانس نے نپولین کی سربراہی میں ۱۷۹۸ء/ ۱۲۱۳ھ میں مصر پر قبضہ کر لیا لیکن چونکہ یہ علاقہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے فرانس کا بہترین اڈا بن رہا تھا اس لئے ترکوں نے برطانوی فوجوں کی مدد سے ۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۶ھ میں فرانس کی فوجوں کو مصر سے نکال دیا۔ اسی تعاون کی وجہ سے ترک ٹیپو سلطان کی مدد نہ کر سکے۔ فرانس کے ساتھ جنگ میں ایک البانوی افسر محمد علی نے نمایاں کارنامے دکھائے تو فتح کے بعد مصر کا والی محمد علی کو بنا دیا گیا جس نے مصر کو بہت ترقی دی(33)۔

محمد علی کے زمانے میں ہی نجد، یونان اور شام کے علاقے مصر کے ماتحت آ گئے۔ ۱۸۴۱ء/ ۱۲۵۷ھ میں سلطان ترکی نے

شام واپس لے کر محمد علی کے خاندان میں مصر کی ولایت لکھ دی(34)۔ محمد علی کے بعد اسماعیل پاشا(۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ تا ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ) نمایاں حکمران رہا۔ اس نے بھی مصر کو خوب ترقی دی لیکن فضول خرچیوں اور بے مقصد اسراف سے یہ آہستہ آہستہ انگلستان کے قرضوں میں دھنس گیا۔ آخر تنگ آ کر جب اسماعیل پاشا نے بغاوت کی تو برطانیہ اور فرانس نے ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ میں ترکی پر دباؤ ڈال کر اسماعیل کو معزول کروا دیا اور اس کے بیٹے توفیق پاشا کو وزیر بنوا دیا۔ اسی دوران اعرابی پاشا نے بغاوت کی(35)۔ جسے ۱۸۸۲ء/۱۳۰۰ھ میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور برطانوی فوجوں نے مصر کے اکثر و بیشتر معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لئے(36)۔

اب شمالی افریقہ میں مراکش یا المغرب کا علاقہ بچ گیا تھا۔ مراکش میں فلالی شرفاء کی حکومت ۱۶۶۴ء/۱۰۷۵ھ سے لے کر ۱۷۲۷ء/۱۱۴۰ھ تک رہی۔ یہ حسنی سید تھے اور ان کو علوی بھی کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کا پہلا حکمران مولائے شریف تھا اور طاقتور ترین حکمران مولائے اسماعیل (۱۶۷۲ء/۱۰۸۳ھ تا ۱۷۲۷ء/۱۱۴۰ھ) تھا جو مولائے شریف کا بھائی تھا(37)۔

مولائے اسماعیل کے بعد کئی با صلاحیت حکمران تخت پر بیٹھے لیکن مراکش کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ مولائے سلیمان(۱۷۹۵ء/۱۲۱۰ھ تا ۱۸۲۲ء/۱۲۳۸ھ) کا دور مراکش کے وقار کا آخری دور کہلاتا ہے۔ اس کے بعد مولائے عبدالرحمٰن (۱۸۲۲ء/۱۲۳۸ھ تا ۱۸۵۹ء/۱۲۷۶ھ) کے عہد میں مراکش کا فرانس سے جھگڑا ہوا اور الجزائر اور مراکش کے درمیان سرحد بندی کر دی گئی جس سے مراکشی حکومت کی کمزوری سب پر عیاں ہوگئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں یورپی حکومتوں نے جو بندر بانٹ کی اس میں فرانس اور اسپین نے خفیہ معاہدے کے ذریعے مراکش کو تقسیم کر لیا اور مداخلت شروع کر دی یہاں تک کہ

۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ میں فرانس اور اسپین نے خفیہ معاہدے کے ذریعے مراکش کو تقسیم کر لیا اور مداخلت شروع کر دی یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء/۱۳۳۱ھ میں فرانس اور اسپین نے اپنے اپنے حصے براہِ راست قبضے میں لے لیے(38)۔ کچھ اسی قسم کے حالات مغربی افریقہ میں پرتگال، نائیجیریا، بورنو، چاڈ اور ودائی کی مملکتوں کے ساتھ پیش آئے(39)۔ مشرقی افریقہ میں عمان، اریٹریا، صومالیہ اور سوڈان کے حالات بھی زیادہ مختلف نہیں(40)۔

ایران میں ۱۵۰۰ ق م میں آریاؤں کی مسلسل آمد شروع ہوئی اور انہوں نے ہی اسے ایران کا نام دیا تھا(41)۔ ظہور اسلام سے پہلے ایران میں ساسانی خاندان کی حکومت تھی اور سارا ملک زرتشتی مذہب کا پیرو تھا لیکن جب اسلام کی روشنی پہنچی تو ایرانیوں نے اسلام کو دل و جان سے قبول کر لیا۔ صفوی اور قاچاری عہد میں روسی اور انگریزی نمائندوں نے ایران میں مسلمانوں کو آپس میں لڑوا کر وہی کارنامہ سرانجام دیا جو عرب ممالک میں لارنس آف عریبیہ نے سرانجام دیا تھا(42)۔

۱۷۲۲ء/۱۱۳۵ھ میں اصفہان پر افغانی قبضہ کے بعد افشار خاندان ایران پر قابض ہوا۔ جس میں نادر شاہ (۱۷۳۲ء/۱۱۳۶ھ تا ۱۷۴۶ء/۱۱۴۵ھ) خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ نادر شاہ نے بطور جرنیل افغانستان اور ہندوستان پر قبضہ کیا اور دریائے سندھ تک کا علاقہ ایران میں شامل کر دیا۔ اس دوران ایران و افغانستان کی لڑائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے روس نے داغستان، باکو اور گیلان کے علاقوں پر قبضہ جما لیا اور ترکی نے گرجستان، تبریز اور ہمدان پر قبضہ کر لیا تھا لیکن نادر شاہ نے یہ

سارے علاقے واپس حاصل کر لیے (43)۔

نادر شاہ کے بعد ایران انتشار اور طوائف الملوکی کا شکار ہو گیا۔ خاندان زند نے ۱۷۵۰ء/۱۱۶۴ھ سے ۱۷۹۴ء/۱۲۰۹ھ تک حکومت کی اور آخر کار ایران پر شاہان قاچار نے قبضہ کیا جن کی حکومت کا دورانیہ ۱۷۷۹ء سے ۱۹۲۵ء/۱۳۴۴ھ تک ہے۔ قاچار خاندان کا بانی ایک خواجہ سرا آغا محمد قاچار تھا جس نے زند حکمرانوں کے ساتھ دس بارہ سال جنگ کی اور آخر کار ۱۷۹۶ء/۱۲۱۱ھ میں ایران کا حکمران بنا اور اسی نے تہران کو دارالحکومت بنایا۔ اس سے پہلے شیراز یا اصفہان دارالحکومت کے طور پر استعمال ہوتے تھے (44)۔

فتح علی شاہ (۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ تا ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ) کے دور میں ایران کی عظمت ختم ہو گئی اور روسیوں نے ۱۷۹۷ء/۱۲۱۲ھ میں داغستان پر اور ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ میں گرجستان پر قبضہ کر لیا۔ فتح علی شاہ نے ۱۸۱۱ء/۱۲۲۷ھ اور ۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ میں روس سے جنگیں کیں۔ ان جنگوں نے ایران کی حالت کافی خستہ کر دی۔ ۱۸۱۳ء/۱۲۲۸ھ میں معاہدہ گلستان کے تحت ایران گرجستان، داغستان اور شمالی آذربائیجان سے دستبردار ہوا اور ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں معاہدہ ترکمانچی کے تحت آرمینیہ سے بھی ایران کو دستبردار ہونا پڑا (45)۔

ناصر الدین شاہ قاچار (۱۸۴۸ء/۱۲۶۵ھ تا ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ) نے ایک لمبا عرصہ ایران پر حکومت کی۔ ناصر الدین کے دور میں ایران میں پہلی مرتبہ جدید افکار داخل ہوئے، اصلاحات جاری کی گئیں اور ناصر الدین نے ۱۸۷۳ء/۱۲۹۰ھ سے ۱۸۷۸ء/۱۲۹۵ھ اور ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ میں یورپ کا تین مرتبہ سفر کیا۔ ان فضول خرچیوں اور تجارتی و صنعتی کاموں میں غیر ملکی مداخلت اور مراعات کے باعث ایران قرضوں تلے دب گیا اور ایران کی مالی حالت خراب ہو گئی۔ اس مالی بدحالی اور بادشاہی استبداد کے نتیجے میں دانشور طبقے میں حکمران مخالف جذبات پیدا ہوئے جنہیں جمال الدین افغانی نے پروان چڑھایا اور بالآخر ناصر الدین شاہ قاچار ایک قوم پرست نوجوان کی گولی کا نشانہ بن گیا (46)۔

ناصر الدین شاہ کے بیٹے اور جانشین مظفر الدین شاہ (۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ تا ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ) نے یورپ کے سفر کر کے اور روس سے بڑے بڑے قرضے لے کر ملک کو دیوالیہ کر دیا (47)۔ ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں قاعدہ آئینی تحریک شروع ہوئی اور نا اہل وزیر کو جس کو افغانی نے ایران کی بدحالی کا ذمہ دار قرار دیا تھا برطرف کرنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ بالآخر مظفر الدین نے مظاہرین کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اکتوبر ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ میں دستور منظور کر لیا گیا (48)۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں افغانستان کا ملک تین حصوں میں تقسیم تھا۔ مشرقی حصہ جس میں کابل شامل تھا۔ دہلی کی تیموری سلطنت کا حصہ تھا۔ مغربی اور جنوبی حصہ میں قندھار اور ہرات شامل ہیں۔ یہ زیادہ تر ایران کے قبضے میں رہتے تھے اور شمالی حصہ جو بدخشاں اور بلخ پر مشتمل ہے یہ ازبکوں کے پاس تھا جو کبھی کبھی ہرات پر بھی قابض ہو جاتے تھے۔ نادر شاہ نے جب قندھار وغیرہ پر قبضہ کیا تو ہرات کے ابدالی قبیلہ کے لوگوں کو اپنی فوج میں شامل کیا جن کا سربراہ احمد خان تھا۔ احمد خان نے نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان کی جنگ میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے اور اس کا شمار نادر شاہ کے وفادار ساتھیوں میں ہونے لگا

تھا۔ جب نادر شاہ کو ایران میں شیعہ سرداروں نے قتل کیا تو احمد خان قندھار بھاگ گیا اور اپنے ساتھ کچھ خزانہ بھی جس میں دہلی کے خزانے کا کافی حصہ اور خصوصاً کوہِ نور ہیرا شامل تھا اپنے ساتھ قندھار لے آیا اور ۱۷۴۷ء میں یہاں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور اپنا لقب دُرِ دوران اختیار کیا جس کی وجہ سے یہ احمد شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی مشہور ہوا(49)۔

احمد شاہ نے اپنے دور میں پنجاب، ملتان، سرحد، کشمیر، بلوچستان اور دوسری طرف ہرات، مشہد اور نیشاپور کے علاقے فتح کر لیے تھے۔ احمد شاہ کے بعد تیمور شاہ (۱۷۷۳ء/ ۱۱۸۷ھ تا ۱۷۹۳ء/ ۱۲۰۸ھ) تخت نشین ہوا۔ اس کے دور میں سندھ اور بلوچستان آزاد ہو گئے۔ مشہد اور نیشاپور بھی ہاتھ سے نکل گئے لیکن موجودہ افغانستان کے علاقوں پر اس نے اپنا قبضہ برقرار رکھا اور اسی نے کابل کو دارالخلافہ بنایا(50)۔

تیمور شاہ کے بعد زمان شاہ (۱۷۹۳ء/ ۱۲۰۸ھ تا ۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۶ھ) تخت نشین ہوا۔ سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور ۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۶ھ میں زمان شاہ کو اس کے بھائی محمود شاہ نے اندھا کر کے قید کر دیا۔ اب افغانستان پوری طرح خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ محمود شاہ نے ۱۸۰۳ء/ ۱۲۱۸ھ میں انگریزوں سے دوستی بڑھائی تو اس کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ لیکن ۱۸۱۰ء/ ۱۲۲۵ھ میں محمود شاہ دوبارہ تخت پر قابض ہو گیا۔ اس دوران محمود شاہ نے بارک زئی قبیلے کو اپنے غلط طرزِ عمل سے مخالف بنا لیا اور ایک بارک زئی سردار دوست محمد خان نے ۱۸۲۶ء/ ۱۲۴۲ھ میں کابل پر قبضہ کر کے دُرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا(51)۔

دوست محمد خان نے پہلی مرتبہ ۱۸۲۶ء/ ۱۲۴۲ھ سے ۱۸۳۹ء/ ۱۲۵۵ھ تک افغانستان پر حکومت کی۔ اس دوران انگریزوں اور پنجاب کے سکھ راجا رنجیت سنگھ نے افغانستان پر چڑھائی کی اور کابل پر قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا اور دوست محمد خان بخارا چلا گیا۔ ۱۸۴۲ء/ ۱۲۵۸ھ میں شاہ شجاع کے خلاف بغاوت ہو گئی اور انگریزی دستے کے تقریباً پانچ ہزار سپاہیوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس بغاوت میں شاہ شجاع ہلاک ہو گیا اور انگریزوں نے کابل کو جلا کر برباد کر دیا۔ انگریزوں کی واپسی کے بعد جنوری ۱۸۴۲ء/ ۱۲۵۸ھ میں دوست محمد خان پھر افغانستان پر قابض ہو گیا(52)۔

دوست محمد خان کے بعد اس کا لڑکا شیر علی (۱۸۶۳ء/ ۱۲۸۰ھ تا ۱۸۷۹ء/ ۱۲۹۶ھ) تخت نشین ہوا۔ انگریزوں نے اپنا اثر بڑھانے کی کوشش کی کیونکہ اس زمانے میں روس کی ترکستان کے راستے سرحدیں افغانستان سے مل گئی تھیں۔ جس سے انگریزوں کا ہندوستان میں اقتدار شدید خطرے میں تھا۔ شیر علی نے انگریزوں کے برخلاف روس سے تعلقات بڑھانے چاہے تو انگریزوں نے ۱۸۷۸ء/ ۱۲۹۵ھ میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ امیر شیر علی بھاگ کر ترکستان چلا گیا اور انگریزوں نے شیر علی کے بیٹے امیر یعقوب سے معاہدہ کر لیا جس کے تحت وہ انگریزوں کے علاوہ کسی سے تعلقات نہ رکھ سکتا تھا۔ اسی دوران حریت پسندوں نے بغاوت کر دی اور ایک بار پھر ۱۸۸۰ء/ ۱۲۹۸ھ میں انگریزوں نے کابل پر قبضہ کر کے امیر دوست محمد خان کے پوتے اور اپنے من پسند شخص عبدالرحمٰن خان کو حکومت سونپ دی جس نے ۱۸۸۰ء/ ۱۲۹۸ھ سے ۱۹۰۱ء/ ۱۳۱۹ھ تک حکومت کی۔ موجودہ افغانستان کی سرحدیں اسی دور میں قائم کی گئیں۔ شمال میں ترکستان، مشرق میں ایران، مغرب اور جنوب میں ہندوستان کے ساتھ سرحدیں مقرر کی گئیں(53)۔

فصل دوم:

انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی کی معاشرتی صورتِ حال کا جائزہ

یہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ تہذیبیں وجود میں آتی ہیں، بڑھتی ہیں اور مٹ جاتی ہیں۔ عروج پر پہنچتی ہیں اور زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ مسلم تہذیب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ برصغیر میں ساتویں صدی عیسوی میں مسلم تہذیب نے جنم لیا۔ سولھویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے یہ تہذیب رو بہ زوال ہوگئی اور علم کی مشعل مغرب میں رہنے والے عیسائیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ مسلمانوں نے علم اور سائنس کو اس کی منزل تک پہنچا دیا تھا۔ جہاں ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی تھی۔ اس لیے یورپ میں صنعتی انقلاب جلد وجود میں آ گیا۔ ورنہ اسے کئی صدیاں لگ سکتی تھیں۔ صنعتی انقلاب نے کمیونیکیشن (ذرائع ابلاغ) کے طریقوں اور اس کی رفتار میں غیر معمولی ترقی کی خصوصا پریس (صنعتی انقلاب کا ایک بڑا کارنامہ پریس کی ایجاد ہے) انسانی تاریخ میں یہ بہت بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کی ایجاد سے مسلمانوں کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ عیسائیوں کو اسلام دشمنی کا ایک بڑا ہتھیار مل گیا۔ اس سے پہلے اسلام کے خلاف جو کچھ کہا یا لکھا جاتا تھا۔ وہ کچھ ہی لوگوں تک محدود رہتا تھا۔ لیکن صنعتی انقلاب نے یہ ممکن کر دیا کہ ایک شخص جو کچھ اسلام کے خلاف لکھے اسے کتابی صورت میں شائع کر کے چند ہی دنوں میں دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے کروڑوں لوگوں تک پہنچا دے (54)۔

عالم اسلام کی دوسری سب سے بڑی سلطنت (اس دور میں سلطنت عثمانیہ کے بعد اپنے رقبہ، فوجی طاقت اور وسائل و ذخائر کے لحاظ سے ہندوستان عالم اسلام کے نقشہ پر سب سے بڑی مسلم سلطنت تھی جس کی حدود شرقی بنگال سے افغانستان کی مغربی حدود تک وسیع تھیں) اور اس میں بسنے والے وسیع مسلم معاشرہ کا رُخ چند ذاتی رجحانات، شخصی اغراض، خارجی اثرات اور موہوم سیاسی مصالح کی بنیاد پر دین محمدی سے وابستگی، نبوت محمدی کی پیروی اور اسلامی تہذیب کی نمائندگی سے بدل کر ہندی فلسفہ، ہندی تہذیب اور وحدت ادیان کی طرف موڑا جا رہا تھا اور کوشش و سازش میں اس عہد کے بعض ذہین ترین اور لائق ترین افراد شامل تھے اور ببانگ دہل نیا دور، نئی امت کا نعرہ بلند کیا جا رہا تھا۔

خود مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا پیدا ہونا تھا۔ جن لوگوں کی نظروں سے عیسائی مصنفوں اور مشنریوں یا آزاد خیال مغربی مفکرین کی کتابیں گزریں۔ وہ اسلام کے بعض مسائل کو جو عام علماء بیان کرتے تھے۔ خلاف عقل سمجھنے لگے اور یہ ڈر تھا کہ اگرچہ وہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کریں گے۔ لیکن مذہب سے ضرور بیگانہ ہو جائیں گے۔ سرسید نے اس کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''اگرچہ خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت پر متوجہ ہوتا تو یقیناً مذہب چھوڑ دیتا''(55)۔

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برصغیر کے مسلمان بیسویں صدی عیسوی میں کن حالات سے دوچار تھے۔ یہ

حالات کیونکر پیدا ہوئے۔اوران کے پیچھے کون کون سے عوامل کارفرما تھے۔یہ حالات سال دو سال میں پیدا نہیں ہوئے۔بلکہ ان پر صدیوں کے اثرات ہیں۔

مسلم و ہندو ثقافت کا اختلاط:

برصغیر پاک و ہند میں باقاعدہ مسلم ثقافت کا آغاز محمد بن قاسم کی آمد کے بعد ہوا۔جب بہت سے مسلمان فوجی یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ان نو آبادیوں کے علاوہ کثیر تعداد میں عرب سپاہیوں نے سندھ میں مستقل قیام کیا۔چچ نامہ مصنف کے بقول محمد بن قاسم نے صرف ملتان ہی میں فوج کے پچاس ہزار سواروں کے رہنے کا بندوبست کیا۔ملتان کے بعد منصورہ اورالور میں بھی فوجی چھاؤنیاں قائم ہوئیں۔جہاں عربوں کی مستقل فوج رکھی گئی(56)۔

جب ہندوستان کا پہلا شخص مسلمان ہوا تو پہلی قوم (ہندو) کا فرد نہ رہا۔ایک جداگانہ قوم کا فرد ہوگیا۔اور ہندوستان میں ایک نئی قوم ہندو مسلم قومیت کی بجائی تھی۔اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہندواور مسلمانوں کے ہزاروں سالا ملاپ نے ایک دوسرے کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ان کے فکر ونظر،علم وعمل،رہن سہن،اخلاق واطوار،سماجی رسوم آداب کا ایک دوسرے پر اثر پڑا۔اوران کی زندگی کا وہ اسلوب قائم نہ رہ سکا جو دونوں قوموں کے ملاپ سے تھا۔اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے۔ سرکاری دفتروں،کاروباری اداروں،نجی محفلوں،بازاروں،تقریبوں،علمی وادبی مجلسوں اور تصوف و درویشی کے حلقوں میں ایک دوسرے سے ملتے گھومتے پھرتے۔خاطر مدارات کرتے اور غم وخوشی میں شریک ہوتے۔لیکن شادی بیاد اور کھانا پینا ممکن نہ ہوا۔ دونوں کے طور طریقے،دینی عقائد،علمی نظریات اور عبادات وریاضت کے آداب ایک دوسرے سے مختلف رہے۔بقول جمیل الدین احمد ”ہندو مسلم معاشرے مثل دو دھاروں کے رہے۔بعض اوقات ایک دوسرے سے ملے بھی مگر ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوئے۔ہر دھارا اپنی راہ پر چلتا رہا“(57)۔

اسلام کی ہمہ گیراور عمومی دعوت کے تحت مختلف استعداد اور اغراض و مقاصد کے لوگوں کا جمع ہونا ناگزیر تھا۔اس لیے ضروری تھا کہ اس دین کامل کو ہر قسم کی تحریفات اور تبدیلی سے محفوظ رہنے کا انتظام کیا جاتا۔چنانچہ رسول اللہﷺ نے دین میں اضافے یا کمی کے اسباب سے نہ صرف متنبہ کیا بلکہ وہ تمام راستے بھی بند کردیئے۔شاہ ولی اللہ نے اسباب تحریف میں جن سات چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ان میں ایک خلط مذاہب بھی ہے۔جس سے مراد یہ ہے کہ بعض لوگ کسی اور مذہب پر ہوتے ہیں۔پھر اسلام سے متاثر ہوکر اسے قبول کر لیتے ہیں۔مگر سابقہ نقوش کا اثر ان پر باقی رہتا ہے۔اس طرح موروثی مسلمانوں پر بھی کفر کی تعلیم،تہذیب وثقافت کے اثرات پڑتے رہتے ہیں اور بعض نافہم لوگ کفریہ امور کو اسلام سے جوڑنے کی سعی لاحاصل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جیسے اسرائیلی علوم و روایات، جاہلیت کے اقوال، فلسفہ یونان، تاریخ ایران، علم نجوم اور علم الکلام وغیرہ(58)۔

میرے خیال میں اسلام میں نئی رسوم ورواج کے عمل دخل کی ایک بڑی وجہ ہی خلط مذاہب ہیں اور خصوصاً ہندوستانی معاشرت کے جو اثرات ہندی اسلامی تہذیب پر نظر آتے ہیں۔اسی وجہ سے عرصہ دراز سے ساتھ ساتھ رہنے کا اثر یہ ہوا کہ ہندو

اور مسلمان ایک دوسرے کی سماجی زندگی میں برابر کے شریک ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کے تہواروں اور شادی بیاہ کی تقریبات میں بڑی گرمجوشی اور خوش دلی سے شریک ہوتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے راجپوت گھرانوں میں شادیاں کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں رشتہ ازدواج کی رسم ڈالی۔ مغل شہزادوں کی شادیاں ہندو گھرانوں میں ہوتی رہیں۔

اگر چہ مذہب ادب کا ایک بڑا حصہ عربی اور فارسی زبانوں میں لکھا گیا یہ دونوں زبانیں ہندوستان کے لیے اجنبی تھیں۔ مگر ان زبانوں کے مطالعہ نے یہاں کے علماء اور فضلاء کو ہندوستان کے باہر کی تصانیف سے باخبر رکھا۔ جس کی وجہ سے اسلام کو ہندوستان میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ لیکن عام مسلمانوں اور جاہل نومسلموں اور ان کی اولادوں اور خاص طور پر ان علاقوں میں جو مسلم تہذیب کے گہواروں اور مرکزوں سے بہت دور تھے اور ان اندرونی علاقوں میں رہتے تھے جہاں قدیم رسم و رواج اور عادات و اطوار کے اثرات باقی تھے۔ ان علاقوں میں ایک مسلمان اور ایک ہندو ہمسایہ میں صرف اتنا فرق پایا جاتا تھا کہ ایک کا نام ہندوانہ تھا اور دوسرے کا اسلامی۔ نومسلم اپنے آباؤ اجداد کے خداؤں کی پرستش کرتے رہے۔ اسی طرح شادی بیاہ اور تہواروں کی دوسری رسموں کو بھی ادا کرتے رہے۔ جنہیں وہ مسلمان ہونے سے پہلے کیا کرتے تھے(59)۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو رسم و رواج، عادات و اطوار، طرزِ معاشرت اور توہمات نے بہت جلد اسلامی رسم و رواج کو پس پشت ڈال دیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج اور سماجی و معاشرتی زندگی میں صرف نام کا ہی فرق باقی رہ گیا(60)۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں سیاسی اقتدار کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور وہ حکومت کے اہم عہدوں پر فائز تھے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ مسلمانوں نے ان کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل کرنے کے لیے ان کے عقائد اور رسم و رواج کو اپنا لیا اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ان کی تقلید کے لیے آمادہ کیا۔ اس زمانے میں ہندوؤں کو ہر قسم کی مراعات دی جاتی تھیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک عہدیدار تھا۔ کچھ مسلمان ان کے اثر کی وجہ سے ان کی تقلید کرتے تھے اور ان کے رسم و رواج کی بادشاہ کو بھی ترغیب دیتے تھے(61)۔

صوفیائے کرام بلا کسی مذہبی تعصب اور تفریق کے ہندوؤں کی روحانی اصلاح اور تربیت کرتے تھے اور انہیں خرید بھی کر لیا کرتے تھے۔ اگر چہ صوفیاء کے اوصاف حمیدہ سے متاثر ہو کر بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ صوفیائے کرام کے مزاروں پر ہندو بھی بڑی عقیدت سے حاضری دیتے اور یہ دستور ابھی بھی باقی ہے۔ خافی خاں کا بیان ہے کہ مسلمان اور ہندو دونوں رسوم ادا کرنے میں یکساں ہیں(62)۔

اس طرح مسلمان اور ہندو مل جل کر رہتے ان کے تمام رسوم میں بہت کم فرق تھا۔ ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے اور صوفیائے کرام زیادہ تر تصوف میں رہنے لگے(63)۔

ذات پات کے نظام کا ارتقاء، ولادت سے وفات تک کی رسمیں جشن اور تہوار، نکاح بیوگان کو معیوب سمجھنا یہ سب ہندی معاشرت کے اثرات ہیں۔ دربار مغلیہ میں ہولی کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔

احمد شاہ بن محمد شاہ (۴۸ ۱۷ء تا ۱۷۵۴ء بمطابق ۱۱۶۲ھ تا ۱۱۶۸ھ) اپنے دربار میں ہولی کا جشن منعقد کیا کرتا تھا۔ آتش چراغ، جھروکہ درشن اور جسم تلاداں (ہندوؤں کی تقلید میں شاہان مغلیہ نے جھروکہ درشن اور جسم تلاداں کی رسموں کو اپنا لیا تھا)۔قبلہ عالم پردے سے باہر نکل کر ہر خاص و عام کو شرف دیدار بخشتے ۔ جہاں پناہ کو تولنے کی رسم جو سال میں دو مرتبہ ادا کی جاتی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ہندو تہذیب، مذہب، تصوف اور اسلامی عقائد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی چونکہ ان میں سے بیشتر ہندو مذہب ترک کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ان کے لیے اسلام کے نازک مسائل سمجھنا بڑا مشکل تھا۔ مزید برآں اس کے برعکس وہ لوگ اپنے قدیمی، وراثتی اور مذہبی عقائد سے اس قدر وابستہ تھے کہ ان کو یکدم ترک کرنا پسند نہ کرتے ہوں گے۔اس لیے انہوں نے دونوں مذاہب کے بعض ظاہری اصولوں کو اپنا لیا اور کچھ کو ترک کر دیا۔اس طرح انہوں نے ایک تیسرا راستہ اختیار کیا جو نہ تو خالصا اسلامی تھا اور نہ خالصتا ہندی بلکہ ہندوستانی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام میں ہندوستان کے مسلمان، ہندوستانی مسلمان کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں اور ان کے عقائد واعمال دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے کچھ مختلف ہیں۔ اسلامی تصوف ہو یا ہندوستانی تصوف، تصوف نے مجموعی طور پر ہندوستانی اشغال، اوضاع و اطوار میں بڑی حد تک ہندوستانی تہذیب اور ہندی تصوف کے عناصر کارفرما تھے (64)۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں ہندوستانی ماحول اور رسم ورواج کے اثرات (بچے کی ولادت، شادی بیاہ اور موت سے متعلق رواج ہیں) بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ بچے کی ولادت سے لے کر موت تک جتنی بھی رسوم ہندوستانی مسلمانوں میں رائج ہیں وہ سب کی سب ہندوستانی رسمیں ہیں۔جن میں سے بہت سی رسمیں تو جوں کی توں اپنائی گئی ہیں اور بعض کے نام بھی وہی ہیں۔ مگر طریقے بدل گئے ہیں اور بعض بہ تغیر نام۔مذہبی امور میں شامل کر لیا گیا ہے (65)۔

ہندی نژاد اور ہندی الاصل مسلمان اور ان کی عورتیں نہ صرف اس ملک کی رسموں کی گرویدہ تھیں بلکہ ان رسموں میں اضافہ کرنے کا ارادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اس وجہ سے مسلمان ہونے کے بعد بھی وہ ہندوستانی رسم ورواج، عادات واطوار کو اس انداز میں اپنائے رہے کہ انہیں اس بات کا احساس تک نہ رہا کہ اسلام اور اسلامی طرز معاشرت سے ان رسوم کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ مختصراً چند رسموں کے علاوہ ہندو اور مسلمانوں کی رسوم وروایات بڑی حد تک ایک جیسی ہیں (لڑکی اور لڑکے کو زرد کپڑے پہنانا، کلائی میں ریشمی کلاوہ باندھنا) ہندی نژاد جو بعد میں مسلمان ہوئے وہ ذات پات کے سماج سے نکل کر مسلمان ہوئے تھے۔مگر مسلمان ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اپنے ہندو سماجی ڈھانچے کے اصولوں اور نظریوں کو برتر رکھا۔اور رفتہ رفتہ ہندوستانی مسلمانوں میں ذات پات پرمبنی ایک سماج کی تشکیل عمل میں آئی جو ہندوستان ہی کے لیے مخصوص ہے (66)۔

سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تفہیمات اور وصیت نامہ (کتب فارسی) کی عبارتوں سے برصغیر کی معاشرت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ہندوؤں کی عادت شنیعہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کسی عورت کا شوہر مر جاتا ہے تو وہ اسے دوسری شادی نہیں کرنے دیتے ۔ دوسری عادت یہ ہے کہ بہت لمبا مہر باندھتے ہیں۔غم کے موقع پر سوئم، چہلم، ششماہی اور سالانہ کے نام بھی

اسراف ہے۔حالانکہ ان میں سے کسی ایک کا بھی عرب اوّلین میں رواج نہ تھا(67)۔

ہندوستان میں ایسی مذہبی تحریکیں اٹھتی رہیں جو ہندوؤں سے ہر قسم کے ملاپ اور اشتراک کے خلاف تھیں کیونکہ ڈر تھا کہ کہیں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے میں ضم نہ ہوجائیں اس لیے مذہب کو خالص روایات اور اقدار کی روشنی میں زندہ کرنے کی کوششیں ہوتیں۔

ہندو ثقافت کے اثرات:

انسانی زندگی قبول وعطا کے شریفانہ اصول کی قائل ہے۔ اور اس میں اس کی وسعت اور رنگارنگی کا راز پنہاں ہے۔ کسی تہذیب کا دوسری تہذیب پر صرف اثر انداز ہونا اور اثر پذیر نہ ہونا نہ انسانی فطرت کے مطابق ہے نہ مصلحت کے۔

اگرچہ ہندوستان کے تمدنی اور تہذیبی ورثہ نے ہندوستانی مسلمانوں کو بہت سی اقدار سے روشناس کرایا۔ جو ان کی ہندوستانی، اسلامی تہذیب کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا مغربی تہذیب کے اثرات اور جارحانہ حملوں کا ایسی حکمت عملی کے ساتھ مقابلہ کرنا۔ جس میں اپنی انفرادیت وتشخص کو امتیاز کے ساتھ قائم رکھنا اس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔ انکا فکر عمیق، فلسفہ تصوف یہ سب ہندوستان کے ان تہذیبی، فکری اور اجتماعی عوامل کا نتیجہ ہے جو اس ملک میں پچھلی صدیوں سے کام کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک نئی اسلامی ہندی ثقافت اور تہذیب کی بنیاد ڈالی ہے۔ جس میں اسلام کی بین الاقوامی اور ہندوستان کی مقامی تہذیب اور فلسفہ کی بیک وقت نمود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تصورات اور اخلاقیات نے وہ تغیر بھی قبول کیا ہے۔ جو اگرچہ دوسری بے جان تہذیبوں اور فاتح اقوام کے مقابلہ میں (جن کا ہندوستانی تہذیب سے واسطہ پڑا) بہت کم ہے۔ تاہم ہندوستان کی قدامت، تصور وطنیت اور یہاں کی تہذیب و معاشرت اور مختلف قوموں سے اختلاط کے جو نقوش ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی اور تہذیب میں نمایاں ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ترقی یافتہ وشائستہ مشترک (اردو) زبان ہے۔ جس میں عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کی بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ زبان اپنی نازک خیالی، شیرینی اور بانکپن میں دوسری زبانوں سے ممتاز ہے(68)۔

۲۔ دوسرے شرفاء اور اہل شہر کا وہ لباس ہے جو ہندوستان کی پیداوار ہے۔ اگرچہ خوش ذوقی وخوش اسلوبی کا اچھا نمونہ ہے۔ مسلمان بھی ہندوؤں کا سا لباس پہننے لگے تھے۔

۳۔ وہ تہذیب ومعاشرت جو دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد اور مرکزی شہروں سے مغلوں کے آخری دور میں پیدا ہوئی۔ جس میں ذہانت، نفاست، لطافت اور شائستگی پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے (والدین کا حد سے بڑھا ہوا احترام، ان کے سامنے حیا اور عورتوں کا حد سے بڑھا ہوا پردہ اور ظاہری رکھ رکھاؤ۔ یہ سب وہ خصوصیات ہیں جن سے دوسرے ممالک کے مسلمان زیادہ واقف نہیں)۔ ان میں ہندوستان کے مخصوص حالات، حاکم طبقہ کی مصالح اور قدیم اثرات مجموعی طور پر دخیل ہیں۔

۴۔ بیرونِ ہند کے مسلمان ازدواجی تعلقات میں صرف شرافت اور معاشرتی حیثیت کا خیال رکھتے ہیں اور ایک ہی قوم اور

خاندان میں شادی کے پابند نہیں۔ جبکہ اپنے ہم جدی، ہم نسل وہم سطح خاندانوں سے رشتے کرنا اور اپنے مخصوص دائرہ اور معیار سے باہر نہ جانا ہندوستانی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ جس میں ہندوستان کی نسبی روایات، خاندانوں اور برادری کی دائمی اور اٹل تقسیم کو بہت دخل ہے(69)۔

۵۔ شادی بیاہ اور غمی کی تقریبات میں پُرتکلف اہتمام۔ اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا۔ ہندوستانی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ جس میں مسلمان اس سے متاثر ہوئے۔ ورنہ اسلامی معاشرت میں یہ امور نہایت سادگی سے انجام دیے جاتے ہیں(70)۔

۶۔ آقا اور خادم کا ایسا امتیاز جیسا کہ وہ دو قوموں کے افراد ہوں بلکہ بعض اوقات اچھوتوں جیسا سلوک، ہند کے ذات پات کے متعصبانہ نظام کا آئینہ دار ہے۔

۷۔ پیشوں کی بنیاد پر برادریوں اور رہائش کی مستقل تقسیم ہندوستانی معاشرت کی خصوصیت ہے۔

۸۔ ہندوستان میں مسلمان عہد حکومت (عہد انحطاط) کا نظام جاگیرداری اور حاکمانہ تصورات بھی ہندی تہذیب کے اثرات کی پیداوار ہیں(71)۔

۹۔ ہندوؤں کے زیر اثر رہنے والے مسلمانوں میں چھوٹا بڑے کو السلام علیکم نہیں کہتا تھا بلکہ آداب عرض کہتا تھا۔ بڑے بھی ہندوؤں کی طرح سلام کرتے اور اس کا جواب دیتے۔

۱۰۔ نکاح بیوگان ہندومت کے زیر اثر معیوب سمجھا جاتا تھا(72)۔

کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار ڈاکٹر شیخ محمد اکرام موج کوثر میں کرتے ہیں کہ معاشرتی رسموں کے اعتبار سے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ بھوت پریت کے ڈر اور دوسرے وہموں سے زندگی کا سکون تلف ہو رہا تھا۔ ہندوؤں میں نکاح بیوگان پاپ سمجھا جاتا تھا۔ شادی بیاہ، تجہیز و تکفین کے متعلق اسلامی احکامات کی بجائے (مقامی اثرات کی وجہ سے) خلاف شرع رسموں نے لے لی(73)۔

اگرچہ بہت سی قوموں نے اپنے آبائی مذاہب چھوڑ کر اسلام کو قبول کر لیا تھا۔ مگر اس سے ان کی روحانی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اگر وہ پہلے مورتیوں کے سامنے ماتھا ٹیکتے تھے تو اب قبروں کے سامنے سجدہ کرتے تھے(74)۔

بعض برے اثرات کو دور کرنے کے لیے اصلاحی اور تجدیدی کوششیں بھی جاری رہیں لیکن ان کوششوں کے باوجود مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی زندگی صحیح معنوں میں اسلامی نہ بن سکی اور وہ اپنی اسی ہندوستانی تہذیب و تمدن کو اسلامی کہنے لگے۔ جس میں اسلامی رنگ کے ساتھ ساتھ مقامی اثرات بھی تھے(75)۔

عیسائی فرنگیوں کی ہند میں آمد:

مسیحیت ہندوستان میں سب سے پہلے اسکندریہ سے آئی۔ اسکندریہ دنیا میں سب سے بڑا تجارتی شہر تھا۔ یہاں پر ایک مذہبی مدرسہ قائم کیا تھا جو کئی سال تک جاری رہا(76)۔

ہندوستانی سوداگر جو ریشم اور موتی کی تجارت کرنے کے لیے اسکندریہ گئے تھے۔ وہ مسیحیت کا ذخیرہ ساتھ لائے۔ دوسری صدی کی ابتداء میں کچھ ہندوستانی سوداگروں نے اسکندریہ کے بشپ دیمتر یوس کو خط لکھا کہ ہندوستان میں تبلیغ مسیحیت کے لیے کوئی قابل آدمی بھیجا جائے۔

چنانچہ اس نے پانٹے نیوس پادری کو ہندوستان بھیجا جو اپنے عہد کے قابل ترین لوگوں میں سے تھا اور ہندوستان میں پہلا مشنری تھا۔ جو تبلیغ عیسائیت کے لیے آیا۔ چوتھی صدی میں کچھ شاہی عیسائی ہندوستان کے ساحل مالا بار پر آباد ہوئے۔ جب پرتگالی عیسائی ۱۵۰۰ء میں ہندوستان آئے تو مالا بار کے عیسائیوں نے ان کا پر جوش خیر مقدم کیا(77)۔

اکبر کے زمانے میں پادریوں کی دربار میں رسائی تھی اور شہزادہ مراد کو انجیل پڑھانے کے لیے شیخ ابو الفضل کا بطور مترجم تقرر ہوا۔ اکبر کے زمانے میں گرجے بنانے کی بھی اجازت دی گئی۔

ابو الفضل لکھتا ہے کہ دربار کی طرف سے تورات اور انجیل کے ترجمے اور ان کے مطالب کو بادشاہ تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا اور اس کے لیے ایک درباری فاضل سید مظفر کا تعین کیا گیا۔ اور بعض عیسائی اہل سلطنت کو لکھا گیا کہ ہم فارغ اوقات میں تمام مذاہب کے دانشوروں سے ملتے ہیں۔ اور ان سے ان کے پاکیزہ کلمات اور بلند خیالات سے مستفید ہوتے ہیں۔ زبانوں کی اجنبیت حائل ہے کسی ایسے شخص کو بھیج کر معلوم کریں جو ان مطالب عالیہ کو اچھی عبارت کے ذریعے دل نشین کرائے۔ سمع ہمایوں تک یہ بات پہنچی کہ کتب سماوی (تورات، انجیل و زبور) کے ترجمے فارسی میں ہوئے ہیں۔ اگر وہ مترجم کتابیں اس ملک میں ہوں تو افادہ عام کے لیئے بھیج دیں۔ رسم محبت کی تجدید اور بنیاد اتحاد کی پختگی کے خیال سے ہم نے سیادت مآب سید مظفر کو (جو ہماری عنایات سے سرفراز ہیں) ان تراجم کے چند نسخوں کے لیے بھیجا ہے۔ ان پر اعتماد کریں اور برابر خط و کتابت کرتے رہیں(78)۔

ترجمے کے علاوہ خود عیسائی پادری دربار میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنے مذہب کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور عقیدہ تثلیث و عیسائیت کو دلائل سے ثابت کیا۔ دربار میں ملک فرنگ کے مرتاض دانشمندوں کا بھی ایک گروہ تھا۔ ان لوگوں کو پادری کہتے تھے اور ان کے بڑے مجتہد کا نام پاپا (پوپ) ہے۔ ان لوگوں نے انجیل پیش کی اور نصرانیت کو حق ثابت کیا(79)۔

یورپ کی علمی و فکری یلغار:

دین اسلام کی داخلی توجیہ کی ایک وجہ وقت اور ماحول کے تقاضے ہیں۔ ہر زمانہ اپنے ساتھ فکری اور علمی مسائل لاتا ہے۔ جن کی وجہ دینی تعلیمات اور معاشرہ کے ماحول کے درمیان ایک اجنبیت اور مغائرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس زمانے میں فکری محاذ پر جو چیلنج رونما ہوئے ان میں سے اہم اور سب سے زیادہ خطرناک عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیاں ہیں۔ جن میں

وہ اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے زیر سایہ مشغول رہے۔

دوسرا حملہ ہندو اہل قلم کی یلغار جس میں ایک طرف مسلمانوں کی خون آشامی اور جنگجوئی کا رونا تھا۔ تو دوسری طرف قرآن پاک، سیرت نبوی ﷺ اور اسلامی شعائر پر تنقید۔

تیسرا چیلنج یورپی علوم وفنون کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس کی چکا چوند نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نظریں چندھیا دیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے بقول اسلام کو ہندوؤں کی مذہبی یلغاروں سے کچھ زیادہ خطرہ نہ تھا۔ اسی طرح شاید عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیوں سے عموماً مسلمانوں پر اثر نہ پڑتا۔ مگر اسلام کے خلاف سب سے زیادہ خطرناک وہ آزمائش تھی جو یورپ کے علمی افکار کی صورت میں ہندوستان پر نازل ہوئی۔ یہ علمی افکار وہ تھے جن سے مذہب یورپ میں اس سے قبل نیم جان ہو کر دم توڑ رہا تھا۔ یورپ میں علوم اجتماعی کی ترقی کے ساتھ ساتھ جن کی بنیاد عقل محض کے علاوہ سائنس کے تجربات اور مشاہدات پر رکھی گئی تھی۔ مذہب کی الہامی بنیادوں پر شدید حملے ہوئے اور عیسائیت بلکہ ہر مذہب کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ ہندوستان میں ان مغربی افکار کی اشاعت سے اسلام کو حقیقی خطرات سے دوچار ہونا پڑا" (80)۔

طرز معاشرہ کے علاوہ اہل ہندوستان پر اہل یورپ کے خیالات کا بھی گہرا اثر پڑا۔ مغربی علوم سے آگاہی حاصل ہوئی۔ یورپ کی تصانیف، نئے خیالات، نئے انکشافات اور نئے طرز بیان میں جو دل فریبی ہے۔ اس نے ہندوستان والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ یہ اثرات جس قدر زیادہ پھیلتے گئے۔ لوگوں کے مذہبی عقائد اور اختلافات میں بھی نمایاں تبدیلی واقع ہوتی گئی (81)۔

انگریزوں نے سکول اور یونیورسٹیاں اپنے مفاد کے لیے قائم کیں تاکہ برصغیر کے باشندوں پر ان کی تہذیب کے اثرات مرتب ہو سکیں۔ لارڈ میکالے ☆ کے قول کے مطابق "ہم ان مدرسوں کے طلباء کو عیسائی نہیں بنا سکتے لیکن یہ کیا کم ہے کہ اب وہ مسلمان، ہندو اور سکھ بھی نہ رہ سکے" (82)۔

یورپ کی اندھی تقلید:

یورپ کی مادی ترقی کو دیکھ کر برصغیر کے مسلمانوں نے یہ سوچا کہ شاید ترقی کا دارومدار مغرب کی تقلید میں ہے۔ اس لیے انہیں وہی انداز زندگی اور معاشرت اپنانا شروع کر دیا جو انگریز کا تھا۔

یورپ کی مادی ترقی اور معاشی تنظیم کا مفید اور کارآمد ہونا تو اب کسی دلیل کا محتاج نہیں رہا۔ اس مادی ترقی کی مدد سے افرنگ کا قریہ قریہ فردوس کی مانند بن گیا۔ ان حالات میں مسلمانوں نے بھی یورپ کی اندھی تقلید شروع کر دی (83)۔

☆ لارڈ میکالے ۱۸۰۰ سے ۱۸۵۹ء برطانوی مؤرخ اور ادیب ۱۸۴۰ء میں پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۸۳۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قانونی مشیر کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ ان کی مرضی سے ہندوستانیوں کی تعلیم کا نظام رائج ہوا۔ جس کا مقصد سرکاری دفاتر کے لیے کلرک مہیا کرنا تھا۔ ۱۸۵۶ میں لارڈ کا خطاب دیا گیا (شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا، لاہور، ص ۶۶۷)۔

انگریزی تعلیم سے جو اثرات پھیلے کہ ہر علم وفن میں انگریز کی پیروی کرنے میں فخر محسوس کیا جانے لگا۔ جس سے مذہب، اخلاق اور عقائد میں تغیر پیدا ہوگیا۔

برصغیر میں انگریزی تعلیم کی غرض وغایت انگریز کے ان الفاظ سے واضح ہوتی ہے کہ ہمارا مقصد ہر طور پر ایک ایسا تلبیتی طبقہ پیدا کرنا ہے جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان جس پر ہم حکمران ہیں ترجمان بن جائے۔ ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر اپنے رجحانات وخیالات اور اخلاق وفکر کے لحاظ سے انگریز ہو (84)۔

فصل سوم:

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی تعلیمی صورتحال کا جائزہ

انگریزی نظامِ تعلیم:

ایک نہایت عجیب مضمون جو ہندوستان کا مطالعہ کرنے کیلئے باعث دلچسپی ہے۔ اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ ایسی اعلیٰ تعلیم جو ایک اعلیٰ قوم کی ضرورتوں کے لیے موزوں ہو۔ اسے کتنی رتنا قوم کو دی جائے تو اس کے کیا نتائج ہوں گے۔ یہ چیز ہم ہندوستان میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں اس کی تعلیم کا وسیع پیمانے پر تجربہ کیا گیا جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

انگلستان کے بعض پراٹسٹنٹ پادریوں کی شور پکار اور بعض بہی خواہ انسان اشخاص کے دلائل کی وجہ سے جو انگلستان کی مجلس وزراء میں تھے۔ نیز سب سے زیادہ ہندوستان کے انتظام کے لیے کثیر ماتحسین عمال کی سخت ضرورت کے باعث انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں یورپی طرز کے مدارس کھولے جائیں۔ جن میں دیسیوں کو تعلیم دی جائے۔ ان میں انگریز معلم ہوں اور ان کا نصاب تعلیم یورپی طرز کا ہو" (85)۔

انگریزی تعلیم کے پیالے بڑی حقدار میں دیسیوں کو پلائے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی یافتہ بابو کے لقب سے مشہور ہوا۔ ان کا شمار آج کل ہزاروں میں پہنچ گیا۔ ایسی تعلیم کے بارے میں سرجان اسٹریچی لکھتے ہیں کہ:

یہ بابوں کی جماعت اکثر ناقص تعلیم یافتوں کی ہے جو ہماری زبان سے خوب واقف ہیں۔ اور ہمارے سیاسی ماحول کو انہوں نے خوب الٹ لیا ہے۔ جس پر وہ اپنی فصاحت کی خوب گل فشانی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ گویا وہ برک اور میکالے جیسے عالی دماغ لوگوں کے جذبات کی پیروی کرتے ہیں (86)۔

موسیو جے ہارمنڈ کونسل جنرل جو عرصہ تک کلکتہ میں رہے اس نظامِ تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"اب بہت سے انگریزوں نے اس بات کو خوب سمجھ لیا ہے کہ انہوں نے جو مغربی تعلیم ہندوستانیوں کو دی ہے وہ سراسر ایک غلط راستہ ہے ان میں سے جو نہایت تجربہ کار انگریز ہیں۔ وہ تو اس خطرناک غلطی پر جو مشہور و معروف میکالے کے نام سے عمل میں لائی گئی ہے۔ لعنت بھیجتے ہیں۔ کیونکہ اس تعلیم سے بعض انگریزوں کے دیسیوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہے (87)۔

بہت سے منصف مزاج انگریز ہندوستانیوں کی موافقت بھی کرتے رہے جس کے نتیجے میں ۱۸۳۴ء/۱۲۵۰ھ میں تعلیمی ضروریات انجام دینے اور اس کے پروگرام وغیرہ کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا اجلاس ۷ مارچ ۱۸۳۵ء/۱۲۵۱ھ میں منعقد ہوا اور لارڈ میکالے اس کے صدر بنائے گئے۔ کمیٹی اور اس کے صدر نے ہندوستانیوں کے لئے تعلیم گاہیں بنانے اور تعلیم کی ضرورت کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا۔

چنانچہ لارڈ میکالے اور اس کی کمیٹی اپنے تعلیمی اغراض و مقاصد اور ان کی اسکیم کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل کلمات تحریر کرتی ہے:

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو(88)۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کہتا ہے: ہمارے اینگلو انڈین سکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار نہ کرنا جانتا ہو۔ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس بستہ حقائق کے مقابلے میں آتے ہیں تو سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں(89)۔

انگریز نے تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں میں تفرقہ ڈالنے کی مزموم تحریک چلائی ایسی کتابیں تیار کی گئیں جن میں مسلمان بادشاہوں کے مفروضہ مظالم بیان کر کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے ایسی کتابوں کو کورس میں داخل کیا گیا اور انگریز اس میں کامیاب رہا۔

مسٹر ایڈورڈ ٹامس اپنی کتاب (انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ) میں لکھتا ہے:

’’برٹش سیاست کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تو ہم نے مسٹر گلیڈ اسٹون اور لارڈ سلیسری جیسے مشہور زمانہ مدبّرین کے خیالات کو چھوڑ دیا ہے کیونکہ وقت کی ضرورت ان کے برخلاف حکم دیتی تھی لیکن ہندوستان کے متعلق ہم ابھی تک اسی فرسودہ پالیسی پر عمل کر رہے ہیں یہاں تک ہندوستانیوں میں نا اتفاقی اور باہمی اختلافات کو زندہ رکھنا قدیم سے ہمارے سیاستدانوں کا نہایت مرغوب مشغلہ بنا ہوا ہے(90)

مسٹر چرچل ۲۷ جون سنہ ۱۹۳۲ء/۱۳۵۱ھ کو تقریر کرتے ہیں:

’’وزیر اعظم (مسٹر میکڈانلڈ) نے طے کر لیا ہے کہ وہ فرقہ ورانہ فیصلہ دیں گے۔میرے نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے۔اگر انہوں نے جملہ جماعتوں کو خوش کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو خوش نہ کر سکیں گے۔اہلِ روم کا اصول تھا کہ نفاق ڈال کر حکومت کرو لیکن ہم نے بالاتفاق طے کر لیا ہے کہ یہ اصول نامناسب ہے مگر اسی کے ساتھ اس اصول کو بھی اختیار نہ کرنا چاہیئے جو اس کے برعکس ہو اور وہ یہ ہے کہ رعایا کو متحد کر دیا جائے جس کا نتیجہ سلطنت سے دست کشی ہو گا۔دراصل یہ ایک بڑا خطرہ ہے اور اندیشہ ہے کہ ہم اس بڑے خطرہ میں نہ پڑ جائیں(91)۔

غرضیکہ انگریز نے ہندوستانیوں کے اعلیٰ اخلاق کو تباہ و برباد کر دیا اور اس کے منبع و سرچشمہ دولتِ علم سے ہندوستانیوں کو پہلے پہلے محروم رکھا گیا اور پھر ایسا طریقہ رائج کیا گیا جو ایک طرف تو مذہب سے بیزاری پیدا کر کے ہندوستانی نوجوانوں کو اپنے مذہب سے باغی اور انگریز کا وفادار بنائے اور دوسری طرف باہمی اختلافات وتفرقہ کا ذریعہ بنے تا کہ (اختلاف ڈالو اور حکومت کرو) کے مشہور اصول کے مطابق انگریزی اقتدار دن بدن مضبوط اور مستحکم ہوتا جائے۔یہی وہ اخلاقی مظالم تھے جنہوں نے ہندوستانیوں کو انگریز کے خلاف جہادِ حریت لڑنے پر مجبور کیا۔

تحریک علیگڑھ:

تحریک علیگڑھ مذہبی تحریک تھی اس لیے اس کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔

سرسید احمد خاں (۱۸۹۷ء بمطابق ۱۳۱۵ھ) نے مسلمانانِ ہند کو ہمیشہ اتحاد و استحکام برقرار رکھنے کی تلقین کی اور وہ بار بار مسلمانوں کو یہ باور کراتے رہے کہ وہ جبھی قوم کہلانے کے حق دار ہیں کہ اگر وہ اسلام کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اور جب تک مسلمان اپنے مذہب پر سختی سے کاربند رہیں گے وہ ایک قوم بنے رہیں گے۔

سرسید احمد خاں نے ایک جانب علیگڑھ سے ''تہذیب الاخلاق'' جیسے ایک ماہنامے کا اجراء کر دیا تھا اور دوسرے علیگڑھ کالج (۱۸۷۷ء بمطابق ۱۲۹۴ھ) کے قیام کے بعد تو علیگڑھ سچ مچ ہندوستان بھر کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس وقت اب لوگوں میں سیاسی شعور بھی پیدا ہونے لگا تھا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اور سائنٹفک سوسائٹی کے حوالے سے سرسید احمد خاں نے اپنے رفقاء کی ایک پوری جماعت تیار کر لی تھی۔ اس جماعت میں نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد دہلوی اور دیگر کئی اکابرین شامل تھے۔ یہ سب لوگ علمی، ادبی، دینی، صحافتی، اخلاقی، اصلاحی اور سیاسی محاذوں پر اپنا اپنا بہتر کردار ادا کرنے میں ہمہ وقت مصروف عمل تھے۔ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کے حوالے سے مسلمانوں کو علمی طور پر پُر مایہ کرنے کے جس مشن کا آغاز کیا۔ اس سے آغاز میں مسلمانوں نے کلّی اتفاق نہیں کیا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ لوگ اس تحریک کے مقاصد کو سمجھ کر سرسید کے ہم نوا ہونے لگے تھے (92)۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں سرسید احمد جیسا بہتر دل و دماغ والا عملی راہنما ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔ جب سرسید نے اپنی قومی زندگی کا آغاز کیا اس وقت مسلمان بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جس طرح تالاب میں کھڑا ہوا پانی آئے دن زیادہ بدبودار ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی بگڑتے جاتے تھے۔ سرسید کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ مسلمانوں کی ایک خصوصیت ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی دلنشین لیکن قابل عمل اور ٹھوس مطمع نظر رکھا جاتا ہے۔ تو وہ اس کیلئے بڑے جوش اور مستعدی سے آگے بڑھتے ہیں۔ سرسیّد نے قوم کے سامنے علی گڑھ کالج کا خواب پیش کیا۔ اور قوم نے اس خواب کو پورا کرنے کیلئے سرسید کا ساتھ دیا۔ قوم کے بہترین دماغوں اور قابل ترین فرزندوں حالی، محسن الملک، شبلی، نذیر احمد، ذکاءاللہ سب نے سرسید کی صدا پر لبیک کہا اور قوم کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ مولانا شبلی نے مثنوی صبح امید میں سرسید کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اس نئی زندگی اور عام بیداری کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں سرسید کی تصویر خاص طور پر دلنشین ہے۔

صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پر فروغ صبح گاہی
وہ ریشِ دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں ایک ذرا خم — تو قید کی صورت مجسم
وہ ملک پہ جان دینے والا — وہ قوم کی ناؤ کھینچنے والا

ان کے کارناموں کی نسبت کیا ہے؟

باتوں میں اثر تھا کس بلا کا	اک بار جو رُخ پھرا ہوا کا
امید کی بڑھ گئی تگ وتاز	اونچی ہوئی حوصلوں کی پرواز
خواہش کے بدل گئے ارادے	ہمت نے قدم بڑھائے آگے
وہ دوڑ چلے جو پا بگل تھے	آندھی ہوئے جو فسردہ دل تھے
جو تھا وہ عجیب جوش میں تھا	مخمور بھی اب تو ہوش میں تھا
اب ملک کے ڈھنگ تھے نرالے	اخبار کہیں، کہیں رسالے
تعلیم کے جا بجا وہ جلسے	گھر گھر میں ترقیوں کے چرچے
بیتاب ہر ایک جزو کل تھا	ہر بار ''بڑھے چلو'' کا غل تھا(93)

سرسید نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی تنظیم سر سید کی مرہونِ منت تھی۔ بلاشبہ ایک غیر مسلم ماحول نے مسلمانوں میں ایک قسم کی یکجہتی پیدا کر دی تھی۔ جسے ہندوؤں کی چھوت چھات سے استقامت ملتی تھی۔ اس یکجہتی میں کیڑے رہتے تھے۔ ذاتوں اور قوموں مثلاً افغانوں اور مغلوں کی کشمکش، شیعہ سنی اختلافات، صوبے دارانہ بُعد اور تعصبات غدر میں دہلی کی تباہی سے یہ شیرازہ اور بھی منتشر ہو گیا۔ سر سید نے مسلمانوں کو من حیث القوم اکٹھا کیا۔ اور وہ مثبت مقاصد کیلئے۔

اب ہندوستان میں اسلامی قومیت کا آوازہ پہلی مرتبہ بلند ہوا۔ ایک نیا تعلیمی، ذہنی، ادبی اور سیاسی مرکز قائم ہوا۔ مسلمانوں کو فرقہ ورانہ، صوبجاتی اور ذات پات کے اختلافات کے باوجود باہمی محبت اور قومی جوش و جذبہ کے ساتھ مل کر کام کرنے کا سبق ملا۔ علیگڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ نے قومی اتحاد اور قومی ترقی کا سبق ملک کے گوشے گوشے میں پھیلایا۔ اور علیگڑھ کی طرز پر مختلف مقامات پر کالج اور ادارے قائم ہوئے۔ علیگڑھ کی تحریک نے اردو ادب کو بے حد ترقی دی اور اردو کو مسلمانانِ ہند کی مشترکہ قومی زبان بنایا۔ ان سب باتوں کا قدرتی نتیجہ تھا کہ مسلمان من حیث القوم متحد ہو گئے۔ اور قومی تنظیم کی محکم بنیاد رکھی گئی۔

ڈاکٹر پینکر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''سر سید کی نسبت سچائی سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کے تنزل کو روک لیا بلکہ ایک پشت (Generation) کے اندر انہیں پھر سے ایک جلیل القدر اہمیت اور غیر مشتبہ اثر کا مرتبہ دے دیا(94)۔

سر سید نے جس تحریک کی رہنمائی کی۔ اس کے کئی پہلو تھے۔ تعلیمی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی۔ سر سید علیگڑھ کو مسلمانوں کا سیاسی مرکز بھی بنانا چاہتے تھے اور ۱۹۱۰ء بمطابق ۱۳۲۸ھ کے قریب تک یہ جگہ قوم کا سیاسی مرکز رہی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ جسے تمام فریقوں کی مدد اور گورنمنٹ کی سرپرستی کی ضرورت ہو۔ ہر قسم کی سیاسیات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ قوم کی نئی سیاسیات کی

وجہ سے علی گڑھ کی سیاسی مرکزیت جاتی رہی۔ اور شاید اب پھر اسے نصیب نہ ہو۔

ادبی نقطہ نظر سے علیگڑھ تحریک کے سارے پھل میٹھے تھے۔ جدید اردو ادبیات کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ سرسید اور ان کے رفقائے مقفٰی نے اردو نثر کا خاتمہ کر دیا اور ایک نئے طرزِ تحریر کو رائج کیا۔ جو اظہار مطلب کے لیے مفید اور سمجھنے میں آسان تھا۔ مولانا شبلی ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

سرسید کے جس قدر کارنامے ہیں۔ اگر چہ ان میں ریفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ لیکن جو چیزیں خصوصیت سے ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بن گئیں۔ ان میں ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق وعاشقی سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی اور تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور و اثر، وسعت وجاہت، سادگی و صنائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو یہ بات آج تک نصیب نہیں۔ ملک میں آج بڑے بڑے انشاء پرداز موجود ہیں۔ جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں۔ لیکن ان میں ایک شخص بھی نہیں جو سرسید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں۔ بعض نے دور سے فیض اٹھایا ہے (95)۔

تحریک علیگڑھ کے رہنما مذہبی مسائل میں متفق نہ تھے۔ سرسید نے جدید علم الکلام کا آغاز کیا۔ اور ان کے باقی رفقائے کار بالخصوص حالی، محسن الملک اور نذیر احمد ان کے اکثر عقائد سے اختلاف رکھتے تھے۔ دوسرے اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ علیگڑھ تحریک نے قوم کو جس رنگ میں رنگا وہ مذہبی نہ تھا۔ بلکہ فی الحقیقت یہ ایک تعلیمی، ادبی اور کلچرل تحریک تھی۔ مذہبی تحریک نہ تھی۔ اس کا مقصد اولیٰ قوم کی دنیاوی پستی کو دور کرنا تھا۔ مذہبی احیاء اس کا مطمح نظر نہ تھا۔ اور یہ صحیح ہے کہ علیگڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ پر مذہبی رنگ خاص طور پر نمایاں نہیں۔

شیخ محمد اکرام اپنی کتاب ''موجِ کوثر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''تحریک علیگڑھ کا اہم ترین مقصد اعلیٰ تعلیم کی اشاعت تھا۔ جسے چند حدود کے اندر اس نے پورا کیا۔ علیگڑھ سے سرسید کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن ان کا عملی مقصد اور مطمح نظر نسبتاً محدود ہو گیا۔ وہ دیکھتے تھے کہ جب سے مسلمان ہندوستان میں آئے ہیں۔ سرکاری ملازمت ان کا اہم ترین پیشہ رہی ہے اور اگر یہ پیشہ بھی ان کے ہاتھ سے ہمیشہ کیلئے چھن گیا تو وہ اقتصادی طور پر اور بھی پسماندہ ہو جائیں گے۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کے پسماندہ ہونے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو گورنمنٹ کو ان پر اعتماد نہ تھا۔ دوسرے اعلیٰ تعلیم میں وہ پیچھے تھے۔ سرسید نے علیگڑھ قائم کر کے ان دونوں باتوں کا سدِ باب کرنا چاہا۔ کالج میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا اور اس کے ساتھ ساتھ یورپین سٹاف کو اپنی تعلیمی سکیم کا جزو لاینفک بنا کر سرسید نے حکومت اور مسلمانوں کے درمیان حائل شدہ خلیج کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ سرسید اور ان کے بعد محسن الملک نے ان اصولوں پر کالج کو چلایا۔ اور ایک محدود مقصد کے حصول میں انہیں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ کالج کے تقریباً تمام فارغ التحصیل طلبہ کو اعلیٰ ملازمتیں مل گئیں اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد علیگڑھ کے طلبہ مختلف جگہوں میں قوم کے لئے ایک مرکز بن گئے۔ ان دنوں علیگڑھ کے طلبہ کی شہرت عروج پر تھی اور علیگڑھ قوم کی تمام تعلیمی اور اجتماعی اصلاحوں کا مرکز تھا (96)۔

بظاہر علیگڑھ نے سرسید کی اکثر عملی توقعات پوری کر دی تھیں۔لیکن کالج کا دور زریں محسن الملک کے ساتھ ختم ہو گیا۔اس کی ایک وجہ اتفاقی حوادث تھے۔اور دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ جن غلط یا صحیح اصولوں پر سرسید نے کالج قائم کیا تھا وہ نظر سے اوجھل ہو گئے۔سرسید نے اس اصول پر ہمیشہ عمل کیا تھا۔کہ کالج کے اندرونی معاملات میں یورپین پرنسپل کو بہت اختیارات ہوں انہوں نے ہمیشہ اس اصول پر عمل کیا کہ جب تک پرنسپل اپنا کام فرض شناسی اور تندہی سے کرتا رہے اور کالج کی روز افزوں ترقی کا باعث ہو اسے کالج کے اندرونی معاملات میں پورا اختیار دیا جائے اس کے علاوہ سرسید کی سکیم کے مطابق یورپین سٹاف،قوم اور گورنمنٹ کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا بھی ایک ذریعہ تھا۔اس لئے سرسید یورپین سٹاف بالخصوص یورپین پرنسپل کا خاص طور پر پاس رکھتے۔

محسن الملک نے سرسید کا اصول برقرار رکھا۔لیکن ان کے زمانے میں پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں۔ایک تو انہیں تمام پرنسپل سمجھدار اور قابل نہ ملے۔دوسرے وہ لوگ جنہیں پرنسپل کے کسی فیصلے کے خلاف جائز یا ناجائز ذرا بھی شکایت ہوئی۔پرنسپل کے مخالف ہو گئے۔اور اس بات کا چرچا کرنے لگے کہ اس کالج میں مسلمانوں کا کیا رہا۔جس میں غیر مسلم پرنسپل کو اتنے اختیارات ہوں۔اس سلسلہ کا اہم واقعہ ۱۹۰۳ء بمطابق ۱۳۲۱ھ میں پیش آیا۔

''مولانا محمد علی مرحوم آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لیکر آئے اور علیگڑھ کالج سٹاف میں شامل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔محسن الملک ان کی قابلیت کے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔لیکن وہ ذہنیت جو انگلش سٹاف اس درسگاہ کی تعلیم و تربیت کا جوہر سمجھتا تھا۔محمد علی میں موجود نہ تھی۔اس لیے ماریسن (پرنسپل) کی سخت مخالفت سے درخواست مسترد ہوئی۔اس کے بعد یورپین پرنسپل اور محسن الملک کے متعلق مولانا محمد علی کے جو خیالات ہوں گے ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

سرسید کی وفات کے بعد نواب محسن الملک نے علیگڑھ کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کیلئے کوشش شروع کی اور ان کی زندگی میں سات آٹھ لاکھ جمع ہوا۔ان کے بعد ہز ہائینس آغا خاں نے اس کام کے لیے بڑی محنت کی۔بیس لاکھ روپے کے فنڈ کے بغیر حکومت یونیورسٹی قائم کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ہز ہائینس نے دورہ کر کے یہ رقم جمع کر دی۔لیکن حکومت نے چند ایسی شرطیں عائد کیں کہ نواب وقار الملک،مولانا محمد علی،مولانا شوکت علی،مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شبلی نے ان کی مخالفت کی۔جس کی وجہ سے یونیورسٹی کا معاملہ عرصے تک کھٹائی میں پڑا رہا۔حتیٰ کہ ہندوؤں نے جن میں یونیورسٹی کی تحریک مسلمانوں سے بہت عرصہ بعد شروع ہوئی تھی۔یہ شرطیں قبول کر کے بنارس میں ہندو یونیورسٹی قائم کر لی اور بالآخر بہت سا قیمتی وقت ضائع کرنے کے بعد کارکنان،علیگڑھ کالج نے انہیں شرائط پر یونیورسٹی بنانی قبول کر لی۔جو پہلے نامنظور کی تھیں اور جنوری ۱۹۲۱ء بمطابق ۱۳۴۰ھ سے پرانا علیگڑھ کالج مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا۔

فصل چہارم:

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر (پاک وہند) کی صورتحال کا جائزہ

آریہ سماجی تحریک:

مسلمانوں کے سیاسی واقتصادی حالات کچھ اس طرح تھے کہ وہ ہندوؤں سے یا ہندوؤں کی سرپرست برطانوی حکومت سے صف آرائی کی سکت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے بحیثیت مجموعی صلح اور مفاہمت کی کوشش کرتے رہے۔ مسلمانوں کی اس صلح جوئی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہندو جارحیت روز بروز بڑھتی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے نیشنل کانگریس کے نام سے جس نئی تنظیم کو ۱۸۸۵ء بمطابق ۱۳۱۲ھ میں جنم دیا تھا اور جسے پورے ہندوستان کی نمائندہ قرار دیا جا رہا تھا۔ وہ بھی اپنی روح میں ہندو ذہنیت کی ترجمان تھی (97)۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہندوؤں کی تحریک احیاء کو فروغ ملا۔ خاص طور پر ''آریہ سماجی تحریک'' کی پیدائش۔ جو ہندوؤں میں جارحانہ فرقہ پرستی کی طاقت ور آلہ کار بن گئی۔ اس کے بانی دیانند سرسوتی نے توحید پر زور دیا اور بُت پرستی کی مذمت کی (اس سے اس کے خیالات پر اسلام کا اثر ظاہر ہوتا ہے) لیکن عملی زندگی میں وہ اس مذہب (اسلام) اور عیسائیت کا دشمن تھا۔ اس کا نعرہ ''ویدوں کی طرف مراجعت'' تھا۔ اس نے کہا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے کے ایک دوسرے نعرہ کو مقبول بنا کر اپنی تحریک کو سیاسی رنگ دیا۔ اس نے لوگوں کو ہندو مذاہب میں شامل کرنے کا طریقہ بھی رائج کیا (حالانکہ ہندومت میں انفرادی تبدیلی مذہب کی کبھی ہمت افزائی نہیں کی گئی)۔ ۱۸۷۴ء میں اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' شائع کی جو آریہ سماج کی مقدس کتاب تھی۔ گائے کی تقدیس نئے مذہب کا اہم عنصر بن گئی (98)۔

۱۸۸۲ء/ ۱۳۰۰ھ میں اس نے ''گئو رکھشا سبھا'' کی بنیاد ڈالی تاکہ مسلمان اور عیسائیوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات ابھارے جائیں۔ کسی حد تک یہ نئی تحریک لوگوں کو ہندو بنانے میں کامیاب ہوئی۔ اس سے ہندوؤں کے سیاسی خیالات پر گہرا اثر پڑا اور وہ جارحانہ طور پر فرقہ پرست بن گئے (99)۔

۱۸۶۷ء بمطابق ۱۲۸۴ھ میں چند تنگ نظر ہندوؤں نے زبان کا مسئلہ اردو ہندو تنازعہ شروع کیا اس کے علاوہ بھی ہندوؤں کی تحریکات مختلف ناموں سے کام کر رہی تھیں۔ ان تحریکات کا مقصد ہندو رسم ورواج کا احیاء اور ویدوں کی تعلیم کی تجدید تھی (100)۔

ہندوؤں نے عصبیت کی بنا پر تقریبات کی آڑ میں مسلمانوں کو پریشان اور تنگ کرنے کے لیے مذہبی میلے منعقد کرنے شروع کر دیے۔ ان میں ایک میلہ ''کنبھی میلہ'' کے نام سے منعقد کیا جاتا تھا (101)۔

بیسویں صدی کے نصف اول (۱۹۱۰ء تا ۱۹۴۰ء بمطابق ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۵۹ھ) میں بعض اہل قلم میں سے ایک گروہ نے روایتی معاندانہ رویہ اور طریقہ اختیار کرتے ہوئے اسلام کے خلاف کتابیں لکھیں (102)۔

پرتاب اپنی اشاعت ۲۶ جون ۱۹۲۴ء بمطابق ۱۳۴۲ھ میں لکھتا ہے کہ ایک نہایت بے ضرر کتاب رنگیلا رسول کے خلاف جس میں حضرت محمد صاحب کی زندگی پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ مہاتما گاندھی سے اعلان نکلوایا ہے۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اس کتاب کا طرز تحریر ایسا شریفانہ اور معقول ہے کہ کسی بے تعصب شخص کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا(103)۔

جب اسلامی اخباروں نے رسالہ مذکورہ پر اظہار نفرت کیا۔ تو اسی آریہ سماجی اخبار نے اس قسم کے تلخ رسالے لکھنے کی وجہ استحقاق بتائی۔ اگر بدھ، عیسیٰ، نانک اور دیانند پر نکتہ چینی کی جاسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ محمد (ﷺ) اس سے بالاتر ہو۔ کوئی بھی ہندو یا آریہ حضرت محمد ﷺ کی بے ادبی اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا۔ ہاں وہ اس اصول کے لیے ضرور لڑیں گے کہ حضرت کی زندگی نکتہ چینی سے بالاتر نہیں۔ مسلمانوں کا کوئی حق نہیں جب کبھی غیر مسلم اس مضمون پر قلم اٹھائے تو آپ سے نکلنے کی کوشش کریں(104)۔

حضور اکرم ﷺ کے خلاف سب وشتم کی تحریک جو ہندوؤں میں رہی وہ اس تحریک کا گھناؤنا پہلو تھی۔ اس کی بنیاد علمائے مغرب نے تحقیق کے پردے میں ڈالی تھی۔ اور اس دوران وہ جھوٹ تراشے گئے کہ افشائے حق ہونے پر خود ان کے ہم مذہبوں کی گردنیں ندامت سے جھک گئیں۔ آج یورپ کے علماء میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے تحقیق وتفتیش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا ہے۔ انگریز جب آزادی مذہب کی آڑ میں غیر جانب ہوگیا تو گھٹیا قسم کے چند ہندو مصنفوں نے پیغمبر اسلامؐ پر نجاست اچھالنے کو پیشہ بنالیا۔ بہرکیف دلی میں عبدالرشید کے ہاتھوں شردیانند کیفر کردار کو پہنچا۔ لاہور میں علم الدین کے ہاتھوں راجپال اور کراچی میں عبدالقیوم کے ہاتھوں ہراچین کہانی کا مصنف انجام کو پہنچا(105)۔

مذہبی مناظرے تو ایک عرصے سے ہوتے چلے آرہے تھے اور ان میں پھبتی کا رواج بھی تھا۔ لیکن دشنام طرازی کی باقاعدہ ابتداء ہندوؤں کے ایک مخصوص فرقے آریہ سماج نے کی۔ مقصد مسلم آزاری تھا۔ حضورؐ کے خلاف چند دریدہ ذہن مصنفین نے اس شدت اور تواتر سے گندگی اچھالنا شروع کی کہ مسلمانوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پوری قوم خیبر سے راجکماری تک شعلہ بر اہن ہوگئی(106)۔

دوسری طرف آریہ سماجی مبلغ جوش وخروش سے اسلام کی تردید کررہے تھے۔ انگریزوں کی مصلحت (جو ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۱ھ) کی متحدہ کوشش اور ہندوستان کے اتحاد کی چوٹ کھاچکے تھے) یہ تھی کہ ان مناظروں کی ہمت افزائی کی جائے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں ملک میں کشمکش اور ذہنی و اخلاقی انتشار پیدا ہوتا تھا۔ تمام مذاہب اور فرقوں کو ایک ایسی طاقت اور قوت کا وجود غنیمت معلوم ہوتا تھا جو ان سب کی حفاظت کرے اور جس کے سایہ میں یہ سب امن و امان کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کرتے رہیں(107)۔

ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانے پر تبلیغ دیکھ کر ہندوؤں کو بھی جرات ہوگئی کہ وہ اپنے مذہب کا پرچار کریں اور عیسائیت کی طرح وہ بھی مسلمانوں سے مذہبی امور میں الجھتے رہیں۔ چنانچہ اس سلسلے کی کڑی شاہ جہاں پور سے پانچ چھ میل دور ایک قصبہ ''چاند پور'' ہے۔ اس قصبہ کے ہندو رئیس منشی پیارے لال کبیر ہے۔ ۱۸۷۶ء/۱۲۹۳ھ میں ایک مذہبی میلہ بنام خدا

شناسی منعقد کرایا۔ جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا باہمی مباحثہ لے پایا اور اس میں تینوں فریق شریک ہوئے، پنڈت، دیانند سرسوتی، منشی اندرمن نے حصہ لیا(108)۔

ان علمی مراکز کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اس وقت مذہبی طور پر یہ تحریکیں مدرسوں کے احاطے میں کام کر رہی تھیں۔

مسلمانوں کے موجودہ علمی اور ثقافتی مراکز اور ان کی تعلیمی تحریکیں:

ہندوستان کی سرزمین نے اس دور میں ایسے جلیل القدر فاضل، باکمال مصنف اور محقق پیدا کیے۔ جنہوں نے اس وقت کی پوری متمدن دنیا کے ذہن پر اپنی بلندی و انفرادیت کا نقش قائم کر دیا۔ اور ساری علمی دنیا میں ہندوستان کا پایہ بلند کر دیا۔ مسلمانوں کے موجودہ علمی وثقافتی تحریکوں میں سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی تحریکیں ہیں جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

ا۔ دارالعلوم دیوبند:

ہندوستان میں خالص دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز دارالعلوم دیوبند ہے۔ اس مدرسہ کی ابتداء سہارنپور کے ایک قصبہ دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد (چھتہ والی) میں ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں ہوئی۔ جو دیوبند کے ایک بزرگ حاجی محمد عابد صاحب نے قائم کیا تھا۔ لیکن اس کی ساری ترقی وتوسیع۔ شہرت ومقبولیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے اخلاص، بلند ہمتی و بلند نظری کی مرہون منت ہے۔ اس کے بعد اس مدرسہ میں جن باکمال مخلص اساتذہ نے خدمات سرانجام دیں۔ ان میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، مولانا غلام رسول ولایتی، مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی اور مولانا اعزاز علی صاحب کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا(109)۔

۲۔ مظاہر العلوم:

دوسرا مدرسہ مظاہر العلوم ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے بعد اسی کا نام آتا ہے۔ اس کی بنیاد ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں مولانا سعادت علی صاحب سہارنپوری کے مبارک ہاتھوں سے پڑی۔ اس کا نام مولانا محمد مظہر نانوتوی کے نام نامی پر (تھوڑے تغیر کے ساتھ) مظاہر العلوم قرار پایا۔ اس کو بالترتیب مولانا رشید احمد گنگوہی مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا۔ اس کے باکمال ومخلص اساتذہ میں مولانا ثابت علی مولانا عنایت الٰہی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، مولانا عبداللطیف سہارنپوری، مولانا محمد الیاس دھلوی، مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور مولانا اسد اللہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں(110)۔

۳۔ درس نظامی کے دوسرے مدارس:

ان مدارس میں (شمالی ہند میں) مرادآباد کا مدرسہ شاہی اور دربھنگہ کا مدرسہ امدادیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مدرسہ

رحمانیہ دہلی، مدرسہ رحمانیہ بنارس، مدرسہ احمدیہ سلفیہ مہریا سرائے (دربھنگہ) مدرسہ عالیہ رامپور، مدرسہ عالیہ کلکتہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد، جامعہ دارالسلام عمرآباد، الباقیات الصالحات ویلور خاص طور پر قابل ذکر ہیں (111)۔

۴۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ:

قدیم طرز کے ان دینی مدارس اور جدید طرز کی یونیورسٹیوں کے درمیان دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ہاتھوں اور ان کے مخلص ساتھیوں کے ذریعہ عمل میں آیا۔ اس کی مجلس انتظامی میں بحیثیت رکن یا اس کے دائرۂ عمل میں بحیثیت کارکن شریک ہوئے۔ ان میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا شاہ سلیمان پھلواردی، منشی اطہر علی کاکوری، منشی احتشام علی کاکوری، مولانا محمد ابراہیم آروی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سر رحیم بخش، مولانا مسیح الزمان خاں (استاد میر محبوب علی خاں نظام دکن)، مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری (فرزند مولانا احمد علی صاحب محدث) مولانا حکیم سید عبدالحی، نواب مولانا سید علی حسن خاں (فرزند نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال) مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر پانچ اشخاص کے بعد دیگرے ندوۃ العلماء کے ناظم رہے۔ ڈاکٹر سید عبدالعلی کی نظامت میں ندوۃ العلماء کے ناظم رہے (112)۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم رہے اور دسمبر 1999ء میں ان کے انتقال کے بعد مولانا عبداللہ عباس ندوی ناظم بنے۔ عبداللہ عباس کے انتقال کے بعد آج کل مولانا علی میاں کے بھانجے مولانا سید رابع حسنی ندوی ناظم ہیں۔ مولانا علی میاں کے زمانہ نظامت میں ندوہ بین الاقوامی شہرت کا حامل ہوا۔

۵۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر:

دارالعلوم کے طرز پر ۱۹۰۹ء/۱۳۲۷ھ میں ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ سرائے میر میں مولانا حمید الدین صاحب فراہی نے مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد ڈالی (113)۔

دارالعلوم دیوبند اور اسی طرز کے دوسرے قدیم دینی مدارس کے بالمقابل وہ جدید یونیورسٹیاں ہیں جن کو مسلمانوں نے مختلف اوقات میں قائم کیا۔ ان یونیورسٹیوں کا قیام مسلم نوجوانوں کو جدید علوم غیر ملکی زبانوں کی تعلیم، سرکاری دفتروں میں کام کرنے اور ملک کے نظم و نسق میں پورا پورا حصہ لینے کے لیے تیار کرنے کے مقصد سے عمل میں آیا تھا۔ یہ یونیورسٹیاں درج ذیل ہیں:

ا۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ:

ان یونیورسٹیوں میں سب سے مشہور قدیم یونیورسٹی ہے۔ جن میں مسلمانوں کے جدید ذہن اور قومی مزاج و سیاست کی تشکیل میں اہم ترین حصہ لیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے۔ اسے مشہور مسلم رہنما سر سید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں مدرسۃ العلوم کے نام سے علیگڑھ میں قائم کیا تھا جو کہ ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر کے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نام

سے مشہور ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کو اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ پورے ملک سے کھاتے پیتے، خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے طلباء بڑی تعداد میں یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئے اور تعلیم سے فراغت کے بعد انہیں حکومت وقت کا اعتماد حاصل ہوا اور بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی نے ملک کی سیاسی زندگی بالخصوص مسلم سیاست میں نمایاں اور ناقابل فراموش حصہ لیا۔ ہندوستانی متحدہ قومیت کی تحریک کے مقابلہ میں مسلم قومیت کی تحریک یہیں سے اٹھی(114)۔

۲۔ جامعہ ملیہ دہلی:

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے چند ہونہار فضلاء تحریک خلافت کے زمانے میں یونیورسٹی سے علیحدہ ہو گئے اور انہوں نے ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ میں ایک آزاد قومی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم کیا۔ جس کا سنگ بنیاد شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی نے رکھا۔ بعد میں یہ تعلیم گاہ دہلی منتقل ہوگئی۔ اس جماعت کی قیادت مولانا محمد علی جوہر کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے خاص معاونین میں حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے(115)۔

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد:

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں اردو زبان کو جو ہندوستان کی علمی زبان ہے۔ ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور دوسری زبانوں سے جدید علوم، فلسفہ، حکمت، طبیعیات، طب، سیاسیات، معاشیات اور تاریخ کا بڑا ذخیرہ اردو میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جامعہ کو ہندوستان کے بعض لائق ترین اساتذہ اور ماہرین فن کی تدریسی خدمات حاصل رہی ہیں۔ ان میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات، مولانا عبدالباری ندوی استاد فلسفہ، پروفیسر الیاس برنی استاد معاشیات، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم استاد فلسفہ جدید۔ ڈاکٹر میر ولی الدین (فلسفہ) ڈاکٹر حمید اللہ (سیاسیات) پروفیسر ہارون خاں شیروانی (سیاسیات) ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ریاضیات، ڈاکٹر محی الدین قادری زور (اردو)، ڈاکٹر سید عبداللطیف (انگریزی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں(116)۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ:

فضلائے دارالعلوم ندوۃ نے اعظم گڑھ میں ۱۹۱۶ء/۱۳۳۵ھ میں ایک وقیع تصنیفی و علمی اکیڈمی "دارالمصنفین" قائم کی۔ اس علمی مجلس کو ربع صدی سے زیادہ مدت تک مولانا سید سلیمان ندوی کی سرپرستی و نگرانی کا شرف حاصل رہا۔ مجلس کے رفقاء نے مذہب، تاریخ اور ادب کے مختلف شعبوں میں مختلف کتابیں تالیف کیں۔ جن کی مجموعی تعداد ۱۹۶۰ء/۱۳۸۰ھ تک نوے تک پہنچ چکی ہے۔ مشہور علمی و ادبی ماہنامہ "معارف" بھی "دارالمصنفین" ہی سے نکلتا ہے۔ جس کے مدیر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین مقرر ہوئے تھے(117)۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم بنائے گئے۔ صباح الدین کے حادثہ انتقال کے بعد ضیاء الدین اصلاحی ناظم بنائے گئے۔ گذشتہ سال اصلاحی صاحب کے انتقال کے بعد اب

ڈاکٹر اشتیاق ظلی ناظم ہیں۔

دائرۃ المعارف حیدرآباد:

ہندوستان کے عظیم علمی اداروں میں ''دائرہ معارف'' حیدرآباد کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جس نے بکثرت بیش قیمت اور اہم علمی و دینی کتابوں کو قدیم ترین کتب خانوں سے نکال کر شائع کرنے کی ذمہ داری لی۔ ''دائرہ المعارف'' کا قیام ۱۸۸۸ء میں عمادالملک سید حسین بلگرامی، ملا عبدالقیوم اور فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں استاد میر عثمان علی خاں سابق نظام حیدرآباد کی تحریک پر عمل میں آیا۔ دائرہ نے اب تک حدیث اسماء الرجال، تاریخ، ریاضیات اور فلسفہ کی ڈیڑھ سو سے زائد ایسی قیمتی و نادر کتابیں شائع کیں۔ جن کو عالم اسلام اور ہندوستان کے علمی حلقے عرصہ دراز سے فراموش کر چکے تھے(118)۔

دارالترجمہ مرحوم:

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے جب اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ کیا تو ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء میں ''دارالترجمہ'' کی بنیاد پڑی۔ جس نے ۳۵۸ کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ ان کتابوں میں تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، معاشیات، قانون، عمرانیات، فلسفہ، منطق مابعد الطبیعیات، نفسیات، اخلاقیات، ریاضیات، طبعیات، حیاتیات، کیمسٹری، طب اور انجینئرنگ کی کتابیں شامل ہیں۔ دارالترجمہ کی عظیم خدمات میں علمی اصطلاحات اور اردو میں ان کے ترجمہ کا گراں قدر کام بھی ہے۔ جس سے ہندوستان کے تمام علمی و ادبی حلقوں نے فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان کے متعدد مشاہیر فضلاء اور اہل قلم اس ادارہ سے منسلک رہے ہیں۔ جن میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا عبداللہ عمادی، مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی، مولوی عنایت اللہ دہلوی، مولوی مسعود علی محوی اور قاضی تلمذ حسین گورکھ پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سقوط حیدرآباد کے بعد یہ ادارہ بند کر دیا گیا اور کتب خانہ میں آگ لگ گئی۔ جس کی وجہ سے یہ عظیم علمی سرمایہ جس پر کروڑوں روپے صرف ہوئے تھے۔ تباہ و برباد ہو گیا(119)۔

قدیم کتب خانے:

ہندوستان کے روساء، نوابوں نے بڑے بڑے کتب خانوں کے قیام پر بڑی توجہ کی تھی اور یہاں سینکڑوں کتب خانے مختلف مقامات پر قائم ہوئے تھے۔ سب سے اہم کتب خانہ بانکی پور پٹنہ کی خدا بخش لائبریری ہے۔ اس کے علاوہ ریاست رامپور کا کتب خانہ، رضا لائبریری، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد اور نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، سابق صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد کا کتب خانہ، کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور ناصر الملت مولوی سید ناصر حسین صاحب کنتوری لکھنؤ وغیرہ کے کتب خانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں(120)۔

خلاصہ کلام

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں چند ایک سلطنتیں اپنا ظاہری وجود سلامت رکھ پائیں لیکن الگ علاقے پر حکمران ہونے کے باوجود بھی غیر مسلموں کی دخل اندازی سے اپنے آپ کو نہ بچاسکیں۔ سلطنت عثمانیہ کے اکثر و بیشتر مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ایران و افغانستان کی حکومتیں اتنی تیزی سے تبدیل ہونے لگیں کہ ان کا اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ برصغیر پاک و ہند میں حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کا استحصال کیا۔

ان حالات کے باوجود مسلم حکمران اپنی عیش و عشرت کی زندگی میں مست رہے اور وہ غیر مسلم دخل اندازوں کی روک تھام میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہے۔

یہ سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی حالات تھے جن کے اثرات انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی اور ایشیائی ممالک پر مرتب ہونے شروع ہوئے۔ انہی اثرات کی آغوش میں بہت سے قوم پرست پیدا ہوئے۔ ایشیا اور اسلام کے ان قوم پرستوں کی صف اوّل میں انیسویں صدی عیسوی میں سید جمال الدین افغانی اور بیسویں صدی عیسوی میں مولانا عبید اللہ سندھی کا شمار ہوتا ہے۔

حوالہ جات

1۔ صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۳۵۲۔

2۔ ایضاً، ج ۲، ص ۳۵۵۔

3۔ خان، محمد رضا، پروفیسر، قدیم وجدید تاریخ مسلمانانِ عالم، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۸۹۰۔

4۔ صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۳۵۱۔

5۔ افضل، محمد، میاں، سقوط بغداد ڈھاکہ تک، مجاہد اکیڈمی، لاہور، باراوّل، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۔

6۔ ایضاً، ص ۳۹۵۔

7۔ حتی، فلپ، کے، عربوں کا عروج وزوال، ترجمہ، نظر زیدی، سن ومقام اشاعت ندارد، ص ۲۳۳۔

8۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ خان، مولانا، تاریخ اسلام، حصہ سوم، نفیس اکیڈمی، کراچی، بار یازدہم، مارچ، 1986ء، ج ۳، ص ۳۱۶۔

9۔ ایضاً، ج ۳، ص ۳۱۷۔

10۔ ایضاً، ج ۳، ص ۳۱۷۔

11۔ افضل، محمد، میاں، سقوط بغداد ڈھاکہ تک، مجاہد اکیڈمی، لاہور، باراوّل، ۱۹۹۹ء، ص ۳۹۵۔

12۔ ایضاً، ص ۳۹۷۔

13۔ ایضاً، ص ۴۰۲۔

14۔ ایضاً، ص ۴۰۲، ۴۰۳۔

15۔ صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۳۵۳۔

16۔ عالم، اسرار، عالم اسلام کی اخلاقی صورتحال، قاضی پبلشرز، دہلی، باراوّل، مئی ۱۹۹۶ء، ص ۱۸۴۔

17۔ افضل، محمد، میاں، سقوط بغداد ڈھاکہ تک، مجاہد اکیڈمی، لاہور، باراوّل، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰۳۔

18۔ ایضاً، ص ۴۰۴۔

19۔ خان، محمد رضا، پروفیسر، قدیم وجدید تاریخ مسلمانانِ عالم، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۳۶۴۔

20۔ ایضاً، ص ۳۶۶۔

21۔ ایضاً، ص ۳۶۸۔

22۔ ایضاً، ص ۳۶۸۔

23۔ ایضاً، ص ۳۷۲، ۳۷۳۔

24۔ ایضاً، ص ۳۷۴۔

25۔ حتی، فلپ، کے، عربوں کا عروج وزوال، ترجمہ، نظر زیدی، سن ومقام اشاعت ندارد، ص ۲۳۳۔

26- صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۲۵۰۔

27- قادری، عبدالقیوم، محمد، مفتی، تاریخ نجد و حجاز، رضا پبلیکیشنز، لاہور، بار اول، ۱۳۹۸ھ، ص ۱۹۶۔

28- ایضاً، ص ۱۹۷۔

29- ایضاً، ص ۳۷۴۔

30- کرنز یک، جیمز، آر، ہیلی وائنڈ، دنیائے اسلام، ترجمہ، سید ہاشمی فرید آبادی، مقبول اکیڈمی، لاہور، س ن، ص ۳۲۹۔

31- صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۲۸۰-۲۸۱۔

32- عزیز، محمد، دولت عثمانیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۴۲ء، ج ۲، ص ۲۰۸۔

33- صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۲۸۸۔

34- جیراج پوری، اسلم، علامہ، تاریخ الامت، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، ۱۹۵۷ء، ج ۷، ص ۱۴۶۔

35- عزیز، محمد، دولت عثمانیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، ج ۲، ص ۲۳۹۔

36- ایضاً، ج ۲، ص ۲۴۳۔

37- صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۳۳۵۔

38- ایضاً، ج ۲، ص ۴۹۸۔

39- ایضاً، ج ۲، ص ۵۱۵۔

40- ایضاً، ج ۲، ص ۵۲۲۔

41- حیات، محمد، شیخ، تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار اول، ۱۹۹۴ء، ص ۱۵۔

42- ایضاً، ص ۷۔

43- ایضاً، ص ۱۹۳۔

44- ایضاً، ص ۲۰۹۔

45- ایضاً، ص ۲۲۸۔

46- صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۴۱۱۔

47- حیات، محمد، شیخ، تاریخ اسلامی جمہوریہ ایران، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، بار اول، ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۳۔

48- ایضاً، ص ۲۵۵۔

49- صولت، ثروت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، بار پنجم، جنوری ۱۹۹۲ء، ج ۲، ص ۴۱۶-۴۱۷۔

50- ایضاً، ج ۲، ص ۴۱۹۔

51- ایضاً، ج ۲، ص ۴۱۹۔

52- ایضاً، ج ۲، ص ۴۲۰۔

53- ایضاً، ج ۲، ص ۴۲۲۔

54- ڈاکٹر رفیق زکریا، محمد اور قرآن، خلیق انجم، حرف آغاز، ص ۱۵، انکس بک ہاؤس لاہور، ۱۹۶۶ء۔

55- شیخ محمد اکرام، موجِ کوثر، ادارہ فروغ اردو بازار لاہور، ص ۱۵۶۔

56- علی بن حامد، چچ نامہ انگریزی (مترجم مرزا قلیچ فریدون بیگ) کراچی، ۱۹۰۰ء، ص ۱۹۱۔

57- جمیل الدین احمد، صحیفہ (لاہور) اپریل، ۱۹۶۸ء، ص ۹۸۔

58- شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، مکتبہ السلفیہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۵ء۔

59- ڈاکٹر محمد عمر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، پاک اکیڈمی کراچی، ص ۵۴۔

60- ایضاً، ص ۵۹۔

61- ایضاً، ص ۶۰۔

62- ایضاً، ص ۵۰۔

63- سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۲۲۰۔

64- محمد عمر، ڈاکٹر، ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، پاک اکیڈمی، کراچی، ص ۳۶۰۔

65- مولوی سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، مطبوعہ رام پور، ۱۹۶۵ء، ص ۳۷۔

66- ایضاً، ص ۱۳۹۔

67- تفہیمات الٰہیہ، طبع بجنور، ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء، ص ۲۴۶۔

وصیت نامہ (فارسی) مطبوعہ دہلی، ۱۲۶۸ھ، ص ۲۴۔

68- ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ملت اسلامیہ، ص ۲۰۔

69- سید ابوالحسن ندوی، ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات ونشریات اسلامی لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۱ء، ص ۸۸

70- ملت اسلامیہ، ص ۲۰۔

71- ابوالحسن ندوی، ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات ونشریات اسلامی لکھنؤ ۱۹۶۱ء، ص ۹۰۔

72- ملت اسلامیہ، ص ۲۰۱۔

73- محمد اکرام شیخ، ڈاکٹر، موجِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص ۱۴۔

74- ایضاً، ص ۱۳۔

75- صباح الدین عبدالرحمٰن سید، ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ص ۲۴۴۔

76- امداد اللہ صابری، فرنگیوں کا جال، محلہ چوڑی گراں دہلی ۱۹۴۹ء، ص ۱۳۔

77- ایضاً، ص ۱۹۔

78- ابوالفضل (مترجم وجاہت حسین شیخ)، انشائے ابوالفضل، مطبع برقی اعظم حیدرآباد، ۱۰۴۷ھ، ص ۲۹۔

79- عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، شیخ غلام رسول اینڈ سنز، کشمیری بازار لاہور، ۱۹۶۲ء، جلد ۲، ص ۲۶۰۔

80- سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خاں اوران کے نامور رفقاء، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۲۰۔

81- اشتیاق حسین قریشی (مترجم بلال احمد زبیری، ڈاکٹر)، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم، کراچی ۱۹۶۷ء، ص ۳۲۹۔

82- محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند، جلد ۱، ص ۳۴، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

83- ہدایت اللہ چوہدری، تاریخ ہند، علمی کتب خانہ لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۱۸۱۔

84- Karastan Derban, Bulk Dacoment, London, 1970, p18.

85- سید بلگرامی، تمدن ہند، مقبول اکیڈمی، چوک انارکلی لاہور ۱۹۶۲ء، ص ۵۵۸۔

86- ایضاً، ص ۵۶۰۔

87- ایضاً۔

88- محمد میاں سید، روشن مستقبل، مکتبہ رشیدیہ کراچی، ص ۱۳۱۔

89- W.W.Hunter (مترجم صادق حسین قریشی) ہمارے ہندوستانی مسلمان، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۵۵ء، ص ۲۰۲۔

90- مسٹر ایڈورٹامس، انقلاب ایران، ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ، ص ۱۰۸۔

91- لیڈر اخبار، مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۲ء۔

92- محمد علی چراغ، تاریخ پاکستان، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۶۔

93- سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر، شبلی کا ذہنی ارتقاء، مجلس یادگار ہاشمی، کراچی، ص ۷۵۔

94- ڈاکٹر پانکر، سروے آف انڈین ہسٹری۔

95- سخی احمد ہاشمی، ڈاکٹر، شبلی کا ذہنی ارتقاء، مجلس یادگار ہاشمی، کراچی، ص ۷۵۔

96- شیخ محمد اکرام، موج کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، جم کلب روڈ لاہور ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۱۔

97- سلیمان ندوی، سید، نقوش سلیمانی، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۹۴۔

98- سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، ص ۱۹۴، اردو اکیڈمی سندھ کراچی، ص ۱۹۶۷ء۔

99- ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان ترجمہ صادق حسین، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۵۵ء۔

100- Sitaramayya B: Pitta Bhai, History of Indian National Congress Madras 1936, vol.1, p13.

101- Lord Minto and the Indian Nationalist moment, p 4.

102- محمد میاں سید، علمائے حق، مراد آباد، حصہ اوّل، ۱۹۴۶ء، ص ۱۱۸۔

103- پرتاب، ۲۶ جون ۱۹۲۴ء، ص ۲ بحوالہ مقدس رسول، ص ۳۲۔

104- پرتاب، ۱۲ جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۲ کالم ۲۔

105- محمد سعید، آہنگ بازگشت، ۹۰ ڈی سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی، ۱۹۷۹ء، ص ۳۹۔

106- ایضاً، ص۴۶۔

107- ابوالحسن ندوی، سید، قادیانیت مطالعہ و جائزہ، مجلس نشریات اسلام، کراچی۔

108- عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، دی کلاسک، دی مال لاہور، ۱۹۶۹ء، ص۱۲۹-۱۳۰۔

109- سید ابوالحسن ندوی، ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات و نشریات، اسلام لکھنؤ، ص ۱۱۷۔

110- ایضاً، ص۱۱۸۔

111- ایضاً۔

112- ایضاً، ص۱۱۹۔

113- ایضاً، ص۱۲۱۔

114- ایضاً، ص۱۳۰۔

115- ایضاً، ص۱۳۱۔

116- ایضاً۔

117- ایضاً، ص۱۳۲۔

118- ایضاً، ص۱۳۳۔

119- ایضاً۔

120- ایضاً، ص۱۵۔

باب دوم

سید جمال الدین افغانی

کے حالات زندگی

پیدائش: اکتوبر 1838ء/1254ھ

وفات: مارچ 1897ء/1314ھ

افغانی می گوید

عالمے در سینہ ماگم ہنوز　　　عالمے در انتظار ِ قُم ہنوز
عالمے بے امتیاز ِ خون و رنگ　　　شام ِ او روشن تراز فبام ِ فرنگ
لا یزال و وارد آتش نوبنو　　　برگ و بار محکما تش نوبنو
باطن ِ او از تغیر غمے　　　ظاہر او انقلاب ہر دمے
اندرون تست آں عالم نگر
می وہم از محکمات ِ او خبر (اقبال،جاوید نامہ)

ترجمہ:

ایک عالم ہمارے سینے میں ابھی تک گم ہے　　　وہ عالم جو ابھی تک "قُم" کے انتظار میں ہے
اس عالم میں خون ورنگ کا فرق نہیں ہے　　　اس کی شام یورپ کی صبح سے زیادہ روشن ہے
اس کے انقلابات غیرفانی اور نئے ہیں　　　جس کے محکمات کے پتے اور پھر تر و تازہ ہیں
جس کا باطن تبدیلی سے بے نیاز ہے　　　اس کا ظاہر ہر لحہ انقلاب کی زد میں ہے
دیکھ وہ عالم تیرے اندر ہے
میں تجھے اس کے محکمات کی خبر دیتا ہوں

تعارف

اس باب میں عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے معمار سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی قلمبند کیے ہیں۔اس باب کی چار فصول بنائی گئی ہیں۔

فصل اوّل میں مختصر حالات زندگی، نام ونسب، وطنیت ولادت، تعلیم وتربیت، جرائد، آپ کی سیاسی بصیرت کے بارے تحقیقی موادشامل ہے۔

فصل دوم میں آپ نے جن ممالک کے سفر کیے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

فصل سوم میں آپ کے شاگردوں اور معتمد ساتھیوں کا ذکر ہے۔

فصل چہارم میں آپ کے اقوال ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

فصل اوّل:

سید جمال الدین افغانی کے حالات زندگی

انیسویں صدی، انسانی تہذیب کی ایک ایسی منزل ہے جہاں پہنچ کر پرانا نظام حیات دم توڑ دیتا ہے۔ پرانا تہذیبی سرمایہ، پرانی روایات، پرانا طرز فکر، پرانی قدریں، وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ اب کاروانِ زندگی نئے انداز سے ترتیب دیا جانے لگتا ہے۔ ایک طرف یورپ کا صنعتی انقلاب سماج اور سیاست کی بنیادیں بدل دیتا ہے۔ دوسری طرف سائنس کی ترقیوں کے ذریعہ زمان و مکاں کی پہنائیاں سمٹ جاتی ہیں اور قوائے فطرت کی تسخیر سے انسان کے قبضہ میں ایسی قوت آ جاتی ہے، جو گھر کی چہار دیواری سے لے کر میدانِ جنگ تک کے نقشے بدل دیتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے زیر اثر قومیت، آزادی اور جمہوریت کے بے تاب عناصر متحرک ہو جاتے ہیں۔

انیسویں صدی میں جب کہ دنیا اس تیزی سے بدل رہی تھی، مسلمان قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے نہایت سکون سے بیٹھے تھے۔ کبھی افسانوی شتر مرغ کی طرح اپنی گردنوں کو عظمت گذشتہ کے ریگزار میں چھپا لیتے تھے۔ کبھی ان کی تھکی ہوئی قوتیں تصوف کے دامن میں پناہ لے لیتی تھیں۔ کبھی "مہدی موعود" کے انتظار میں زندگی کے حقائق سے فرار تلاش کر لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وقت کا جابر ہاتھ کبھی ان کے روز و شب پر اثر انداز نہ ہو سکے گا۔

ان حالات میں سید جمال الدین افغانی نے مشرق کی خوابیدہ اقوام کو بیدار کیا۔ انہوں نے ایک انقلابی پروگرام مرتب کیا۔ ان کی تحریک کے تین پہلو نہایت اہم ہیں:

۱۔ مغربی یورش کا مقابلہ کرنے کیلئے وحدت اسلامی۔

۲۔ قرآن کی بنیادی تعلیمات کو رسوم اور اوہام سے پاک کر کے اسلامی تطہیر۔

۳۔ غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کی مذہبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو کسی مزاحمت کے جاری رہنے کی ضمانت۔

انہی تین بنیادی خطوط پر انہوں نے اپنی پوری تحریک کی عمارت کھڑی کی۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے مسلسل سفر کی تکلیفیں برداشت کیں(1)۔

اس سلسلہ میں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ سید جمال الدین کی تحریک تجدد اصلاح اس سلسلہ کی کڑی تھی۔ جسے اٹھارویں صدی میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نے نجد سے شروع کیا تھا۔ انہوں نے بھی جب اتحاد اسلامی کا نعرہ بلند کیا اور اصلاح کا پروگرام پیش کیا تو ان کی تحریک کو وہابیت کا نام دیکر عمومیت اختیار کرنے سے روک دیا گیا اور یہ تحریک نجد سے باہر نہ پنپ سکی۔ اسی طرح جب انیسویں صدی میں امام محمد بن سنوسی نے طرابلس میں آ کر اتحاد اسلامی کی ضرورت محسوس کی تو نامساعد حالات کا ایک پہاڑ لا کھڑا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ تحریک شمالی افریقہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اور آج یہ تحریک سنوسیت کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ ان تمام تحریکوں نے سید جمال الدین افغانی کی تحریک کیلئے عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں ایک محدود مگر سازگار ماحول پیدا کر رکھا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ سید کی تحریک نے بیک وقت ایران، مصر اور ترکی میں نہایت ہی کامیاب نتائج پیدا کرنے شروع کر دیئے جب انہوں نے اپنے مشن کی ابتداء کی تو ان کی تحریک کو پین اسلام ازم کا نام دیا گیا(2)۔

اکثر انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں کا جائزہ لیتے وقت ان مختلف ملکوں کے مخصوص مسائل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ایک ہی پیمانے سے ان سب تحریکوں کو جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان تحریکوں نے جو صورت بھی اختیار کی کہ وہ حالات گرد و پیش کا لازمی نتیجہ تھا۔ مولانا جمال الدین افغانی کے نکتہ خیال پر عمل انیسویں صدی کے ہندی مسلمانوں کے لیے سم قاتل کا اثر رکھتا۔ جمال الدین افغانی کے سیاسی نظریات بیسویں صدی کے ربع اول میں ہندوستان کی سیاسی تحریکوں میں جان ڈالنے میں مفید ثابت ہو سکتے تھے اور ہوئے، لیکن انیسویں صدی میں ان پر نظر اٹھا کر دیکھنا بھی قومی مصائب اور تباہی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے معمار علامہ سید جمال الدین افغانی کی عظیم شخصیت ایک حیران کن کرشمہ قدرت معلوم ہوتی ہے۔ آپ افغانستان میں پیدا ہوئے اور روایتی ماحول میں پرورش پائی۔ لیکن ترقی پسند رجحانات، روشن افکار، سیاسی فہم و فراست، دینی بصیرت اور انقلاب آفرین قوت عمل کے باعث وہ اپنے دور کے عظیم ترین مسلمان رہنما اور اسلامی دنیا میں ملی بیداری، سیاسی آزادی اور روشن خیالی کے ایک نئے دور کے بانی ثابت ہوئے۔

سید جمال الدین افغانی اس چشم بصیرت کے مالک تھے۔ جو ہر طوفان کے آنے سے پہلے ہی اس کے آثار سے طوفان کی وسعتوں اور تباہ کاریوں کو دیکھ لیتی ہے۔ آپ اس دل و دماغ کے حامل تھے۔ جس پر مزاج گردش ایام پوری طرح واضح رہتا ہے۔ سید صاحب نے عرب و عجم، ہندوستان، مصر، افغانستان غرضیکہ ہر جگہ ہزاروں طرح کی مصیبتیں جھیل کر بھی سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ کا پیغام سنایا۔

جس زمانہ میں سید جمال الدین افغانی نے اپنا نظریہ قائم کیا۔ اس وقت مسلم سوسائٹی اندھی تقلید کی گہرائیوں میں جا رہی تھی۔ اگر اس انحطاط کے دور کو نہ روکا جاتا تو انہیں خطرہ تھا کہ تمام ممالک بے راہ روی کا شکار نہ ہو جائیں۔

انہی حالات میں زبردست جسامت رکھنے والا ایک نیا سیارہ اسلام کے نام پر طلوع ہوا جس کی درخشانی نے اس تاریکی کے اندر گھس کر جو دنیائے اسلام پر طاری تھی۔ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اس شخصیت کا نام سید جمال الدین افغانی تھا۔

سید جمال الدین افغانی عالم اسلام کی وہ عظیم المرتبت شخصیت ہیں جنہوں نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کے فکر و عمل کے ہر ہر گوشے پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ علم و ادب، تعلیم و تربیت، اخلاق و مذہب، معاشرت و سیاست ہر ہر جگہ ان کا اصلاحی ہاتھ پہنچا ہے اور اس طرح کے اثرات آج تک ہماری زندگی میں کام کر رہے ہیں۔

نام و نسب:

آپ کا نام سید جمال الدین افغانی ہے۔ والد کا نام صفدر اور مورث اعلیٰ کا نام سید علی ترمذی ہے۔ سید جمال الدین افغانی سید علی کی نویں پشت میں تھے اور ان کا سلسلہ نسب یہ ہے:

سید جمال الدین بن سید صفدر بن سید علی بن سید رضی الدین بن سید زین الدین یا سید زین الدین بن سید ظہیر الدین بن سید جمال الدین عرف سید جمال بن سید عبدالوہاب عرف میاں عبدل بن سید مصطفیٰ بن سید علی ترمذی۔ سید علی کے اجداد میں ایک مشہور عالم اور بزرگ سید امیر علی معروف بہ جلال گنج العلم بخاری ہوئے ہیں (3)۔

نسب و وطنیت کے متعلق ایک جداگانہ بیان:

حسب ذیل خلاصہ قاضی محمد عبدالغفار صاحب نے عبدالجبار شاہ صاحب والی ریاست سوات کی ایک کتاب کے مسودہ سے حاصل کیا جو وہ مرتب کر رہے ہیں۔ سید عبدالجبار شاہ صاحب سے سید جمال الدین افغانی کی وطنیت اور خاندانی حالات کے متعلق جو گفتگو قاضی محمد عبدالغفار کے درمیان ہوئی اس کا ماحاصل یہ چند سطور ہیں۔

وادی کنر کے خاندانِ سادات کا حال جس کے مورث اعلیٰ سید علی ترمذی ہیں، سید عبدالجبار شاہ صاحب نے اپنے مسودہ میں اس طرح بیان کیا ہے: ''حضرت سیّد علی ترمذی قدس سرّہ غوث بونیر بن امیر نظر بہادر سیّد قمر علی مرزا بن سیّد احمد نور بن سیّد یوسف نور بن سید محمد نور بخش ترمذی بن سیّد احمد ہیثم بن سیّد احمد بداق بن سیّد احمد مشتاق۔ بن سید شاہ ابوتراب۔ بن سید حامد بن سید محمود۔ بن سید اسحاق۔ بن سید عثمان۔ بن سید جعفر۔ بن سید عمر۔ بن سید محمد۔ بن سید حسام الدین۔ بن سید شاہ ناصر خسرو۔ بن سید جلال گنج العلم بخاری قدس سرہ العزیز بن ابوالموید۔ حضرت امیر علی جن کا نسب پانچویں پشت میں حضرت علی نقیب امام ادحم ائمہ اہلِ بیت سے ملتا ہے۔ جو فرزند تھے حضرت امام محمد تقی کے اور وہ فرزند حضرت امام علی رضا کے تھے اور وہ حضرت امام موسیٰ کاظم کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے فرزند تھے اور وہ حضرت امام ابوعبداللہ الحسین شہید دشتِ کربلا علیہ السلام کے فرزند تھے اور آپ حضرت امیر المومنین اسداللہ الغالب علی بن ابی طالب۔

حضرت سید علی ترمذی رحمتہ اللہ علیہ بتاتے ہیں: کہ وہ اصلاً ترمذی ہیں اور وطناً ''کنر'' کے باشندے اور خواہرزادگانِ سلطان ظہیر الدین میں سے ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''ان کے والد بزرگوار مرزا سید قمر علی بہ سبب نسبت نسب داری ہمراہِ سلاطین دنیوی منصب اختیار کر چکے تھے لیکن جدّ بزرگوار امام المسلمین سیّد الدنیا والدین سیّد احمد بن سیّد یوسف اپنے آبا ؤ اجداد کے طریقہ مرضیہ پر نسباً اور سجادہ سلسلہ کبرویہ پر اذناً مستقیم رہ کر دنیوی امور سے بے تعلق رہے اور آبا ؤ اجداد کے طریق زہد و ریاضت کو ترک کیے ہوئے تھے۔ اس لیے جدّ بزرگوار کی نظر انتخاب اس وراثت آبائی کی سپردگی کی نسبت اپنی تمام اولاد میں سے بچپن سے حضرت ترمذی پر مبذول رہتی تھی''۔

ان روایات اور اسناد کے بموجب جو زیرِ نظر مسودہ میں پیش کی گئی ہیں حضرت سیّد علی ترمذی سے سید جمال الدین افغانی تک سلسلۂ نسب اس طرح قائم ہوتا ہے۔

سید علی ترمذی

سید مصطفیٰ

سیّدعبدالوہاب

سیّد جمال الدین عرف سیّد جمال

سیّدظہیرالدین

سیّدزین العابدین

سیّدرضی الدین

سیّدعلی

سیّدصفدر

سیّد جمال الدین افغانی

اس طرح شیخ کے نسب نامہ کی ساتویں پشت میں سیّد جمال الدین کا نام آتا ہے جو وادی کنٹر میں آباد ہوئے اور جن کے خاندان سلاطین کابل اپنی لڑکیوں کا اس خاندان سے رشتہ کرنا اپنے لیے باعثِ شرف وافتخار سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں (جس کی کوئی مستند اور مفصل تاریخ میسر نہیں آتی) کہا جاتا ہے کہ حدودِ چترال سے لے کر ضلع ننگر ہار (افغانستان) تک کنر پر خاندانِ سادات کی خودمختارانہ حکومت قائم تھی اور اس خاندان کے اس دور میں بڑے بڑے علماء وفضلاء گزرے ہیں جن میں سے سید جمال الدین شیخ الاسلام کا نام آج تک مشہور ہے۔ امیر حبیب اللہ خاں ☆ کے زمانہ میں اس خاندان میں شاہی خاندان کی لڑکیاں بیاہی جاتی رہی ہیں۔ چنانچہ شیخ بادشاہ میر صاحب جان سے جو اخوند صاحب ہڑہ کے جانشین بھی تھے، امیر حبیب اللہ خان نے اپنی دولڑکیوں کی شادی کی تھی (4)۔

اس خاندان کے حالات بیان کرتے ہوئے فاضل مؤلف نے اپنے مسودہ میں بعض دلچسپ تفصیلات بیان کی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ: ''سید جمال الدین الفغانی کا نسبی معاملہ اس قدر روشن اور واضح ہے کہ اس کا چھپانا اس کے متعلق کسی مغالطہ میں پڑنا ناممکن ہے۔ ابھی ابھی زمانہ کا واقعہ ہے (۱۹۳۹ء/ ۱۳۵۸ھ) جب کہ ان کی وفات پر صرف (۴۲) سال گزرے ہیں کہ ان کا عظیم المرتبت خاندان اب بھی وادی کنٹر میں اور بونیر وسوات میں ہزار ہا نفوس پر مشتمل موجود ہے جو سلاطین کابل کے تعلقداران اور شریک رشتہ مانند سید محمود شاہ پاشا اور میر صاحب جان شیخ پاشا کے ہوتے ہیں۔ وادی کنڑ میں سادات کی آبادی دو جگہ ہوگئی۔ ایک گاؤں سادات موضع پشت ہے جو سید مصطفیٰ بن سید علی ترمذی کا گاؤں ہے جس کے متصل دوسرا محلہ سادات کا سید آباد نام اب بھی موجود ہے جس کو ایران کا سیّد آباد بنالیا گیا ہے۔ دوسرا مستقر سادات کا کنٹر کے جنوب مغرب میں اسلام پور نام ہے۔ جس میں میر صاحب جان شیخ پاشا کے خاندان کی شاخ مقیم ہے۔ پشت والا خاندان فرمانروائے ملک تھا اور افغانستان کا لشکر ان کا ماتحت تھا۔ امرائے کابل کے زیرِ حکومت یہ لوگ پورے محکوم نہ تھے بلکہ درجہ مساوات کا رنگ تھا۔

☆ امیر حبیب اللہ (۱۹۰۱ء/ ۱۳۱۹ھ تا ۱۹۱۹ء/ ۱۳۳۸ھ) والیِ افغانستان امیر عبدالرحمٰن کے بڑے بیٹے تھے۔ پیدائش سمرقند میں ہوئی (شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، ص ۲۳۲۔

جب ہی تو سید محمود پاشا☆ کے ساتھ امیر دوست محمد خاں نے رشتہ دے کر وحدت پیدا کی تھی۔ سید محمود پاشا کا ویران شدہ قلعہ اب بھی پشت میں موجود ہے جو ویران پڑا ہے جس کو اس ملک کے لوگ عقل تمام قلعہ کہتے ہیں اور اسی پشت کے مرکز کے ایک محلّہ کا نام سید آباد ہے جس میں سید افغانی کی ولادت ہوئی مگر ان کے والد کو سید محمود پاشا کے امرائے کابل کنر سے جلا وطن کر کے کابل لے گئے۔

وطنیت اور نسب کی اس بحث میں فاضل مؤلف نے ایک دلچسپ دلیل یہ بھی پیش کی ہے کہ:

''اسی شجرہ میں سید علی ترمذی سے اوپر ان کے اجداد کی اٹھارھویں پشت میں ایسا ہی عظیم الشان شخصیت کا مالک سید جلال گنج العلم بخاری بن ابوالمؤید امیر علی پایا جاتا ہے جس کی ابویت پر حضرت سید علی ترمذی کو ایسا ہی فخر و افتخار تھا جیسا کہ سید علی ترمذی کی اولاد کو سید علی پر فخر ہے۔ وہ اپنے عہد کا عظیم الشان انسان گزرا ہے جس کا ذکر بے شمار کتب تصوف و تذکرات مشائخ کبار میں ہے بلکہ تاریخ فرشتہ میں بھی سید جلال الدین بخاری کا ذکر نہایت مفصل ہے اور ۱۲۰۳ء/۶۰۰ھ میں ان کے موجود ہونے کا ذکر ہے۔ اس سید جلال الدین گنج العلم کی مملکت افغانستان میں دس بارہ مقامات پر نشست گاہیں موجود ہیں جہاں ہر جگہ قبر بنی ہوئی ہے اور ہر جگہ یہ دعویٰ موجود ہے کہ یہاں وہ مدفون ہیں مگر دراصل وہ نشست گاہیں ہیں۔ زمانہ آپ کا ۱۲۰۳ء/۶۰۰ھ کا تھا۔ آپ کی والدہ سلطان محمود خدابندہ شاہ بخارا کی ہمشیرہ تھی۔ پھر آپ کے ماموں نے اپنی بیٹی بھی آپ سے بیاہ دی جس سے آپ کے دو فرزند توران میں رہ گئے۔ آپ پھر افغانستان و ہندوستان میں سے سید محمد نور بخش ترمذی جد سید علی ترمذی ترمذ میں تھے۔

الغرض بوجہ بعد مملکت دور کے لوگ اس سلسلہ سے تو بے خبر ہیں مگر افغانستان میں کل اہل علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں۔ ایسا ہی مغالطہ مفتی محمد عبدہ کو ترمذی کے نام سے لگا ہے کہ وہ صاحب مصنف جامع ترمذی ہے۔ اس بارہ میں نہ تو سید افغانی کی طرف ایسی فاش بے علمی منسوب کی جاسکتی ہے اور نہ ہی مفتی عبدہ کی طرف کہ وہ علم حدیث کے ان اعظم مصنفین کے نام اور نسب حسب سے بے خبر تھے یا ان کو معلوم نہ تھا کہ مصنف جامع ترمذی جس کا نام محمد بن عیسیٰ اور جس کو ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ بن موسیٰ حافظ لکھا ہوا ہے، ان سید علی ترمذی سے جدا ہیں (5)۔

معلوم ہوتا ہے کہ بے خبری میں کسی نے مرزا لطف اللہ کی مانند یہ غلطی بھی کر دی ہے۔ میں نے ایک جید عالم سے سنا ہے کہ یہ غلطی جرجی زیدان ایک مسیحی عالم سے ہوئی ہے اور قرین قیاس ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو کیونکہ کوئی مسلمان عالم تو ایسی غلطی ایک درسی کتاب کے مصنف کے متعلق نہیں کر سکتا۔ ثابت یہ ہوتا ہے کہ لطف اللہ سات پشت سادات کنڑ کو صحیح شمار کر کے جو ۱۶۸۸ء/۱۱۰۰ھ تک ہے پھر سید علی ترمذی کی روایت سے کود کر ایک دم ۱۲۰۳ء/۶۰۰ھ میں سید جلال گنج العلم تک جا پہنچا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید افغانی کا ساتواں جد سید اصیل الدین سید جمال الدین اوّل کا بیٹا تھا جو سید عبدالوہاب بن سید مصطفیٰ بن سید علی ترمذی کا فرزند تھا۔

مرزا لطف اللہ نے مقالات جمالی میں مذکورہ غلطیوں سے بڑھ کر ایک غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ سید کے خط کا عکس ایک

☆ محمود پاشا کی شادی امیر دوست محمد خاں کی پوتی سے ہوئی تھی اور جمال الدین افغانی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

جگہ دیا ہے جس کی طرزِ تحریر کابلی طرزِ تحریر ہے مگر ایک عربی شعر لکھ کر دستخط کے علاوہ لکھا ہے کہ یہ شعر خود سید کا تصنیف کردہ ہے(6)۔

اس کے بعد موصوف نے اپنے بیان میں بعض دوسرے امکانات کو بھی مسترد نہیں کیا ہے بلکہ اس امکان کو تسلیم کرتے ہوئے کہ "شیخ کے والدین نے کنڑ سے جلاوطنی کے بعد اسدآباد جا کر سکونت اختیار کر لی ہوگی"۔ اس امر پر اصرار کیا ہے کہ "سید صفدر کا اپنے خاندانِ سادات کنڑ سے تعلق منقطع نہیں ہوا تھا اور سلاطین افغانستان بھی ان کو اکابر سادات کنڑ میں سے ہی یقیناً جانتے پہچانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سید کی ولادت ایران میں ہوئی ہو اور بعد بلوغ وہ اپنے ملک میں آ گئے ہوں۔۔۔۔

محترم مؤلف نے اپنے مسودہ میں سید علی ترمذی کے خاندانی حالات کے سلسلے میں ان تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے جو اس خاندان کے زمانہ قدیم میں افغانستان اور ہندوستان سے قائم تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

جدِّ بزرگوار حضرت سید علی ترمذی نے میدانِ پانی پت میں شہنشاہ بابر☆ کی سلطان ابراہیم لودھی ☆☆ پر فتحیابی کے بعد ان ہی دنوں میں ترکِ تعلقات دنیوی کر کے طلبِ راہِ مولیٰ میں مجاہدات اختیار کیے۔ مذکورہ واقعہ فتح ہند ماہ اپریل ۱۵۲۶ء/ ۹۳۲ھ میں ہوا تھا۔ اس حساب سے آپ کی ولادت تخمیناً ۹۰۰ھ مطابق ۱۵۰۰ء کے درمیان یعنی ہر دو صدیوں کے ابتدائی دو چار سالوں میں ہوئی ہوگی۔ آپ کا مولد شہر قندز ملک ترکستان و بدخشاں تھا اور ۱۵۸۳ء/۹۹۲ھ میں آپ نے وفات پائی۔ اس حساب سے حضرت کی عمر کل دسویں صدی ہجری اور سولھویں صدی عیسوی پر حاوی تھی۔ اور ایک صدی سے آٹھ نو سال ہی کم تھی۔ اس طرح ابتدا ان حالات کی جن تاریخوں سے ہوئی وہ بھی معلوم ہیں اور قریب ایام کی تاریخیں خود بخود بوجہ قربِ زمانہ معلوم ہیں(7)۔

ولادت:

افغانستان کے علاقہ "کنڑ" بستی اسعد آباد میں ماہ شعبان ۱۲۵۴ھ بمطابق اکتوبر ۱۸۳۸ء کو جمال الدین افغانی پیدا ہوئے(8)۔

آپ کے والد سید صفدر علی اپنے آبائی قریہ اسعد آباد میں ہی سکونت پذیر تھے۔ ۱۸۴۶ء/۱۲۶۳ھ میں جب جمال الدین افغانی کی عمر آٹھ سال کی ہوئی۔ ان کو امیر دوست محمد خاں (م ۱۲۸۰ھ بمطابق ۱۸۶۳ء) ☆☆☆ کے حکم سے اپنا علاقہ چھوڑ کر کابل میں سکونت اختیار کرنا پڑی اور تقریباً دس سال تک کابل میں رہے اور پھر امیر کی اجازت سے اسعد آباد واپس آئے اور وہیں وفات پائی۔

☆ اصل نام ظہیر الدین بابر تھا۔ ۱۵۰۴ء میں یہ کابل میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس نے سلطنت کو بڑھایا۔ ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو آگرہ میں انتقال کیا۔ اس کی حکومت بنگال سے کابل اور گوالیار سے ہمالیہ تک پھیل گئی (شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، ص ۴۳۲)۔

☆☆ خاندانِ لودھی کا آخری فرمانروا سکندر لودھی کا بیٹا جو باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا (دورِ حکومت ۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء)، ایضاً، ص ۴۷۔

☆☆☆ امیر دوست محمد خان افغانستان کے والی تھے کچھ عرصہ قید فرنگ میں رہے۔ ۱۷۹۴ء تا ۱۸۶۳ء، بارک زئی قبیلہ کے سردار جو ۱۸۲۶ء میں محمود شاہ کی برطرفی کے بعد تخت نشین ہوا۔ ایضاً، ص ۲۷۷۔

علامہ سید جمال الدین افغانی کے ایرانی سوانح نگاروں کا یہ دعویٰ ہے کہ سید جمال الدین افغانی دراصل ایرانی تھے۔ ان کا اور ان کے آباؤ اجداد کا وطن ایران تھا۔ وہ ہمدان کے قریب ایک قصبہ اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ جمال الدین افغانی کی زندگی میں ہی بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ اصلاً ایرانی ہیں۔ انہوں نے اپنے رفقاء کے استفسار پر اس خیال کی تردید کی اور کہا کہ ان کا تعلق کنر کے معروف خاندان سادات سے ہے اور وہ افغانستان میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن سید جمال الدین افغانی کی وفات کے تقریباً ۲۵ یا تیس سال بعد یہ مسئلہ شدت اختیار کر گیا کہ آپ افغانی تھے یا ایرانی۔

ایک ایرانی سوانح نگار مرزا لطف اللہ نے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ سید جمال الدین افغانی کے بھانجے ہیں کا بیان ہے کہ:

''سید جمال الدین کے آباؤ اجداد ۹۸۶/ ۳۷۶ھ سے اسد آباد (ایران) میں مقیم تھے۔ قبروں کے کتبوں اور بعض دیگر تحریروں سے ان کے بزرگوں کی تاریخ بآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ ان کے بزرگ اپنے علوم اور کمالات کے باعث مشہور رہے۔ ان کے والد سید صفدر بن سید علی زیور علم و کمالات صوری و معنوی سے آراستہ اور عابد وزاہد تھے۔ ان کو امور دنیا سے زیادہ لگاؤ نہ تھا اور وہ اپنی زمین کاشت کر کے اپنے چھوٹے سے باغ میں قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ سید جمال الدین کی والدہ کا نام سکینہ بیگم تھا۔ اور وہ میر شرف الدین الحسینی القاضی کی دختر تھیں۔ مہر درخشاں سید جمال الدین اسد آبادی ماہ شعبان ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے تھے (9)۔

ناظم الاسلام کرمانی لکھتے ہیں کہ ''سید جمال الدین نے کونسل ہائے ایرانی کی گرفت سے محفوظ رہنے کیلئے اپنے آپ کو افغانی مشہور کر رکھا تھا۔ وہ ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں قریہ اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ اسد آباد نواح کابل میں نہیں بلکہ اسد آباد متصل ہمدان میں پیدا ہوئے۔ کرمانی نے سیاح محلاتی کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ

چوں سید جمال الدین مقصد بزرگ داشتے در بارہ ایران لہذا خود را بہ افغان نسبت داد تا از صدمہ واذیت ناصر الدین شاہ (حاکم ایران) محفوظ بماند'' (10)۔

مستند سوانح نگاروں کے بیانات

۱۔ مفتی عبدہ (م ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ) ☆ نے لکھا ہے:

سید جمال الدین افغانی، افغانوں کے وطن کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ سادات کا یہ خاندان معزز گھرانہ ہے۔ ایک بڑا قبیلہ ہے اور شہر کابل سے تین دن کی مسافت پر ''کنر'' نام کے ایک علاقہ میں آباد ہے۔ یہ علاقہ ملک کابل میں شمار ہوتا ہے (11)۔

☆ مفتی عبدہ سید جمال الدین کے ممتاز ترین شاگردوں میں سے تھے انہوں نے علامہ افغانی کے فارسی رسالہ ''حقیقت مذہب نیچری ونیچریان'' کا ترجمہ عربی میں کیا تھا (شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۳۶)۔

۲۔ رشید رضا (۱۹۳۵ء/۱۳۵۴ھ) ☆ کے بقول:

''سید جمال الدین افغانی اسعد آباد نام کے ایک قریہ میں جو افغانستان کے علاقہ ''کنر'' میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے پیدا ہوئے تھے'' (12)۔

۳۔ جرجی زیدان (۱۸۶۱/۱۲۷۸ھ تا ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ) ☆☆ کے عہد کا مصری مؤرخ، ادیب اور افسانہ نگار) نے مشاہیر الشرق میں سید جمال الدین افغانی کے حالات تفصیلاً لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ سید جمال الدین افغانی اسعد آباد نام کے ایک قریہ میں جو علاقہ ''کنر'' کے مواضعات میں سے ہے۔ اپنے علم اور سیاست کی بناء پر قدر و منزلت رکھنے والے ایک خاندان میں پیدا ہوئے۔ علاقہ ''کنر'' کابل سے متصل ہے (13)۔

۴۔ شخصیات کے انسائیکلو پیڈیا کے مطابق جمال الدین افغانی علاقہ ''کنر'' افغانستان میں پیدا ہوئے (14)۔

۵۔ ہانس کہان نے لکھا ہے:

سید جمال الدین کی ولادت اصل اور ابتدائی زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں۔ تاہم وہ خود کہا کرتے تھے کہ وہ ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں افغانستان میں پیدا ہوئے (15)۔

مولانا جمال الدین کی جائے پیدائش کے متعلق مؤرخین و محققین کا اختلاف ہے۔ درج بالا آرا کی روشنی میں راقم کے نزدیک سعد آباد (افغانستان) کا مقام زیادہ قریب قیاس ہے۔

تعلیم و تربیت:

سید جمال الدین افغانی جس زمانہ میں پیدا ہوئے وہ افغانستان میں سیاسی انتشار، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کا بدترین دور تھا۔ کابل میں دوست محمد خاں اور قندھار میں کندل خان کی حکومت تھی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد (۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ) وہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ وہ اس ملک کا بہت ہی نازک دور تھا۔ اس نازک دور میں سید جمال الدین افغانی پیدا ہوئے۔ ان کے والد صفدر ایک صاحب ذوق عالم تھے۔ علماء کے ان سے اچھے خاصے روابط تھے اور ہندوستان کے مدارس سے ذاتی واقفیت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ایک خالص علمی سفر بھی کیا تھا۔ چنانچہ سید جمال الدین افغانی نے ابتدائی تعلیم انہیں سے حاصل کی تھی۔

سید صفدر اپنے علاقے میں ایک بااثر شخصیت تھے اور ملکی سیاست میں عملی حصہ لیتے تھے۔ امیر دوست محمد خاں جب کابل واپس آئے اور خانہ جنگی ختم کر کے اپنا اقتدار مستحکم کیا تو ان کو یہ اطلاعات ملیں کہ سید صفدر کو ان کے مخالفین سے ہمدردی ہے۔ سید صفدر کا خاندان علاقہ ''کنر'' میں بااثر تھا اور اپنے شبہ کی بنا پر دوست محمد خاں ان کی طرف سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ دوست محمد نے سید صفدر کو بمعہ اہل و عیال کابل بلا لیا۔ اور ان کی تمام جائیداد ضبط کر کے ان کیلئے گزارہ الاؤنس مقرر کیا۔

☆ سید جمال الدین افغانی کے شاگرد تھے۔

☆☆ جرجی زیدان (۱۸۶۱ تا ۱۹۱۴ء) کے عہد کا مصری مؤرخ، ادیب اور افسانہ نگار)، (شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا، ص ۱۸۱)۔

اس وقت جمال الدین کی عمر آٹھ سال کے قریب تھی اور آئندہ دس سال بھی انہوں نے اپنے خاندان کے ساتھ کابل میں بسر کیے۔ اس طرح اٹھارہ سال کی عمر تک جمال الدین کی تعلیم وتربیت زیادہ تر کابل میں ہوئی(16)۔

سید جمال الدین افغانی نے اس زمانے کے ممتاز علماء سے تحصیل علم کیا۔ عبدالحلیم افغانی نے تحریر کیا کہ "سید جمال الدین افغانی نے اپنی ابتدائی زندگی میں علوم دینی کی تحصیل افغانستان اور پشاور میں کی۔ اور پشاور میں مولد محمد حسن معروف حافظ دراز پشاوری اور مولانا محمد وسیم کا کاخیل سے اکتساب فیض کیا۔

سید جمال الدین افغانی نے صرف اٹھارہ سال کی عمر میں ادب، نحو، بلاغت، تاریخ، فقہ، تفسیر، حدیث، تصوف، منطق، کلام، فلسفہ، ریاضی، طبیعیات، ہیئت اور طب میں پورا عبور حاصل کرلیا۔ یہی اس وقت کے مروجہ علوم تھے اور اتنی کم عمری میں ان کی تحصیل وتکمیل ان کی حیرت انگیز ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ ان علوم کی تکمیل کے بعد انہوں نے سائنس کی تعلیم بھی حاصل کر لی۔ فارسی اور عربی زبان میں تقریر وتحریر پر ان کو کامل عبور حاصل تھا۔ ترکی اور اردو میں وہ مادری زبان کی طرح گفتگو کرتے تھے۔ ان کے علاوہ انہوں نے انگریزی فرانسیسی اور روسی زبانیں بھی سیکھ لیں(17)۔

جرائد کے مقاصد وفوائد:

مصر میں عوام کے لیے سب سے پہلے علامہ جمال الدین افغانی نے محسوس کیا۔ وہ اپنے زمانے کے ایک عظیم ترین صحافی تھے۔ اور صحافت سے تعمیری کام لینے کا ایک واضح نقشہ ان کے ذہن میں موجود تھا۔ اس کا اندازہ ان کے ایک مضمون "فوائد جرائد" جس کو قاضی عبدالغفار نے اپنی تالیف آثار جمال الدین افغانی میں تحریر کیا ہے کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے کیا جاسکتا ہے۔

اخبار وہ بے مثل صناعت ہے کہ اس کا موضوع عوام کے احوال اخلاقی وقومی اور اس کی غایت اصلاح اخلاق امت و جلب سعادت وامن وامان اپنی قوم بلکہ تمام قوموں کیلئے ہے۔ اس کے مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔ ایسا اس لیے ہے کہ جریدہ ارباب فضائل کی فضیلت بیان کرنے میں مسابقت کرتا ہے۔ اوّل تو ان کی بجائے مدح کرنے کے خیال سے جو صاحب فضیلت کا حق ہے اور ثانیاً اس لیے کہ اس مدح کو پڑھ کر دوسروں کو فضائل حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو۔

۲۔ اور رزائل پر نقطہ چینی کرتا ہے کیونکہ ان کے ضرر متعدی میں اس طرح وہ دوسروں کو روکتا ہے۔ ان حرکات کے ارتکاب سے جو رزائل کرتے ہیں۔

۳۔ اخلاق جمیلہ کے منافع کا ایسا بیان شافی کرتا ہے کہ عوام اس سے فائدہ اٹھاسکیں اور خواص بھی بے بہرہ نہ رہیں۔ ہر روز وہ اپنا فرض سرانجام دیتا ہے اور بری خصلتوں اور ان کی مضرتوں کو عام انسانوں سے دل پذیر عبارتوں میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

۴۔ عام لوگوں کے لیے علوم کے فوائد کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر شخص کو یقین ہوجائے کہ امت کی سعادت علوم حقہ اور معارف حقیقی کی وجہ سے ہے۔ بغیر ان کے نہیں۔ اور جہل کے نقصان وخسارہ کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ ہر جاہل وغبی

اعتراف کرلے کہ ہر بلا اور مصیبت ونقصان جو اس کو پہنچا ہے جہل کی وجہ سے پہنچا ہے۔

۵۔ علوم کے درجات کو عالم انسانی میں ان کے فوائد کی نسبت سے قرار دیتا ہے اور ہر ایک کے لوازم کی مقدار کو دلیل سے ثابت کرتا ہے تاکہ نادان اپنی عمروں کو ضائع نہ کریں اور اس فائدہ سے جو حصول علم میں مشغول رہنے سے حاصل کیا جاتا ہے محروم نہ رہیں۔

۶۔ اور منافع کی ضرورت کو جو عالم مدنیت میں علوم کا نتیجہ ہے۔ ثابت کرتا ہے اور دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ بغیر قناعت میں ترقی کیے رفاہیت حاصل نہیں ہوتی۔

۷۔ اور تمام معارف ضروریہ کا مثلاً جغرافیہ، طبیعیات، فلکیات، زراعت، حرفت، طب، تربیت منزلی، تنظیم بلاد، تربیت اولاد اس طرح ذکر کرتا ہے کہ عوام الناس ان سے بہرہ ور ہوں۔

۸۔ فضیلت انسانیت کی تشریح کر کے اغنیا اور ارباب دولت کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور مضامین لکھ کر علوم و معارف وضائع اور قیام دارالشفاء وغیرہ کی ترغیب دیتا ہے۔

۹۔ اور ہم جنسوں کو بڑھانے اور نفوس کو زندہ کرنے کی غرض سے بزرگان سلف واجداد سابقہ کا ان کے اولادوں کے سامنے ذکر کرتا ہے۔ اس طرح کہ وہ بھی ان کی روایات کو اپنا فرض سمجھیں۔

۱۰۔ گزری ہوئی قوموں کے احوال واخبار کو تفصیل کے ساتھ درج کرتا ہے۔ اہل قوم ان کے حال پر نظر کر کے اگر اہل سعادت ہیں تو اجتہاد کریں اور اصلی اسباب کو سمجھ کر اپنی ہمت بڑھائیں اور عزت وحمیت کو متحرک کریں اور اگر اہل شقا ہیں تو عبرت حاصل کر کے اس کے اسباب سے اجتناب کریں۔

۱۱۔ حاکم کو عدل کی دعوت دیتا ہے اور اس کے فوائد بیان کرتا ہے اور رعیت کی وکالت کرتا ہے اور ان کی شکایتیں حکومت تک پہنچاتا ہے اور حکام کے غل کا دف کرتا ہے اور حکام رشوت خوار کا انسداد کرتا ہے۔ حوادث و واقعات کی تحقیقات کر کے ارباب حل وعقد کو اطلاع کرتا ہے تاکہ اس کا علاج کرسکیں۔ اور حکومت ورعیت ایسے حکام کے ضرر سے محفوظ رہے۔

۱۲۔ اور اگر شخص غیر قوم کے متعلق نامناسب بات کہے تو دلیلوں اور براہین سے جو عقل مندوں کے نزدیک جو تلوار سے زیادہ مؤثر ہیں اپنی قوم کا دفاع واجب جانے۔

۱۳۔ اور ہر عاقل کے افکار کو تمام عقلاً تک پہنچائے اور اہل دنیا کو ایک دوسرے کے خیالات سے مطلع کرے۔

۱۴۔ حکایات لطیفہ اور ظرافت واشعار بلیغ اپنے قارئین کیلئے کبھی کبھی شائع کرے۔

۱۵۔ قوم کے اجزاء واعضائے منتشر کو جمع کردے۔ اور حیات تازہ سے ان کو زندہ کرے۔

۱۶۔ اور اپنے قارئین کا سیر وسیاحت دنیا سے گھر بیٹھے دل شاد کرے۔

۱۷۔ بیماروں کو جو بیماریوں میں مبتلا ہوں۔ اطباء اور ماہرین تک پہنچائے اور جاہلوں کی امراء تک رہبری کرے۔

۱۸۔ قوم کے دوست کو دشمن سے تمیز کرائے۔ دھوکا اور فریب کو نہ چلنے دے (18)۔

جرائد کے فوائد اور مقاصد جس کو علامہ افغانی نے محسوس کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اخبار ایسے انسانوں کیلئے جو نیکی و سعادت چاہے۔ ایک جہاں نما دوربین ہے۔ ایک طبیب شفیق ہے۔ ایک متواضع معلم ہے۔ ایک سچا ناصح ہے۔ ادب سکھانے والا ہے۔ آنکھ ہے بیدار اور چوکیدار ہوشیار ہے۔ معالج ہے کامل عوام کیلئے۔ تریاق شافی ہے تمام لوگوں کے واسطے اور تنبیہ کرنے والا ہے غافلوں کو۔ اور روح بخشی ہے دل ہائے مردہ کیلئے اور جگانے والا ہے افکار افسردہ کو۔ تنہائی میں جلیس ہے وحشت میں انیس ہے۔ علماء کا سرمایہ ہے۔ تاجروں کا رہبر ہے۔ زراعت پیشہ لوگوں کی فلاحت کا مددگار۔ صناعوں کا استاد۔ جوانوں کا مکتب۔ ارباب بصیرت کا نور دیدہ۔ خداوندان سیاست کا دستور پسندیدہ۔ مدنیت کا مضبوط قلعہ اور سعادت انسانی کیلئے مستحکم پہاڑ۔

اخباروں کی ترقی و بلندی اور کثرت قوموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ جس قدر علوم و معارف میں قوم ترقی کرے گی اور مدارج مدنیت میں بڑھے گی اسی قدت اخبارات کی تعداد زیادہ ہوگی (19)۔

سیاسی بصیرت:

سید جمال الدین افغانی پہلے شخص ہیں جنہوں نے حالیہ زمانے میں اتحاد اسلامی کے تصور کو زندہ اور تازہ کیا۔ وہ جہاں کہیں تشریف لے گئے اپنے نظریات کے گہرے نقوش چھوڑے۔ اور ان کے اثرات گزشتہ صدی میں سب سے بڑے انقلاب کا سبب ہوئے۔ جمال الدین افغانی یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی پاکیزگی اور اسلام کی عظیم الشان تعلیمات کا احیاء ایک ایسا ذریعہ ہے۔ جس سے مسلمان اقوام اپنی قدیم سیاسی قوت اور برتری پھر حاصل کر سکیں گی۔

سید جمال الدین افغانی ایک زبردست سیاح اور عالم بھی تھے۔ اور باوجود اس کے کہ دولت دنیا میں سے ایک فصیح زبان وقلم۔ وسیع علم، سیاسی فہم وفراست (جس کے انحطاط کو وہ محسوس کرتے تھے) کیلئے سچے عشق کے سوا ان کے پاس کچھ اور نہ تھا۔ تاہم یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اپنی سیاسی بصیرت کے تحت بادشاہوں کے تخت وتاج کو ہلا کر رکھ دیا۔

سید جمال الدین افغانی کا سب سے بڑا خیال اتحاد عالم اسلام تھا۔ اس کو وہ اسلام کی ترقی اور احیاء عظمت کی بنیاد قرار دیتے تھے۔ اور اس میں وہ یورپ کے غلبہ اور تسلط سے اسلام کی نجات مضمر سمجھتے تھے۔ آپ کی شخصیت ہر لحاظ سے ایک زبردست اور جاذب ہستی تھی۔ لوگ آپ کی صحبت سے خوش ہوتے تھے۔ وہ اپنے خیال میں جس کام کو حق سمجھتے تھے اسے کھلم کھلا بیان کرتے تھے اور آئندہ خطرات کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ کسی چیز سے متاثر ہوکر میدان عمل سے نہیں ہٹتے تھے۔

صحافت

علامہ سید جمال الدین افغانی نے ۱۸۷۱ء/ ۱۲۸۸ھ میں مصر آنے کے بعد ایک سیاسی اخبار جاری کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ مگر اجازت نہ ملی۔ آخر ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ میں مصری صحافت میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کے بانی سید جمال الدین افغانی تھے۔ عوام میں سیاسی بیداری کرنے کے لیے سیاسی جرائد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس مہم کو کامیاب بنانے والے سید افغانی کے شامی شاگرد تھے۔ جولائی ۱۸۷۷ء/۱۲۹۴ھ میں ادیب اسحاق نے ہفت روزہ "مصر" جاری کیا۔ اس میں افغانی اور عبدہ (جو کہ علامہ افغانی کے خاص شاگرد تھے) کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس نے افغانی کی تحریک کی حمایت میں بہت اہم حصہ لیا۔ افغانی جامعہ ازہر میں جو لیکچر دیتے وہ بھی اس اخبار میں شائع کیے جاتے تھے۔ چند ہی روز میں یہ مقبول ہوگیا۔ اس کے بعد جون ۱۸۷۸ء/ ۱۲۹۵ھ میں ادیب اسحاق نے ایک روزنامہ "التجارۃ" جاری کیا۔ اس کا اجازت نامہ بھی افغانی نے حاصل کیا۔ اس میں ان کے سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۷۹ء/ ۱۲۹۶ھ میں اسحاق نے اسکندریہ سے ایک جریدہ "مصر الفتاۃ" جاری کیا۔ جو عربی و فارسی دونوں میں شائع ہوتا تھا(20)۔ اسی زمانہ میں علامہ افغانی نے "محروسہ" اور "مراۃ الشرق" دو اور جرائد بھی جاری کروائے۔ ان کے اجازت نامے بھی انہوں نے حاصل کیے۔

یہ تمام جرائد علامہ افغانی کی کوششوں سے جاری ہوئے تھے۔ وہ خود اور ان کے شاگرد ان میں اشاعت کیلئے مضامین لکھتے افغانی کے پیدا کردہ صحافتی انقلاب نے نہ صرف بلند پایہ ادیب، مضمون نگار اور اخبار نویس پیدا کئے بلکہ ان جرائد کی وجہ سے عوام میں حرکت اور بیداری پیدا ہونے لگی۔ اظہار خیالات میں حریت اور آزادی کا رنگ جھلکنے لگا۔ جمود اور بے حسی کے بادل چھٹ گئے(21)۔ اخباروں کی ترقی و بلندی قوموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ جس قدر علوم و معارف میں قوم ترقی کرے گی اور مدارج و مدانیت میں بڑھے گی اسی قدر اخباروں کی تعداد زیادہ ہوگی(22)۔

سید جمال الدین افغانی کے نزدیک رسائل و اخبارات کے ذریعہ امت کے افکار و اخلاق کی اصلاح مکمل طور پر ہوسکتی ہے اور انہی جرائد (رسائل اخبار) کی وجہ سے عوام میں حرکت اور بیداری پیدا ہوتی ہے۔ افغانی لکھتے ہیں:

"ولعل امراء المسلمين قد وعظوا بسوء مغبة اعمال السالفين وهموا بملافاة امرهم، قبل أن يقضى عليهم، بما رزىء به المفرطون من قبلهم، ورجاؤنا ان اول صيحة تبعث إلى الوحدة وتوقظ من الرقدة، تصدر عن اعلاهم مرتبة، واقواهم شوكة، ولا نرتاب في أن العلماء العاملين ستكون لهم اليد الطولى في هذا العمل الشريف، والله يهدى من يشاء ولله الأمر من قبل ومن بعد" (23)

(شاید مسلمان امراء کو اپنے اسلاف کے برے انجام سے نصیحت مل گئی تھی اور انہوں نے اپنے سے پہلے لوگوں کی آزمائشوں کی بنا پر اپنے خاتمے سے پہلے اپنے امور کی تلافی کا ارادہ کرلیا اور ہمیں امید ہے کہ اتحاد پر اکسانے اور نیند سے جگانے کی سب سے پہلی آواز اُن کے سب سے بلند مرتبہ اور طاقتور ترین شخص سے ہی اٹھے گی۔ ہمیں اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کام کرنے والے علماء کو ہی اس معزز کام میں فضیلت حاصل ہوگی۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ پہلے اور بعد میں اسی کا ہی حکم ہے)۔

سید جمال الدین افغانی نے اخبار و رسائل کو بہت اہمیت دی۔ وہ مسلم ممالک کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہیں وہ توقع رکھتے ہیں کہ اگر اس میں صحافی آواز اٹھائیں تو اس کے اثرات تیزی سے پھیلیں گے۔ افغانی لکھتے ہیں:

"هذا عمل من أجل الأعمال وأجزلها فائدة، وإن من أكبر الفضل أن يقوم أهل الفضل من أهالى إيران بتحرير الفصول ونشر الرسائل فى بيان فوائد الاتفاق بين الطائفتين، وإن لذلك لأثر عظيما فى النفوس خصوصاً إن كانت من أقلام العلماء الأعلام، والمجتهدين الكرام"(24)

(یہ عمل تمام اعمال سے بڑھ کر فائدہ مند ہے، سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اہلِ ایران میں سے فضیلت والے لوگ دونوں جماعتوں کے درمیان اتفاق کے فوائد کے بیان میں مضامین لکھیں اور رسالے تحریر کریں، اس بات کا دلوں میں خاص طور پر اثر تب ہوگا جب یہ کام عظیم علماء اور معزز مجتہد حضرات کے قلم سے ہوگا)۔

فصل دوم:

مختلف ممالک کے سفر

(۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ تا ۱۸۹۷ء/۱۳۱۵ھ)

زمانہ قیام کابل میں سید جمال الدین افغانی کو ملکی حالات کا مطالعہ کرنے کا پورا موقع ملا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کی وسعت پذیر سلطنت اور روز افزوں طاقت کا ان کو بخوبی علم تھا۔ افغانستان پر مستقل قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں کی سازش اور اس کے انجام کو بھی وہ دیکھ چکے تھے اور ترکستان پر روسی اقتدار کے مضمرات سے بھی وہ باخبر تھے۔ ان حالات و واقعات نے نوجوان جمال الدین کے دل میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا اور وہ اپنے وطن کی محدود فضا سے نکل کر دوسرے ملکوں اور قوموں کے حالات اور زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ والد محترم سید صفدر (۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ) کی وفات کے بعد وطن سے نکلے (25)۔

ا۔ پہلا سفر ہند:

سید جمال الدین افغانی نے ۱۸۵۶ء/۱۲۷۳ھ میں ہندوستان کا پہلا سفر کیا جو کہ تقریباً پانچ سال پر محیط ہے۔ اور ۱۸۶۰ء/۱۲۷۷ھ تک قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے سیر و سیاحت کی۔ پشاور، دہلی اور کلکتہ میں قیام کیا۔ انہوں نے یہاں پر انگریزی سیکھی اور مختلف شہروں میں رہے۔ پشاور میں بعض علماء سے اکتساب فیض کیا۔ یہاں انہوں نے جدید علوم کی تحصیل پر توجہ دی۔ یہاں کے مدارس نظام تعلیم اور نئے علوم کے مراکز کا مطالعہ کیا" (26)۔

اس وقت ہندوستان پر تقریباً ۸۰۰ سال تک حکومت کرنے والی مسلمان قوم کا اقتدار بالکل ختم ہونے کو تھا اور مغلیہ سلطنت کا آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر صرف نام کا رہ گیا تھا۔ سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہونے کو تھا۔ ان عوامل نے سید جمال الدین کے خیالات کا گہرا اثر ڈالا۔

افغانستان واپسی:

سید جمال الدین افغانی ۱۸۶۱ء/ ۱۲۷۸ھ میں افغانستان تشریف لائے اور امیر دوست محمد خاں کے دربار میں بازیاب ہوئے۔ امیر نے ان کو اپنا مشیر خاص مقرر کیا۔ ۱۸۶۱ء/ ۱۲۷۸ھ سے ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ تک سید جمال الدین افغانی تین امیران کابل (دوست محمد م ۱۸۶۱ء/ ۱۲۷۸ھ، شیر علی م ۱۸۸۷ء/ ۱۳۰۵ھ اور محمد اعظم) کے مشیر خاص اور وزیر اعظم رہے۔

اس دوران ۱۸۶۴ء/ ۱۲۸۱ھ میں جب افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو سید چند روز مصلحتاً افغانستان سے باہر رہنا چاہتے تھے تاکہ شیر علی اور ان کے بھائیوں کی لڑائیوں سے بے تعلق رہیں۔ اس طرح ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ میں سید ہندوستان چلے آئے (27)۔

دوسرا سفرِ ہند:

سید جمال الدین افغانی اس وقت ہندوستان ۱۸۶۴ء/۱۲۸۱ھ میں دوسری مرتبہ تشریف لے گئے جب افغانستان خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا اور چند ماہ ہندوستان رہنے کے بعد واپس تشریف لائے۔

رزاقی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جمال الدین افغانی ہندوستان میں بہت تھوڑا عرصہ کیلئے تشریف لائے۔ انگریز حکومت نے ان کے مرتبہ کا خیال کرتے ہوئے ان کی بہت عزت کی مگر یہ پابندی لگا دی کہ وہ پنجاب سے آگے نہ جائیں۔ ہندوستان میں ان کا قیام صرف چند ماہ رہا اور یہ دن انہوں نے بہت خاموشی سے گزارے"(28)۔

آخری دفعہ وطن میں:

سید جمال الدین افغانی ہندوستان میں بیٹھے ہوئے ان تمام حالات سے باخبر تھے۔ جب ان کو یہ اطلاع مل گئی کہ کابل پر محمد اعظم خاں قابض ہو گئے اور شیر علی بھاگ گئے۔ محمد رفیق☆ کے پھانسی کے تختہ پر اپنی زندگی ختم کر دی تو وہ ہندوستان سے واپس وطن آئے۔ محمد اعظم خاں نے انہیں مشیر خاص اور وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ لیکن ملک خانہ جنگی کا شکار رہا۔ ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں شیر علی ایک دفعہ پھر محمد اعظم کو شکست دے کر فاتحانہ کابل میں داخل ہوا(29)۔

سید جمال الدین افغانی اس وقت کابل میں موجود تھے۔ ان کا یہ نازک دور تھا کیونکہ محمد اعظم خاں کے مشیر خاص تھے۔ امیر شیر علی نے ان کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کی اور نہ ہی سید صاحب سے کوئی تعارض کیا البتہ شاہی دربار سے وہ دور رہنے لگے۔ سید جمال الدین افغانی اب افغانستان میں نہیں رہنا چاہتے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ شیر علی برطانوی سیاست کا مہرہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے اب افغانستان رہنا فضول ہے۔ اب وہ وطن سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک کو اپنا پیغام سنانا چاہتے تھے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ اسلامی ممالک کی عافیت کا انحصار اب باہمی اتحاد میں ہے۔ اس طرح ۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ میں سید ہمیشہ کے لیے اپنے وطن سے رخصت ہوئے۔

انہوں نے شیر علی سے سفرِ حج کی اجازت چاہی۔ شیر علی نے ان کو اس شرط کے ساتھ اجازت دے دی کہ وہ ایران یا وسط ایشیا کی طرف سے ہو کر نہ جائیں غالباً یہ شرط اسی لیے لگائی گئی کہ سید محمد اعظم سے ایران میں اور عبدالرحمٰن خاں☆☆ سے بخارا میں ملاقات نہ کر سکیں(30)۔

مصر کا پہلا سفر:

مصر میں مولانا جمال الدین افغانی نے چالیس روز قیام کیا۔ یہ وقت جامع الازھر کے طلبہ و اساتذہ سے علمی مباحث پر گفتگو میں گزرا۔ اسی مختصر مدت میں آپ نے مصریوں کے دلوں میں اپنی قابلیت وفضیلت کے وہ گہرے نقوش مرقم کر دیئے جن

☆ محمد رفیق امیر شیر علی کا ایک خاص وزیر تھا جو خاندان خلجی سے تعلق رکھتا تھا۔

☆☆ عبدالرحمٰن امیر دوست محمد خاں کا پوتا (۱۸۴۴/۱۲۶۰ھ-۱۹۰۱ء/۱۳۱۹ھ) (شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، ص ۴۵۳)۔

سے آپ کے آئندہ طویل قیام کیلئے راہ ہموار ہوگئی(31)۔

ترکی کا پہلا سفر:

مصر سے جمال الدین افغانی، استنبول (ترکی) پہنچے جہاں دولت عثمانیہ کے ارکان اور خاص طور پر صدر اعظم علی پاشا نے آپ کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ سید نے چند ہی دنوں میں اپنی حیرت انگیز قوت جاذبہ کے ذریعے عثمانی قوم کو اپنی طرف کھینچ لیا وہ انجمن دانش عثمانی کے ممبر بن گئے۔ انہوں نے قسطنطنیہ پہنچ کر بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا اور اپنے خطاب کے ذریعے سے قوم میں ہلچل پیدا کر دی۔ ترکی کی قدامت پسند عوام کو یہ ناگوار گزرا۔ خاص طور پر شیخ الاسلام حسن آفندی☆ کسی طرح بھی انہیں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ایک افغانستان کا نوجوان ترکی میں وارد ہو اور داعیان حکومت کی طرف سے اس کی تعظیم و توقیر کی جائے۔ اسی دوران ایک واقعہ☆☆ نے شیخ الاسلام کی دلی کدورت کو مخالفت کا شعلہ بنا دیا(32)۔

الغرض سلطان ترکی نے انہیں قسطنطنیہ چھوڑنے کا حکم دے دیا۔

ترکی میں وزارت کی رکنیت:

مصر سے حجاز کے لیے روانہ ہوئے لیکن آپ کا خیال بدل گیا اور سفر حجاز کا ارادہ ترک کر کے آپ جب آستانہ (قسطنطنیہ) پہنچے تو وہاں پہنچ کر آپ کی محمد امین عالی پاشا(۱۸۷۲ء/۱۲۷۹ھ) صدر اعظم (۱۸۶۷ء/۱۲۸۴ھ۔ ۱۸۷۲ء/۱۲۷۹ھ) سے ملاقات ہوئی جس نے آپ کی بیحد تعظیم و تکریم کی۔ رفتہ رفتہ طبقہ وزراء اور امراء کے دیگر ارکان بھی آپ کے تقدم علمی کے قائل ہو کر آپ کے گرویدہ ہو گئے اور ابھی چھ مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ آپ کو وزارت تعلیم کا رکن نامزد کیا گیا۔ آپ نے اپنی صائب رائے سے کئی ایک اصلاحی تجویزیں پیش کیں۔ تعلم و تعلیم کے مسئلہ پر خاص طور پر زور دیا۔ لیکن ان کے رفقاء کار نے (اپنی سنہری روپہلی مصلحتوں کی بنا پر) ان سے اختلاف کیا۔ اور آپ کی مؤخر الذکر تجاویز کو وزارت معارف نے رد کر دیا۔ انہی تجاویز میں بعض ایسی بھی تھیں۔ جن کا شیخ الاسلام پر اثر پڑتا تھا۔ چنانچہ اس نے بات دل میں رکھ لی اور موقعہ کے انتظار میں رہا اور آپ کو رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۱ء) میں ترکی سے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا(33)۔

مصر کا دوسرا سفر:

قسطنطنیہ سے ۱۸۷۱ء/ ۱۲۷۸ھ میں سید صاحب دوبارہ مصر آئے اور آٹھ سال قیام فرمایا اور اس دوران انہیں بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت ملی۔ یہاں سے انگلستان اور یورپ کے خلاف ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے کبھی مکان پر طلباء کو حدیث و فقہ کا درس دیا اور کبھی جامعہ ازہر میں۔۔۔۔۔۔ مصر کے حالات اس وقت انتہائی خراب

☆ حسن آفندی: اس وقت عالم اسلام کے لیے خلیفہ کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات قانون کا درجہ رکھتی تھی۔

☆☆ واقعہ یہ ہوا کہ سید جمال الدین افغانی جب شیخ سے ملاقات کرنے ایوانِ شیخ پہنچے تو انہوں نے مروجہ غیر اسلامی طریقہ آداب نہیں ادا کیے۔ اس وقت شیخ نے ناگواری کا اظہار نہ کیا۔ مگر موقع کی تلاش میں لگا رہا۔ اور بالآخر عثمانیہ یونیورسٹی میں دیئے گئے لیکچر کے چند جملوں پر شیخ نے سید صاحب پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔

تھے۔انہوں نے قوم پرستوں کی ایک سیاسی انجمن "الحزب الوطنی" کے نام سے قائم کر لی۔جس کے ممبران کی تعداد تین سو سے تجاوز کر گئی۔اس انجمن نے پورے ملک میں برطانوی دخل کے خلاف تحریک شروع کر دی (34)۔

ہندوستان کا تیسرا سفر:

۱۸۸۰ء/۱۲۹۸ھ میں جمال الدین افغانی مصر سے دوسری بار سرزمین ہندوستان کے ساحلی شہر بمبئی میں داخل ہوئے۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات بہت ابتر تھے۔آپ نے اس مرتبہ تقریباً دو سال قیام فرمایا۔"رد نیچریت" کے مقدمہ اور ان کے بعض ان مضامین میں سے جو حیدر آباد کے رسالہ "معلم" میں شائع ہوئے تھے۔صرف ان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس مرتبہ انہوں نے ملک کے سیاسی معاملات میں کوئی خاص دلچسپی نہیں کی تھی۔

ہندوستان کے قیام کے دوران ۱۸۸۲ء/۱۳۰۰ھ میں جب اعرابی پاشا (۱۹۱۱ء/۱۳۲۹ھ) نے آئینی حقوق کا مطالبہ لے کر میدان عمل میں نمودار ہوا تو ہندوستان میں برطانوی حکومت نے سید افغانی صاحب پر کڑی نظر رکھی اور آپ کو نظر بند کر کے کلکتہ بھیج دیا۔جب اعرابی پاشا کی شورش فرو ہوگئی تو برطانیہ نے سید صاحب کو ہندوستان میں آزاد کر دیا (35)۔

یورپ کا پہلا سفر:

۱۸۸۳ء/۱۳۰۱ھ کے آخر میں سید جمال الدین افغانی پیرس پہنچے۔پیرس وہ جگہ تھی جسے مشرقی ممالک کی شہنشاہیت کے ستم رسیدہ مفرور پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔جب سید صاحب پیرس پہنچ گئے تو ان کے دست راست اور شاگرد شیخ محمد عبدہ بھی باوجود کڑی نگرانی کے وہاں پہنچ گئے۔سید صاحب کا شروع سے یہ خیال تھا کہ مشرق کی سوتی ہوئی عوام کو بیدار کرنے کے لیے اخبارات کی بہت سخت ضرورت ہے۔اس لیے یہاں پر ایک اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا (36)۔

العروۃ الوثقیٰ:

سید جمال الدین افغانی نے پیرس میں العروۃ الوثقیٰ کے نام سے انجمن قائم کی اور اس کے ترجمان کے طور پر ایک اخبار اسی نام سے جاری کیا۔رومارٹن (علاقہ کا نام) کے چھوٹے سے کمرے میں سید صاحب رہتے تھے۔وہی اس کا دفتر قرار پایا۔ اخبار کی پیشانی پر ایک طرف "مدیر السیاسہ" کی حیثیت سے سید جمال الدین افغانی کا نام ہوتا تھا اور دوسری طرف "مدیر التحریر" کی حیثیت سے شیخ محمد عبدہ کا۔العروۃ الوثقیٰ کا پہلا شمارہ ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء/۱۳۰۲ھ کو شائع ہوا اور اکتوبر ۱۸۸۴ء/۱۳۰۲ھ کو اس کا آخری شمارہ۔چونکہ اخبار کے تمام مصارف کا بار سید صاحب کی جیب خاص پر تھا۔اس لیے ۱۸ پرچوں کے بعد پھر وہ اس کے متحمل نہ ہو سکے (37)۔

جمعیۃ العروۃ الوثقیٰ:

افغانی کے کئی پر جوش رفقا جب پیرس پہنچ گئے تو انہوں نے ایک جماعت قائم کی جس کا نام "جمعیۃ العروۃ الوثقیٰ" رکھا گیا۔خیال ہے کہ علامہ افغانی نے لفظ "العروۃ الوثقیٰ" ایک اصطلاح کے طور پر اختیار کیا،جس کا مفہوم تھا بین الاسلامی اتحاد۔ترکی

،شام، مصر، تونس، الجزائر، مراکش، ایران، ہندوستان اور بعض دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے باشندے اس انجمن کے رکن بنے۔ اس کو سب سے زیادہ مالی امداد حیدرآباد، مصر اور تیونس سے ملتی تھی۔ اس انجمن نے اسلامی اتحاد مغربی دول کے محکوم مشرقی ممالک کی آزادی اور سامراج کے خاتمے کے لیے افغانی تحریک کو مقبول عام بنانے اور وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت کرنے کے لیے ''العروۃ الوثقیٰ'' کے نام سے ایک ہفتہ وار جریدہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا(38)۔

روس کا سفر:

برطانوی مدبرین کی پالیسیوں نے علامہ افغانی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ برطانیہ اور اسلامی ممالک میں اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اور انگریز سامراج سے نجات حاصل کرنے کے لیے روس سے تعاون اور اتحاد قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ رزاقی اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''سید جمال الدین افغانی نے روس جانے اور انگریزوں کے خلاف روس سے حمایت حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ چاہتے تھے کہ روس افغانستان اور ترکی انگریزوں کے خلاف متحد ہو جائیں۔ اس غرض سے انہوں نے روس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ تاکہ روسی حکومت کا عندیہ معلوم کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء/۱۳۰۳ھ کے اواخر میں وہ روس پہنچ گئے(39)۔

علامہ افغانی کے اس سفر روس کا حال ابھی تک پردہ اخفاء میں ہے لیکن پھر بھی رزاقی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''روسی مدبرین سے گفتگو و شنید کے بعد وہ کابل گئے تاکہ امیر عبدالرحمٰن کو روس سے اتحاد کرنے پر رضامند کریں اور اس مقصد میں کامیابی کے بعد حکومت روس کو افغانستان سے اتحاد و تعاون کا معاہدہ کرنے پر آمادہ کریں۔ لیکن علامہ افغانی کی یہ کوششیں امیر عبدالرحمٰن کا تعاون حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے ناکام ہوئیں(40)۔

امیر عبدالرحمٰن کی پالیسی یہ تھی کہ برطانیہ اور روس دونوں سے تعلقات اچھے رکھے جائیں اور ان دونوں طاقتوں میں جو رقابت ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اسلامی ممالک میں اتحاد قائم کر کے روس کو ان کا حلیف بنانے، انگریزوں کی گرفت سے مصر کو آزاد کرانے اور ترکی و ایران کو انگریزی اثرات سے محفوظ رکھنے کا جو منصوبہ علامہ افغانی کے ذہن میں تھا اس سے امیر عبدالرحمٰن کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے پیش نظر صرف اپنا مفاد تھا۔ اور وہ روس اور برطانیہ دونوں میں سے کسی سے بھی تعلقات خراب کرنے پر تیار نہ تھے۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس کی وجہ سے افغانی کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اور ان کا یہ سفر روس سیاسی اعتبار سے بے نتیجہ رہا۔

شاہد حسین رزاقی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

روس میں علامہ افغانی کا قیام چند ماہ رہا اور ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ کے وسط میں وہ پیرس آ گئے۔ روس اور افغانستان کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں اور اب انہوں نے اپنی توجہ ایران کے حالات پر مرتکز کر دی(41)۔

ایران کا پہلا سفر:

سید جمال الدین افغانی پیرس میں مختصر قیام کے بعد بوشہرہ (ایران) روانہ ہو گئے۔ مئی ۱۸۸۶ء/۱۳۰۴ھ میں حاجی خان وزیر مسقط کے ہاں بوشہرہ میں قیام کیا(42)۔

ناصرالدین شاہ (امیر ایران) نے علامہ افغانی کو ایک ایلچی کے ذریعے دعوت نامہ بھجوایا اور انہیں تہران آنے کی دعوت دی۔ سید جمال الدین افغانی اگست کے آخر میں تہران کے لیے روانہ ہوئے۔ شیراز سے ہوتے ہوئے اصفہان گئے۔ سال کے آخر تک وہ تہران پہنچے۔ تہران پہنچنے پر ان کا حکومت کی جانب سے شاندار استقبال کیا گیا۔ شاہ نے سید صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ نظام حکومت کی اصلاح کر کے اپنی نئی تجاویز پیش کریں۔ لیکن جب سید صاحب نے کچھ اصلاحات تجویز کیں تو شاہ اور وزرائے مملکت ناخوش ہوئے۔ علامہ افغانی مطلق العنانی اور شخصی حکومت کے انتہائی مخالف اور دستوری نظام کے حامی تھے۔ لیکن شاہ کوئی ایسی تجویز قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ علامہ افغانی کی تجاویز نہ صرف نظر انداز کی گئیں بلکہ انہیں انقلابی اور باغیانہ تصور کر کے علامہ افغانی کی موجودگی کو شاہی اقتدار اور حکمران طبقہ کے مفاد کے لیے خطرناک تصور کیا جانے لگا۔ علامہ افغانی کی شہرت و شخصیت نے ان کو توجہات کا مرکز بنا دیا۔ اور لوگ ان کے خیالات سے متاثر ہونے لگے(43)۔

درباریوں نے علامہ افغانی سے متعلق یہ اطلاعات بادشاہ تک پہنچائیں اور کہا کہ یہ شخص اپنے اثرات سے کام لیکر اپنی پسند کے شخص کو تخت و تاج کا وارث بنانا چاہتا ہے۔ یہ بادشاہت کا مخالف اور انقلاب پسند ہے۔ اس نے مصر میں بھی تحریک چلائی۔ اب ایران میں بھی یہی کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انگریز بھی شاہ پر دباؤ ڈال رہے تھے اور برطانیہ ایران کے تعلقات خراب ہونے کا خدشہ ظاہر کر رہے تھے۔ شاہ ان تمام باتوں سے متاثر ہوا۔ اور ایران میں افغانی کے قیام کو خطرناک تصور کرنے لگا۔

اب شاہ یہ چاہتا تھا کہ علامہ ایران سے چلے جائیں۔ انہوں نے علامہ افغانی کو پیغام بھجوایا۔ شاہ کی اس خواہش پر وہ ۱۸۸۷ء/۱۳۰۵ھ اپریل میں ایران سے ماسکو چلے گئے(44)۔

روس کا دوسرا سفر:

ضیاء برنی اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

سید جمال الدین افغانی ایران سے پیٹرزبرگ روانہ ہوئے۔ ماسکو میں اخبار ماسکوی کے ایڈیٹر کاتکوف سے ملاقات ہوئی اور وہاں انہوں نے انگریزوں کے خلاف روس اور دول اسلامی کے مابین اتحاد کی تجویز پیش کی لیکن افسوس یہ ہوا کہ چند ہی دن بعد (۱۱ ذیقعدہ ۱۳۰۴ھ بمطابق ۱۸۸۷ء) کاتکوف کا انتقال ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد پیٹرزبرگ روانہ ہو گئے(45)۔

ایک اور روایت کے مطابق جو ضیاء برنی تک صرف ایک ہی واسطہ سے پہنچی ہے۔ یہ ہے کہ سید صاحب کاتکوف کے تار دے کر بلانے پر روس گئے تھے(46)۔

مئی ۱۸۸۷ء/۱۳۰۵ھ میں علامہ افغانی ماسکو تشریف لائے۔ یہ ان کا روس کا دوسرا سفر تھا۔ اور چند ماہ قیام کے بعد علامہ افغانی ماسکو سے پیٹرز برگ چلے گئے (۱۱ فروری ۱۹۸۸ء/۱۳۰۶ھ) وہاں انہوں نے اعلیٰ عہدہ داروں سے ملاقات کی اور روسی مسلمانوں کیلئے بہت کام کیا۔ مبارز الدین رفعت اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

سید جمال الدین افغانی ماسکو چلے گئے اس کے بعد وہ پیٹرز برگ چلے گئے۔ جہاں روسی گورنمنٹ نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ پیٹرز برگ میں انہوں نے مسلمانانِ روس کے ساتھ وہ احسان کیا جنہیں ان کی آئندہ نسلیں بلکہ مسلمانانِ عالم کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ روس میں مسلمانوں پر حکومت کی طرف سے جو جبر و تشدد ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ انہیں کلام مجید اور دوسری کتب مذہبی کے چھاپنے کی اجازت تک نہ تھی۔ سید جمال الدین نے زار کو اس ظالمانہ حکم کی تنسیخ پر آمادہ کیا اور ان کی کوششوں سے مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہوگئی (47)۔

سید جمال الدین افغانی ابھی پایہ تخت روس میں ہی مقیم تھے کہ ناصر الدین شاہ فرمانروائے ایران بہ تقریب سیاحت یہاں وارد ہوئے اور سید صاحب سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سید صاحب نے ازراہِ غایت استغنا کجلا شاہ کے پیغام کو نظر انداز کر دیا۔

جرمنی کا سفر:

۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ میں شیخ صاحب روس سے جرمنی تشریف لائے اور چند روز میونخ میں مقیم رہے۔ اس وقت ایک موقع پر شیخ کی ملاقات شاہ ایران سے ہوگئی۔ دونوں کی ملاقات اور وہ نتیجہ جو مرتب ہونے والا تھا۔ مقدر ہو چکا تھا۔ کچھ دن بعد میونخ میں سید صاحب شاہ صاحب سے ملے اور شاہ نے یہ کہہ کر کہ میں آپ کو صدر اعظم مقرر کر دوں گا۔ ان سے بہ اصرار تمام ایران چلنے کو کہا۔ اوّل تو سید صاحب نے انکار کیا لیکن پھر بعض مصلحتوں سے رضامند ہو گئے (48)۔

اس صورت حال سے ایران کے وزیر اعظم امین السلطنت بہت ہی پریشان ہو گیا۔ اور اس نے ایک سیاسی چال چلی اور علامہ افغانی سے درخواست کی کہ وہ روس واپس جائیں اور روسی حکومت سے ایران کی حکومت کے تعلقات درست کرآئیں۔ ناصر الدین شاہ نے اس تجویز کو پسند کیا۔ ناصر الدین شاہ کے اصرار پر علامہ افغانی جرمنی سے روس چلے گئے۔

روس کا تیسرا سفر (۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ):

یہ علامہ افغانی کا روس کا تیسرا سفر تھا۔ اس بار انہوں نے وزیر اعظم کی تجویز کے مطابق ایرانی حکومت کے بارے میں روس کی بدگمانی دور کر کے دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ روس میں انہوں نے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔

رزاقی کے بیان کے مطابق علامہ افغانی نے جنرل ایروجیف، جنرل وتجرتن (وزیر دربار) جنرل اختیاحیف اور مادام نور بکوف سے ملاقات کی۔ اس کے بعد انہوں نے وزیر اعظم گیرس اور وزیر خارجہ زینوف سے کئی ملاقاتیں کیں اور سیاسی دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سلطنت روس کیلئے مشرق میں بہترین اصول کار یہ ہے کہ ایران سے ہمیشہ صلح اور اتحاد رکھے۔

جب ایران سے ہمیشہ صلح اور اتحاد رکھنے کا اصول تسلیم کرلیا گیا۔ تو علامہ جمال الدین افغانی نے ایرانی وزیر اعظم سے رائے بدلنے کیلئے کہا تو روسی حکومت نے رضامندی ظاہر کردی (49)۔

ایران کا دوسرا سفر:

اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر سید افغانی روس سے ۱۸۸۹ء/ ۱۳۰۷ھ میں تہران واپس آگئے۔ اور شہر سے باہر قیام کیا۔ اطلاع وزیر اعظم کو بھجوائی۔

وزیر اعظم ایران نے بے اعتنائی دکھائی اور اس نے روس کے سفر کے متعلق کچھ دریافت نہ کیا۔ جب کافی وقت گزر گیا تو حکومت روس نے علامہ سے دریافت کیا کہ آپ نے جن امور کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ ان کا فیصلہ کیا ہوا۔ تو علامہ نے جواب دیا کہ ابھی تک گفتگو نہیں ہوئی۔ روس حکومت کو غلط فہمی ہوئی۔ روسی وزیر خارجہ نے اپنے سفیر متعین تہران کو تار بھجوایا کہ سید جمال الدین افغانی نے ایرانی وزیر اعظم کی طرف سے جن امور پر گفتگو کی تھی۔ اگر وہ ان امور پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو گفت وشنید کریں۔ اس کے جواب میں وزیر اعظم ایران نے کہا:

''میں نے نہ تو جمال الدین افغانی کو پیٹرز برگ بھیجا تھا اور نہ روسی حکومت سے کہنے کیلئے ان سے کوئی بات کہی تھی'' (50)۔

علامہ جب تہران آئے تو انہوں نے دیکھا کہ حالات بدلے ہوئے ہیں۔ وزارت عظمیٰ تو کجا رنگ ہی بدلا ہوا پایا۔ وزیر اعظم سے ملاقات کی نوبت ہی نہیں آئی۔ طویل انتظار کے بعد انہوں نے شاہ کو خط لکھا کہ میں نے وعدہ پورا کردیا۔ شاہ نے جواب میں افغانی صاحب کا صرف شکریہ ادا کیا۔

لیکن جو وعدہ کیا تھا اس کے انتظار میں کئی ماہ گزر گئے۔ کیونکہ بادشاہ کے درباریوں نے شاہ کو یہ یقین دلایا کہ افغانی ان کی حکومت کے لیے اور اقتدار کے لیے خطرہ ہے۔ جب یہ بات شاہ کے ذہن میں ڈال دی گئی تو ناصر الدین شاہ نے علامہ افغانی سے قُم چلے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن علامہ افغانی قُم جانے کی بجائے تہران کے قریب درگاہ شاہ عبدالعظیم ☆ میں مقیم ہو گئے۔ جہاں ایران کی مذہبی روایات کے مطابق کوئی شخص گرفتار نہیں کیا جاتا۔ اس جگہ آپ نے تقریباً سات ماہ قیام کیا اور وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رکھا۔ علامہ افغانی نے اپنے خیالات سے ایران کے علماء، مجتہدین اور نوجوانوں کو حیرت انگیز طور پر متاثر کیا اور سارے ملک میں ملی بیداری پیدا کردی۔ بدلتے ہوئے حالات نے شاہ اور حکومت کو خوفزدہ کردیا۔ ایران میں علامہ افغانی کے قیام کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگے۔ مولانا ظفر علی خاں لکھتے ہیں کہ:

''درگاہ شاہ عبدالعظیم میں سید جمال الدین افغانی اس خیال سے بست نشین ہوئے تھے کہ اس کی مقدس چار دیواری میں کسی کو ان سے معترض ہونے کا حوصلہ نہ ہوگا۔ لیکن ناصر الدین شاہ کو اس درگاہ کی امن آفرین چار دیواری بھی اپنے فیصلہ کی تعمیل سے نہ روک سکی۔ اس نے پانچ سو سواروں کا دستہ اس حکم کے ساتھ بھیجا کہ سید جمال الدین افغانی جس حال میں ہوں گرفتار کر کے

☆ درگاہ شاہ عبدالعظیم: یہ خانقاہ طہران سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے قریب قدیم شہر ''رے'' کے آثار موجود ہیں۔

ملک بدر کر دیئے جائیں۔ سید صاحب اس وقت بیماری کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ شاہی کارندوں نے اس کا بھی لحاظ نہ کیا اور انہیں بستر سے گھسیٹتے ہوئے درگاہ سے باہر لے آئے اور ترکی سرحد پر لے جا کر چھوڑ دیا (51)۔

سید جمال الدین افغانی کو درگاہ شاہ عبدالعزیز سے گرفتار کر کے ترکی کی سرحد کے پار والئی بغداد کے پاس بھیجا گیا۔ سید صاحب ۱۸۹۱ء/ ۱۳۰۹ھ میں بغداد پہنچ گئے (52)۔

بغداد و بصرہ میں قیام:

ایران سے اخراج کے بعد جب علامہ افغانی بصرہ میں قیام پذیر تھے تو سلطان عبدالحمید کا دعوت نامہ ملا کہ وہ مرکز خلافت استنبول آ کر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کریں۔ لیکن علامہ افغانی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایران میں انقلابی جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچا کر رہیں گے۔ اس لیے وہ سلطان کی دعوت قبول نہ کر سکے اور لندن روانہ ہو گئے۔ سلطان عبدالحمید (ترکی کا سلطان) نے سید جمال الدین کو استنبول بلانے کا خیال ترک نہیں کیا اور مختلف ذرائع سے ان کو استنبول بلانے کی کوشش کرتے رہے۔ سلطان اسلامی ممالک میں علامہ افغانی کے زبردست اثرات اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اور ان کی تائید حاصل کر کے اسلامی دنیا میں خلافت کے وقار اور اقتدار کو بڑھانے کے خواہش مند تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عرب ممالک میں خلیفہ اور ان کی حکومت سے شکایات میں اضافہ ہو رہا ہے اور سیاسی بے چینی کی بدولت علیحدگی کا رجحان پیدا ہونے لگا ہے۔ جو سلطنت کی بقا و استحکام کے لیے انتہائی نقصان دہ چیز ہے۔ اور علامہ افغانی ہی ایک ایسی شخصیت ہے۔ جو سلطنت کے لیے تباہ کن رجحانات کو ختم کر کے عربوں اور ترکوں کے درمیان اتحاد و اخوت کے رشتے کو مستحکم بنا سکتے ہیں (53)۔

یورپ کا دوسرا سفر:

بغداد سے انہوں نے لندن جانے کا فیصلہ کیا چنانچہ آپ بغداد سے بصرہ آئے وہاں قیام کے دوران انہوں نے مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کے نام جو سامرہ میں مقیم تھے وہ مشہور و معروف خط لکھا یہ خط خاص شہرت رکھتا ہے۔ جس کا متن باب ششم میں پیش کیا گیا ہے۔ سید صاحب کچھ عرصہ بصرہ میں قیام کرنے کے بعد اپنی صحت درست کرنے کی غرض سے ۱۸۹۱ء/ ۱۳۰۹ھ کے اوائل میں لندن پہنچے (54)۔

سلطان کا دعوت نامہ:

جب سید جمال الدین افغانی لندن میں ایران کے متعلق جدوجہد کر رہے تھے تو سلطان عبدالحمید نے لندن میں سید صاحب کو ترک سفیر کے ذریعہ دعوت نامہ بھجوایا۔ چنانچہ رزاقی اپنی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

لندن میں متعین ترکی سفیر رستم پاشا نے علامہ افغانی کو سلطان کی طرف سے استنبول آنے کی دعوت دی۔ پھر عملی شکل دی۔ چنانچہ سلطان کے پیر ابوالہدیٰ نے سلطان کے ایماء پر ان کو دو خط لکھے جن میں استنبول آنے کے لیے بہت اصرار کیا گیا۔ ایک خط جو ۱۶ رجب ۱۸۹۲ء/ ۱۳۱۰ھ کو لکھا گیا۔ ابوالہدیٰ نے علامہ افغانی کو یہ ترغیب دی کہ وہ غیر مسلموں کے ملک میں قیام

کرنے کی بجائے مرکز خلافت میں سکونت اختیار کریں اور سلطان کی طرف سے دعوت دیتے ہوئے لکھا کہ سلطان کی یہ خواہش ہے کہ افغانی جیسے مخلص اور ممتاز خادم اسلام دشمن کی جارحیت کو ناکام بنانے میں ان کی مدد کریں۔ دوسرے خط میں ابوالہدیٰ نے بہت اصرار کیا کہ علامہ افغانی سلطان کی دعوت قبول کر کے استنبول آ جائیں اور دشمنانِ اسلام کے منصوبوں کو ناکام بنا دیں'' (55)۔

آخرکار علامہ افغانی نے سلطان کی دعوت قبول کر لی اور لندن سے روانہ ہو کر ۱۸۹۲ء/۱۳۱۰ھ کے وسط میں استنبول پہنچے۔ جہاں ان کی زندگی کے آخری پانچ سال گزرے۔ چونکہ سلطان بنفس نفیس اتحاد اسلام کے لیے کوشاں تھے۔ اس لیے انہوں نے سید کی انتظامی قابلیت اور اسلامی ممالک میں ان کے اثر سے فائدہ اٹھانے کی امید میں انہیں اپنے محل کے قریب ٹھہرایا اور نشان تاش میں ایک مکان رہنے کے لیے دیا۔ اور پچھتر لیرہ☆ عثمانی (تقریباً ایک ہزار روپے) ان کے لیے ماہوار مقرر کر دیئے۔ اس مہم کی ابتداء میں سلطان عبدالحمید خاں سے ان کے مراسم بہت بڑھ گئے۔ اور سلطان بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب استنبول میں بلنٹ ☆☆ کی ۱۳۱۰ھ بمطابق ۱۸۹۳ء کے آخر میں ان سے ملاقات ہوئی تو سلطان مہمان خانہ (جسے ترکی میں مسافر خانہ کہتے ہیں) میں فروکش تھے اور سلطان کی خدمت میں انہیں تقرب حاصل تھا (56)۔

اسی صفحہ پر ضیاء برنی نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ سید صاحب کے ایک دوست کی روایت کے مطابق جس نے ان سے ۱۸۹۳ء/۱۳۱۰ھ بمقام لندن ملاقات کی تھی۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۰ء/۱۳۱۰ھ کے وسط تک وہ لندن ہی میں مقیم تھے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح محقق ہے کہ سال مذکورہ ماہ شوال میں نیز اس سے کچھ عرصہ قبل وہ استنبول میں موجود تھے۔ بلنٹ نے بھی اسی سال ان سے ملاقات کی تھی اور وہی اس بات کے ناقل ہیں کہ سید عیدالفطر یا عیدالضحیٰ کے موقع پر سلطان کے حضور میں حاضر ہوئے اور مرزا کرمانی کے مطابق انہیں ماہانہ ۲۰۰ لیرہ (۲۷۰۰ روپے) دیا جاتا تھا (57)۔

وفات وتدفین:

ناصر الدین شاہ ☆☆☆ کے قتل نے سلطان عبدالحمید کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کو یہ خوف لاحق تھا کہ افغانی کے

☆ لیرہ: ترکی کی کرنسی کا نام ہے۔

☆☆ بلنٹ: ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸ برس کی عمر میں برطانوی سفارتی سروس میں داخل ہوئے اور ۱۲ برس تک پوری قابلیت سے خدمات انجام دیں۔

☆☆☆ ناصر الدین شاہ کی ۶ مئی ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ کو سالگرہ تھی وہ اس تقریب میں شاہ عبدالعزیز کی درگاہ میں حاضر ہوا۔ یہ بات ذہن میں رکھی چاہیے کہ اسی جگہ سید جمال الدین افغانی سات ماہ تک مقیم رہے اور جب سخت بیمار ہوئے تو شاہ ایران کے حکم سے گرفتار کر کے بصرہ پہنچائے گئے۔ جب شہنشاہ ایران ناصر الدین درگاہ میں داخل ہو رہا تھا تو گولی چلنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ کے اندر اندر بادشاہ خاک وخون میں تڑپ رہا تھا۔ اس طرح یہ ظالم بادشاہ اپنے انجام کو پہنچا۔ بادشاہ کے قاتل کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ شخص مرزا رضا خاں کرمانی تھا۔ اس کو ۱۲ اگست ۱۸۹۶ء/۱۳۱۴ھ میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

جاں نثار معتقد اگر ناصر الدین کے استبداد کو ختم کرنے کے لیے اس کو قتل کر سکتے ہیں تو پھر اس کی زندگی بھی محفوظ نہیں ہے اور علامہ افغانی کے دشمنوں نے جب سلطان کو یہ یقین دلانا شروع کر دیا کہ اس کو معزول کر کے نیا خلیفہ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے اور افغانی بھی اس تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ تو شکی اور وہمی سلطان اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ علامہ افغانی پر پابندیاں سخت کر دی گئیں۔ پولیس اور جاسوس شدت سے نگرانی کرنے لگے۔

اس نظر بندی کی حالت میں افغانی بہت علیل ہو گئے ان کو سرطان کا مرض لاحق ہو گیا۔ ان کے معالج ڈاکٹر جمیل پاشا نے ان کے چھ دانت نکال دیئے۔ لیکن مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ علامہ افغانی نے علاج کیلئے ویانا جانے کی اجازت چاہی مگر سلطان نے انکار کر دیا۔ آخر کار مرض لاعلاج ہو گیا۔ اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء/۱۳۱۴ھ کو علامہ افغانی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون(58)۔

علامہ افغانی استنبول کے محلہ ماچتا کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ علامہ افغانی کا جسم خاکی چالیس سال سے زیادہ مدت تک استنبول میں دفن رہا۔ پھر حکومت افغانستان نے حکومت ترکی سے اجازت حاصل کر کے اسے کابل منتقل کیا۔ افغانستان کے روشن خیال مصلح اور فرمانروا امان اللہ خاں علامہ افغانی کی عظمت سے باخبر اور ان کی دینی و ملی خدمات کے بہت مداح اور قدر دان تھے۔ وہ جب ترکی کے دورے پر گئے تو انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ علامہ افغانی کے جسد خاکی کو افغانستان میں دفن کرنا چاہیئے۔ لیکن شاہ امان اللہ کی واپسی کے بعد افغانستان میں بغاوت ہو گئی اور اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۳ء/۱۳۶۲ھ میں تمام ضروری انتظام مکمل ہونے کے بعد علامہ افغانی کا تابوت ہندوستان لایا گیا۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر عقیدت مندوں کا زبردست ہجوم تھا۔ تابوت کو جلوس کی شکل میں لے جا کر باشاہی مسجد کے ساتھ علامہ اقبال کے مزار کے برابر رکھا گیا۔ پھر نماز جنازہ پڑھی گئی اور یہ شاندار جلوس واپس ہوا۔ جب علامہ افغانی کا تابوت کابل پہنچا تو ارباب حکومت اور عوام نے اپنے جذبات دعقیدت کا شاندار مظاہرہ کیا اور علامہ افغانی کا جسد خاکی شاہانہ اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کے وطن میں دوبارہ دفن کر دیا گیا(59)۔

سید جمال الدین افغانی کو عمر بھر قومی درد ملک ملک لیے پھرا۔ افغانستان، ایران، مصر، ترکی، ہندوستان۔ ہر جگہ انہوں نے قوم کو پکارا اور آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ ان کی آواز میں اللہ نے غضب کی تاثیر دی تھی، جہاں پکار اٹھے ایک آگ سی لگ گئی۔ قوم کی خاطر وہ فرانس، جرمنی، روس، انگلستان اور امریکہ گئے اور جو کام وطن میں نہ ہو سکا تھا وہ غریب الوطنی میں انجام دیا اور زندگی کے آخری لمحات تک قومی فلاح و بہبود کے لیے کوشش کرتے رہے۔

استنبول میں سکونت اختیار کر لینے کے بعد سید جمال الدین افغانی نے اپنی تمام تر توجہ اتحاد عالم اسلام کے لیے مرکوز کر دی۔ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کا تصور علامہ افغانی کو ہمیشہ محبوب رہا۔ ان کے نزدیک اتحاد ہی ایک ایسی قوت ہے جو اسلامی ممالک کو ناقابل تسخیر طاقت بنا سکتی ہے اور ان کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ برطانیہ، فرانس اور روس جیسے طاقت ور ممالک کی جارحیت سے ان ممالک کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ میں علامہ افغانی جب حج کرنے گئے اور وہاں پر ایک سال قیام بھی فرمایا۔ تو اسلامی اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے جمعیۃ ام القریٰ قائم کی۔ کیونکہ علامہ جمال الدین افغانی اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلامی ممالک کی طاقت اور سربلندی کا راز اسلامی اتحاد میں مضمر ہے۔ حیدرآباد، لندن اور پیرس کے جرائد میں انہوں نے جو مقالے لکھے ان میں اسلامی اتحاد کو فروغ دیا۔ فرانس، تیونس سے لے کر ہندوستان کے مختلف ممالک میں سید جمال الدین افغانی اور ان کے رفقاء نے العروۃ الوثقیٰ کے نام سے جو انجمنیں قائم کیں۔ ان کا بنیادی مقصد اسلامی اتحاد کا قیام تھا(60)۔

سید جمال الدین افغانی کے مقاصد:

سید جمال الدین افغانی کے خیال کے مطابق دنیا بھر کے مسلمانوں کو جن مشکلات کا سامنا ہے۔ تیونس، ایران، مصر، ترکی جیسے ممالک کو سامراجی دُوَل کی ہوس سے خطرات لاحق ہو گئے ہیں اور عرب ممالک میں جو انتشار پایا جاتا ہے۔ ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسلامی اتحاد بہت ضروری ہے۔ سب اسلامی ممالک پر مشتمل اور ایک خلیفہ کی سربراہی کو تسلیم کرنے والی خلافت قائم ہو جائے۔ علامہ افغانی رنگ و نسل کی تفریق اور قوم و وطن کے اختلاف و تعصب پر مبنی مغرب تصور قومیت کے سخت مخالف تھے۔ وہ تصور ملت کے قائل تھے۔ جس کی اساس مسلمانوں کے دینی عقائد ہیں۔ وہ رنگ و نسل اور وطن و قوم کے اختلافات کو ختم کر کے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک وحدت پر لے آتا ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے اس نظریہ جنسیت اور اسلام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

افراد سے جماعتیں بنتی ہیں۔ ایسی جماعتوں کے خیالات میں اتحاد ہوتا ہے۔ ان کے مفادات مشترک ہوتے ہیں۔ جب یہ جماعتیں لالچ میں آجاتی ہیں تو آپس میں ٹکرا جاتی ہیں اور قومیت کا عنصر وجود میں آجاتا ہے اور یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ فلاں روسی ہے، فلاں چینی ہے، فلاں ہندی ہے۔ یہ عصبیت ضرورت سے پیدا ہوتی ہے جب ضرورت باقی نہ رہے تو عصبیتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ مسلمان ان تمام عصبیتوں سے بالاتر ہو کر ایک قوم بن جاتے ہیں جب افراد اسلام کے فرزند بن جاتے ہیں تو وہ صرف ایک قومیت رکھتے ہیں۔ اسلام کی قومیت میں تمام قومیتیں گم ہو جاتی ہیں اور وہ قوم قبیلہ اور نسلی بندھنوں سے بالکل آزاد ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ عالمگیر رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ مسلمانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب وہ یہ سنتے ہیں کہ مسلم سلطنت پر غیر مسلموں نے قبضہ کر لیا ہے تو ان کو اس قدر ملال ہوتا ہے جیسے خود ان پر گزرا ہو (61)۔

سید جمال الدین کے کردار اور ان کے اثر و نفوذ کا ذکر ان کے دو سوانح نگاروں نے مختصر اور جامع الفاظ میں کیا ہے جن میں سے ایک مغربی عالم اور مصنف ہے۔ اور دوسرا مشرقی ہے۔ پروفیسر ای جی براؤن نے سید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ" وہ بے پناہ قوتِ کردار، وسیع علم و فضل، انتھک جوشِ عمل۔ بے نظیر جرات و بیباکی اور تقریر و تحریر میں غیر معمولی فصاحت کے سرمایہ دار تھے۔ اور ان کی ظاہری شکل صورت بھی نہایت دل کش اور وجیہ تھی۔ وہ بیک وقت فلسفی، ادیب، خطیب اور صحافی تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر سیاستدان تھے۔ ان کے مداح انہیں بہت بڑا محب وطن اور ان کے مخالف انہیں بے حد خطرناک شورش پسند سمجھتے تھے(62)۔

دوسری رائے سید صاحب کے شامی سوانح نگار جرجی زیدان کی ہے اس نے 'مشاہیر الشرق' میں سید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ سید جمال الدین کی تمام مساعی کا مقصد اتحادِ اسلام تھا۔ پھر آگے چل کر بیان کیا ہے کہ "اس جدوجہد میں انہوں نے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ اور اسی کی خاطر دنیا سے انقطاع اختیار کر لیا۔ انہوں نے عمر بھر شادی نہ کی۔ نہ کسی طرف سے نفع کے طالب ہوئے۔ لیکن جس مقصد کے لیے انہوں نے اتنی محنت کی وہ حاصل نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنے خیالات کی بھی کوئی یادداشت نہ چھوڑی۔ صرف ایک رسالہ مادیّت پرستوں کے خلاف لکھا اور مختلف موضوعات پر جن کا ذکر آ چکا ہے چند چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے دوستوں مداحوں اور شاگردوں میں زندگی کی وہ روح پھونک دی جس سے ان کی قوتیں بیدار اور ان کے قلم تیز و طرّار ہو گئے۔ مشرق کو ان کے کارناموں سے فائدہ پہنچا اور ہمیشہ پہنچتا رہے گا (63)۔

مسلمانوں کے انحطاط کا سبب:

اسلام کے پیدا کردہ دینی اتحاد نے مسلمانوں کو ایک طاقت بنا دیا۔ اور ساری دنیا میں ان کی قوت اور حکومت کا سکہ کئی سو سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد زوال اس طریقے سے آیا کہ ساری دنیا کے مسلمان ان کے ظلم کا نشانہ بن گئے۔ اس صورت حال کو علامہ افغانی نے اپنے مضمون مسلمانوں کا انحطاط جمود میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مسلمان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ عوام تو کجا علماء بھی جن کا کام امت کے عقائد کی حفاظت ہے۔ باہم رسم و راہ اور مراسلت نہیں رکھتے۔ ترکی عالم حجازی عالم سے بے خبر ہے اور ہندی عالم افغانی عالم سے نا آشنا۔ آج پوری دنیا اسلام کی یہی حالت ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی ملک کے علماء بھی آپس میں کوئی ارتباط نہیں رکھتے اور اس قدر دور ہو گئے ہیں کہ خویشی اور قرابت کے پیوند بھی باقی نہیں رہے۔ ہر ایک کو صرف اپنی ذات سے سروکار ہے وہ اپنے وجود سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہ انجام بیگانگی جیسی عامۃ امت اور علماء میں ہے ویسی ہی حالت مسلمانوں ملوک و سلاطین کی بھی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں نہ عثمانیوں کی سفارت مراکش میں ہے اور نہ مراکش کی سفارت عثمانیوں میں۔ ایک دوسرے سے منہ موڑنے کا رجحان اس نوبت تک پہنچ چکا ہے کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے۔ مسلمانوں کا ایک دوسرے ملک سے اور ایک شہر دوسرے شہر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ اور کبھی حج کے موقع پر ایک ملک کے مسلمان کچھ واقف ہو جاتے ہیں ملت اسلام کی یہ حالت اور اس کے ماننے والوں میں ملی احساس کی یہ کمزوری انتہائی افسوس ناک ہے (64)۔

فصل سوم:

سید جمال الدین افغانی کے تلمیذ، معتمد ساتھی اور رفیق

سید جمال الدین افغانی کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان میں ایسے باصلاحیت نوجوان بھی شامل تھے جو علمی دنیا میں ممتاز ہوئے۔ قومی صحافت کے معمار بنے اور سیاسی جدوجہد میں رہنمائی کی۔ سید افغانی کے ان ممتاز شاگردوں میں درج ذیل افراد شامل ہیں:

تلمیذ:

۱۔	مفتی محمد عبدہ	۲۔	ادیب اسحاق
۳۔	سعد زاغلول پاشا	۴۔	محمد بک
۵۔	ابراہیم مویلحی	۶۔	عبدالکریم سلمان
۷۔	ابراہیم الاغانی	۸۔	یعقوب سنا
۹۔	سلیم نقاش	۱۰۔	ابراہیم اللقانی
۱۱۔	سلیم نحوری	۱۲۔	عبداللہ ندیم
۱۳۔	سعد بستانی	۱۴۔	عبدالسلام دو یلحی
۱۵۔	ابراہیم ہلباوری	۱۶۔	عبداللہ نعیم

۱۔ مفتی محمد عبدہ

آپ کی پیدائش ۱۸۴۲ء/ ۱۲۵۸ھ میں مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''محلّہ نصر'' میں ہوئی۔ آپ کے والدین کی مالی حالت کمزور تھی اور سوسائٹی میں ان کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں تھا۔ با ایں ہمہ آپ کی استعداد بلند اور فطرت ارجمند اور مناسب سعی نے آپ کو مفتی اعظم دیارِ مصریہ کے درجہ تک پہنچا دیا جب تک اسلام اور مسلمان باقی ہیں۔ آپ کا نام سنہری حروف میں صفحاتِ دہر پر لکھا رہے گا(65)۔

آپ کے والد کا پیشہ زمینداری تھا اور اس لیے اپنے تمام بیٹوں کو بھی فلاحت پر لگا رکھا تھا۔ لیکن محمد عبدہ کو ذکی الطبع خیال کر کے اس کو فقیہہ بنانے کا ارادہ کیا۔ پہلے اس کو اپنے گاؤں کے مدرسہ میں داخل کیا۔ چند سال کے بعد موضع طنطا کے جامع احمدی میں بھیج دیا۔ جہاں آپ تین سال تک پڑھتے رہے۔ لیکن بقول خود آپ کے من جملہ دیگر وجوہ کے ایک بڑی وجہ طریقہ تعلیم کا ناقص ہونا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اتنی مدت دراز تک کچھ بھی استفادہ نہ کر سکے تعلیم کی اشد ضرورت محسوس کرنے اور اتنی مدت اس کی تحصیل پر صرف کرنے کے باوجود اس طرح کوار رہنا آپ کو سخت ناگوار گزرا جس سے آپ کی طبیعت میں ایک غیر معمولی حرکت پیدا ہوئی۔ اور آپ نے خود اپنے مطالعہ سے علم حاصل کرنے کا عزم مصمم کر کے مطالعہ کے لیے ایک خاص طریقہ

ایجاد کیا۔ جو آپ کے ذہن رسا کا نتیجہ تھا اس طرح آپ کو مطالعہ میں لذت محسوس ہونے لگی اور علوم کا ایک معتد بہ حصہ آپ نے اس طریقہ پر حاصل کیا۔

۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء میں جبکہ آپ کی عمر تیس سال کی تھی اور جامع ازہر میں کئی سال گذار چکے تھے۔ حسن اتفاق سے سید جمال الدین افغانی مصر میں وارد ہوئے۔ اور وہاں پر منطق اور فلسفہ کا درس جاری کیا۔ آپ بھی دیگر ذوی الاستعداد مصری نوجوانوں کے ساتھ سید صاحب کے حلقہ درس میں بیٹھ کر ان کی افاداتِ عالیہ سے مستفیض ہونے لگے۔

تھوڑی سی مدت میں سید صاحب کے فیض صحبت سے قابل افراد کی ایسی جماعت تیار ہوگئی۔ جس کا وجود کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس سے پہلے گویا وہ گھپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ سید صاحب نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور مشعل نور ان کے سامنے رکھ دی۔ آپ نے ان میں ایک نئی زندگی کی روح پھونک دی اور ان کو اپنی حالت اس طرح نظر آنے لگی۔ جس طرح کہ وہ درحقیقت ہے۔ کیونکہ آپ نے ان کی عقلوں سے ظنون اور اوہام کے پردے اٹھا کر حقیقی علم اور فلسفہ کی روشنی سے ان کو منور کیا (66)۔

محمد عبدہ اپنے استاد کا سب سے عزیز شاگرد تھا کیونکہ یہی ایک جوہر قابل تھا۔ جس میں سید کی نورانی شعاعوں کو منعکس کرنے کی استعداد بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ سید صاحب مصر سے رخصت ہونے لگے تو اپنے بعض خواص سے کہتے گئے کہ میں محمد عبدہ کو تمہارے لیے چھوڑے جاتا ہوں۔ جو مصر کے آسمان علم کا آفتاب بن کر چمکے گا۔

آپ اس کے بعد مختلف عہدوں پر مامور ہوئے کبھی مدارس امیریہ میں درس دیتے رہے۔ کبھی ''وقائع مصریہ'' کے (جو اس عہد کا سرکاری اخبار تھا) ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور مطبوعات مصریہ کے مدیر یا ناظر اعلیٰ نامزد کیے گئے۔ اسمٰعیل پاشا کی معزولی کے بعد جب ریاض پاشا وزیر اعظم ہوئے تو اس نے آپ کو اپنا مقرب بنالیا۔ اور اکثر امور مہمہ میں آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مصر میں عرابی پاشا کے حوادث پیش آئے اور اعرابی پاشا کی پارٹی نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ بھی ان کا ساتھ دیں۔ آپ ہمیشہ ان کو ان کے ارادوں سے روکتے رہتے تھے۔ اور اس کے انجام سے ان کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ لیکن جب واقعات نے خطرناک صورت اختیار کی۔ اور انگریزی فوجیں مصر میں داخل ہوئیں تو من جملہ دیگر اشخاص کے شیخ محمد عبدہ بھی گرفتار ہوئے۔ ان سب پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور چونکہ شیخ محمد عبدہ پر توفیق پاشا کی معزولی کا فتویٰ دینے کا الزام ثابت ہوتا تھا۔ اس لیے آپ کو جلاوطن کیا گیا۔ آپ ملک شام میں اقامت گزین ہوئے۔ اہل شام نے آپ کا اچھی طرح خیر مقدم کیا۔ اور آپ چھ سال تک وہاں مقیم رہے۔ اس اثناء میں بعض جگہ مدرس بھی رہے۔ آپ نے ''رسالۃ التوحید'' (اپنے موضوع پر باوجود اختصار کے نہایت جلیل القدر تصنیف ہے) یہیں شام میں تصنیف کیا۔ چھ سال کے بعد آپ نے یورپ کا سفر کیا اور پیرس میں اپنے استاد اور مربی سید جمال الدین افغانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ (سید صاحب ہی نے آپ کو بلایا تھا) اور جیسے کہ سید جمال الدین کے تذکرہ حیات میں مذکور ہوا۔ وہاں پر ''العروۃ الوثقیٰ'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ جس میں تحریر مضامین کا کام آپ کے سپرد تھا۔ پیرس کے زمانہ اقامت میں آپ نے تمدن جدید کی باریکیوں سے اپنے آپ کو اچھی طرح واقف کیا اور فرانسیسی زبان

اس قدر سیکھ لی کہ اس میں مطالعہ کر سکتے تھے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد آپ کی جلاوطنی کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ اور آپ مصر میں چلے آئے۔ چنانچہ خدیو نے آپ کو قاضی مقرر کیا اور جب آپ کی قابلیت نمایاں ہوئی۔ تو آپ کو محکمہ اپیل کا مستشار مقرر کیا گیا اور جامع ازہر کی مجلس انتظامیہ کے رکن بنائے گئے بالآخر ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) میں دیارِ مصریہ کے مفتی اعظم کے جلیل القدر عہدہ پر فائز ہوئے اور ابھی اسی منصب پر فائز تھے کہ ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو آپ کا انتقال ہو گیا (67)۔

۲۔ ادیب اسحاق:

سید افغانی کے شاگردوں میں سے ادب اور صحافت کے میدان میں ادیب اسحاق نے بڑا نام پیدا کیا۔ وہ دمشق کے باشندے تھے، نہایت ذہین و فہیم تھے۔ صرف پندرہ سال کی عمر میں شاعر اور ادیب کی حیثیت سے مشہور ہو گئے اور بیروت کے علمی حلقوں میں ان کے ادبی ذوق اور زورِ قلم کا چرچا ہونے لگا۔ بیروت میں وہ ایک جریدہ ''التقدیم'' کے مدیر ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے وطن کو خیر باد کہا اور قاہرہ کا رُخ کیا، جہاں کی علمی صحبتوں میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اسی زمانے میں علامہ افغانی مصر آئے تھے۔ ادیب اسحاق ان کی شہرت سن چکے تھے اور قاہرہ پہنچتے ہی ان کے درس میں شامل ہو گئے۔ علامہ افغانی کے خیالات سے وہ بے انتہا متاثر ہوئے اور مصر میں آزاد صحافت کی ترویج و ترقی کو اپنا مقصد قرار دیا۔ ان کے اخبارات کو علامہ افغانی کی عملی تائید و سرپرستی حاصل تھی اور ان کے مضامین سے عوام میں بیداری اور اضطراب پیدا ہونے لگا جس سے حکومت نے خطرہ محسوس کیا اور جب یہ اخبار بند کر دیئے گئے تو ادیب اسحاق پیرس چلے گئے اور وہاں ''القاہرہ'' کے نام سے ایک اخبار جاری کر کے افغانی تحریکِ اصلاح و بیداری مصر کے لیے کامیاب جدوجہد کرنے لگے۔ لیکن پیرس کی آب وہوا ان کو راس نہ آئی اور وہ بیروت جانے پر مجبور ہو گئے۔ بیروت میں وہ اخبار ''استقدام'' کے مدیر ہوئے اور افغانی کی تحریک کو ترقی دینے کی کوشش جاری رکھی۔ ۱۸۸۱ء/ ۱۲۹۸ھ میں ان کو مصر آنے کی اجازت مل گئی تو وہ قاہرہ آ گئے اور اپنا اخبار مصر سے پھر جاری کیا۔ ادیب اسحاق مصری پالیمنٹ کے ممبر منتخب کیے گئے تو ملکی سیاست میں براہِ راست حصہ لینے لگے۔ احمد اعرابی کی انہوں نے پرجوش حمایت کی۔ اسکندریہ پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد وہ قاہرہ میں گرفتار کر لیے گئے اور پھر ان کو مصر سے نکال دیا گیا۔ ادیب اسحاق قاہرہ سے پھر بیروت آئے اور اخبار ''التقدیم'' کی ادارت سنبھالی، لیکن ان کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی اور ۱۸۸۵ء/ ۱۳۰۳ھ میں صرف ۲۹ سال کی عمر میں انتقال کر گئے (68)۔

۳۔ سعد زاغلول پاشا:

سید افغانی کے نوجوان شاگردوں میں سعد زاغلول پاشا بہت مشہور ہوئے۔ وہ مصر کی تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے قائد اور اس ملک کی اہم ترین سیاسی جماعت ''وفد'' کے سربراہ تھے اور اپنی ملی خدمات کے باعث بابائے قوم کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ زاغلول، مفتی محمد عبدہ کے بھی شاگرد تھے۔ ان کا تعلق مصری فلاحین کے ایک خاندان سے تھا۔ جامعہ ازہر میں تعلیم پائی۔ ۱۸۷۵ء/ ۱۲۹۳ھ میں اپنے دوست ابراہیم ہلباوی کے ساتھ سید افغانی سے ملے اور ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ ہلباوی

پہلے افغانی کے مخالف علماء کے پروپیگنڈا سے متاثر تھے اور سید افغانی کو ملحد خیال کرتے تھے لیکن ۱۸۷۲ء/۱۲۹۱ھ میں جب وہ افغانی سے ملے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے شاگرد اور مداح بن گئے اور اپنے دوست زاغلول کو بھی ان سے ملانے کے لیے ساتھ لے آئے۔ افغانی کے فیض صحبت نے زاغلول کو ایک حریت پسند رہنما بنا دیا۔ احمد اعرابی کی حمایت کرنے کی پاداش میں قید کر دیے گئے۔ اور رہائی کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر جج ہو گئے اور ترقی کر کے وزیر تعلیم اور وزیر عدلیہ کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ مصر میں برطانوی نمائندہ لارڈ کچنر ان کا بہت مخالف تھا، اس لیے ان کو مستعفی ہونا پڑا۔ 1918ء/۱۳۳۷ھ میں انہوں نے مصر کی آزادی کے لیے شدید جدوجہد شروع کر دی اور ان کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ دو سال کے بعد وہ مصر آئے تو انگریزوں کے خلاف بلوے شروع ہو گئے، اور زاغلول کو پھر گرفتار کر کے عدن بھیج دیا گیا۔ ایک سال کے بعد رہائی ملی تو ان کی تحریک اس قدر قوت حاصل کر چکی تھی کہ ۱۹۲۴ء/۱۳۴۳ھ میں وزیر اعظم ہو گئے۔ انگریزوں سے شدید کشمکش کے باعث ان کو استعفا دینا پڑا، لیکن صرف چند روز کے بعد مصری پارلیمنٹ نے ان کو اپنا صدر منتخب کر لیا اور وہ قوم کے محبوب ترین رہنما بن گئے۔ زاغلول، سید افغانی اور مفتی محمد عبدہ سے بہت متاثر تھے۔ مصر کی آزادی اور فلاحین کی بیداری و ترقی کے لیے افغانی نے جو تحریک شروع کی تھی اس کو زاغلول نے بہت آگے بڑھایا اور مصر سے افغانی کے اخراج کے بعد بھی زاغلول ان سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرتے رہے (69)۔

معتمد ساتھی و رفیق

مرزا محمد باقر:

مرزا محمد باقر کی تعلیم و تربیت ایران میں ہوئی۔ تحصیل علم کے بعد آپ نے ہندوستان، چین، وسط ایشیا، اٹلی، فرانس اور انگلستان کا سفر کر کے انواع و اقسام کے تجربات حاصل کیے۔ لندن میں بہت عرصہ تک رہے اور "العروۃ الوثقی" جن دنوں میں شائع ہوتا تھا۔ آپ یہیں لندن میں قیام پذیر تھے۔ عراق، عرب اور ملک شام میں بھی ایک مدت مدید بسر کی۔ چنانچہ بیروت میں تین سال تک آپ کا قیام رہا۔ سیاسی وجوہ کی بناء پر حکومت عثمانیہ نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ تو آپ نے اپنے وطن مالوف طہران میں آ کر اپنی عمر کا آخری حصہ بسر کیا مشہور مؤرخ مسٹر براؤن نے آپ کے فرزند اصغر بیروت کے "المطبعۃ العصریہ" کے مالک اور مجلہ "المنتقد" کے ایڈیٹر کو ایک چٹھی لکھی ہے جس میں میرزا محمد باقر موصوف کی زندگی کا مختصر سا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتا ہے۔

"مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ تم میرے فاضل استاذ مرحوم مرزا محمد باقر کے فرزند ارجمند ہو۔ جب میں نے علوم شرقیہ کی تحصیل شروع کی۔ تو آپ ہی میرے سب سے پہلے استاد تھے۔ جب آپ نے داغ مفارقت دیکر بیروت کا سفر اختیار کیا۔ اگرچہ اس واقعہ پر پورے پچیس سال گذر چکے ہیں لیکن ابھی تک مرحوم کے اخلاق اور فضائل کا نقش میرے لوح قلب پر تازہ ہے۔ میرا آپ سے ۱۸۸۳ء/۱۳۰۱ھ سے تعارف تھا۔ بہت دنوں تک میں آپ کا فیض صحبت حاصل کیا۔ آپ سے میں

نے قرآن شریف کا ترجمہ سیکھا اور آپ نے مجھ کو اپنی ایک مثنوی موسوم بہ ''الشمسیۃ اللدنیہ'' اور قرآن شریف کی تفسیر منظوم بزبان فارسی جو خود مرحوم کی تصنیف تھی پڑھائی۔ مؤخر الذکر تفسیر ابھی تک نہیں چھپی۔ لیکن اول الذکر مثنوی لندن میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے۔ اس مثنوی کے اشعار بہت مشکل اور نا قابل فہم ہیں۔ اور جب تک خود اس کے مصنف کی زبان سے ان کی تشریح نہ سن لی جائے۔ اس مثنوی کے رموز اور اشارات کا زور طبع سے حل کرنا ناممکن ہے اس مثنوی میں آپ وہ باتیں بیان کرتے ہیں جو انہوں نے عالم رویا میں آپ کو نظر آئیں۔ بعض مقامات ایسے ہیں کہ حالات پر سیاسی نقطہ نظر سے کنایات میں کچھ لکھا ہے۔ بعض جگہوں پر وزراء اور سفراء دول کے ناموں کا جس کا تعلق سیاست حاضرہ سے ہوتا ہے۔ فارسی میں لفظی ترجمہ کر کے ذکر کرتے ہیں چنانچہ اسی مثنوی کا ایک شعر ہے:

سنگ ہیجت بہ پیچ نام نیرزد
سنگ دہیچت بہ جنگ ننگ درآمد

سنگ پیچ گلیڈ سٹون کا لفظی ترجمہ ہے جو انگریزوں کے مصر میں دخیل ہونے کے ایام میں دولت برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ دہیچ مسٹر برائٹ کا لفظی ترجمہ ہے۔ یہ بھی مجلس وزراء کے رکن رکین تھے۔ آپ علوم دینیہ کے جید عالم تھے اور السنہ قدیمہ و جدیدہ مثلاً عبرانی، یونانی، انگریزی، عربی، فارسی اور اردو میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ انگریزی زبان نہایت فصاحت کے ساتھ بولتے تھے اور آپ کی تحریر عالمانہ اور فلسفیانہ ہوتی تھی۔ آپ کے خدوخال سے رعب و جلال ٹپکتا تھا اور اکثر اشخاص آپ کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتے تھے۔ حتیٰ کہ شہزادہ ملکہ خان بھی جو ان دنوں سلطنت ایران کی طرف سے لندن میں سفیر تھے۔ آپ کے رعب و جلال کے قائل تھے (70)۔

آپ چاہتے تھے کہ تمام بنی نوع انسان اور جملہ اقوام عالم کا ایک ہی مذہب ہو جائے۔ جس کی بدولت دنیا میں امن اور سلامتی کا دور دورہ ہو۔ چنانچہ اس غرض کے لیے آپ نے تمام مذاہب عالم کا غور سے مطالعہ کیا۔ لیکن بالآخر علی وجہ البصیرۃ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تمام تعلیمات عقل اور فطرت کے موافق ہیں اور ارتقاء تمدن کے کسی درجہ کے بھی وہ منافی نہیں ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد آپ نے اس موضوع پر متعدد کتابیں اور رسالے یورپ کی زبان میں لکھے۔ اور یورپ ہی میں شائع کر کے تمام اہل مغرب کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ سب کے سب اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں۔

آپ کی تحریر فصاحت اور بلاغت کا نمونہ اور قوت استدلال میں اپنی نظیر آپ ہوتی تھی۔ علیٰ ہذا القیاس تقریر میں بھی آپ کی قوت بیانیہ مسلم تھی۔ چنانچہ ترکی کے مشہور علامہ احمد مدحت آفندی کی بابت مشہور ہے کہ جب وہ کوئی رائے قائم کر لیتے تھے۔ تو کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی اس کے خلاف ان کو قائل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ بغداد میں ان کی ملاقات میرزا محمد باقر مرحوم سے ہوئی اور آپ نے چند ہی منٹ میں احمد مدحت کو اپنی بات تسلیم کرا دی اور آفندی ممدوح نے آپ کے علم و فضل اور قوت استدلال کا اعتراف کیا (71)۔

انقلابی تحریک ان کی تصانیف کے آئینے میں:

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے تصنیف و تالیف کی طرف شیخ کا رجحان بہت کم تھا وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں زندہ کتابیں تصنیف کرتا ہوں اور بلاشبہ انہوں نے ہزار ہا زندہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی دماغی قوت تمام تر سیاسی مشاغل میں صرف ہوتی تھی اور نہ کبھی ان کو سفر و سیاحت سے اتنی مہلت ملی کہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کرتے۔ ان کے قلم کا تمام سرمایہ جرائد و رسائل کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔ اس سرمایہ کو امتداد زمانہ نے بہت کچھ ضائع کر دیا پھر بھی اہل ذوق چاہیں تو تلاش اور جستجو کا میدان تنگ نہیں ہے"۔ آثار جمال الدین" کی دوسری جلد میں شیخ کے تمام مضامین جو مل سکے جمع کر دیئے گئے ہیں لیکن ابھی زمانہ کے گرد و غبار سے ڈھکے ہوئے بہت سے جواہر ریزے متفرق اور منتشر ہیں جن کو شیخ کا بھیدی کوئی زیادہ قابل و اہل سوانح نگار جمع کر سکے گا۔

کتابی صورت میں شیخ کی تالیف صرف ایک ہی ہے یعنی تتمہ البیان فی تاریخ افغان" یہ پہلے فارسی زبان میں مرتب ہوئی پھر مصر میں اس کا عربی ترجمہ شائع ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان میں اردو ترجمہ چھاپا گیا(72)۔

اس کے بعد شیخ کا ایک مضمون، ردعلی الدھریین" فارسی سے عربی میں ترجمہ ہوا۔ یہ مضمون سب سے پہلے حیدرآباد میں لکھا گیا اور پھر رسالہ کی صورت میں شیخ کے مصری شاگردوں نے اس کو شائع کیا۔ مستقل تالیف و تصنیف کا سرمایہ تو بس اسی قدر ہے۔ چند مضامین اردو، اور فارسی زبان میں "مقالات جمالیہ" کے نام سے کلکتہ میں شائع ہوئے اس رسالہ کے نسخے اب کمیاب ہیں۔ ایک نسخہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانہ میں موجود ہے اس کے علاوہ شیخ کے حسب ذیل مضامین بھی مصر اور ہندوستان میں بصورت رسائل شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ حجۃ البالغہ ۲۔ جملۃ القرآن

۳۔ فسلفہ الدین واللغت ۴۔ المحافظ علی الدین

۵۔ القضاۃ والقدر ٦۔ الوصیۃ بساسقۃ الاسلامیہ

"عروۃ الوثقی" میں شیخ کے جتنے مضامین شائع ہوئے وہ سب کتابی صورت میں مصر میں شائع ہو چکے ہیں البتہ "ضیاء الخافقین" میں شائع شدہ مضامین کا پتہ نہ چل سکا۔ اسی طرح پرنس ملکم خاں کے رسالہ "قانون" میں جو مضامین شائع ہوئے ان تک بھی رسائی نہ ہو سکی۔ حیدرآباد کے رسالہ معلم اور معلم شفیق میں شیخ کے حسب ذیل مضامین شائع ہوئے تھے۔

۱۔ فلسفہ وحدت وجنسیت ۲۔ تعلیم و تربیت

۳۔ اسباب حقیقت سعادت وشقائے انسان ۴۔ فوائد جریدہ، فوائد فلسفہ

۵۔ شرح حال اگھوریان، اخبار "دارالسلطنۃ" (کلکتہ) میں شیخ کا ایک مضمون تفسیر مفسر کے عنوان سے شائع ہوا۔ بطرس البستانی کے رسالہ دائرہ المعارف مصر میں بھی شیخ نے بانی مذہب کے متعلق کچھ مضامین لکھے۔ اخبار مصر (اسکندریہ) میں دو مضامین تعلیم اور صنعت پر شائع ہوئے۔ رسالہ المنار (مصر) میں بھی شیخ کے حالات کے سلسلہ میں ان کے بعض مضامین نقل کیے

گئے ہیں جن میں دو مضامین "فی الحکومتہ الاستبدادیہ" کے عنوان سے بہت مشہور ہیں۔۶۲-۱۸۶۰ء میں Edenburgh Review نے بھی شیخ کے دو تین مضامین شائع کیے تھے۔

علاوہ مندرجہ بالا رسائل و مضامین کے بعض کا ذکر مرزا لطف اللہ نے کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کہاں اور کب شائع ہوئے۔ ان رسائل کے عنوانات بقول مرزا لطف اللہ یہ ہیں:

۱۔ طفل رضیع۔ ۲۔ رسالہ حقیقت آشنا

۳۔ کیفیت شہادت (73)

افغانی کے عالم اسلام پر اثرات:

علامہ نے اپنی پوری زندگی اور اپنی تمام صلاحیتیں اسلام کے فروغ اور اسلامی ممالک کی آزادی و استحکام اور ملت اسلامیہ کے اتحاد و ترقی کے لیے وقف کر دیں یہی ان کا مقصدِ حیات تھا، جسے حاصل کرنے کے لیے وہ مجاہدانہ جوش و خروش سے سرگرم عمل رہے، اور مطلق العنان فرماں رواؤں، تنگ نظر ملاؤں اور مغرب کی سامراجی طاقتوں سے ٹکرانے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا اور جبر و استبداد، جمود و جہالت اور ظلم و استحصال کی تاریکیوں میں عدل و مساوات، روشن خیالی، جہد و عمل اور حریت پسندی کی شمعیں روشن کرتے رہے۔ انہوں نے عملی زندگی کے وسیع میدان میں جب قدم رکھا تو ان کی عمر بیس سال سے بھی کم تھی اور آئندہ چالیس سال، تا دمِ وفات وہ حصولِ مقصد کے لیے حیرت انگیز قابلیت اور ناقابلِ شکست عزم و استقلال کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ علامہ افغانی روشن خیال متبحر عالم بھی تھے اور حریت پسند سیاسی مدبر بھی۔ وہ انقلاب کے داعی تھے، اور عالم اسلام میں دینی و ملی بیداری پیدا کرنا ان کی جدوجہد کا بنیادی مقصد تھا۔ انہوں نے مذہبی جمود کو توڑا اور علمائے دین میں روشن خیالی اور حب ملی پیدا کر کے سیاسی انقلاب کی راہ ہموار کر دی۔ ان کی سیاسی بصیرت، تدبر و فراست، حریت پسندی اور قیادت کی خداداد صلاحیت کی بدولت اسلامی ممالک میں وہ سیاسی شعور پیدا ہو گیا، جس نے خوابیدہ ملتوں کو بیدار کر دیا اور داخلی جبر و استبداد اور خارجی استحصال و جارحیت کو ختم کرنے کی جدوجہد نے انقلابی تحریکوں کی شکل اختیار کر لی (74)۔

زندگی کے آخری ایام میں علامہ افغانی کو یہ افسوس تھا کہ وہ اپنی بوئی ہوئی کھیتی کو سرسبز ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکے اور محکوم اقوام کو آزاد دیکھنے کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔ انہوں نے جو تخم ملوکیت کے شورہ زار میں ڈالے تھے وہ تو ضائع ہو گئے تھے لیکن جو تخم ملت کی زرخیز زمین میں کاشت کیے تھے وہ بار آور ہوئے اور ان کی جدوجہد انقلاب آفرین ثابت ہوئی۔ اور یہ کامیابی کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ اس نے تو قوموں کی تقدیریں بدل دیں۔ اسلامی دنیا کے داخلی اور خارجی حالات اس قدر بگڑے ہوئے اور ناموافق تھے کہ علامہ افغانی کی یہ آرزو پوری ہونا ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنی عظیم جدوجہد کے کامیاب نتائج خود اپنی زندگی میں دیکھ لیں۔ یہ زمانہ مغربی سامراج کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور برطانیہ، جس سے علامہ افغانی مسلسل برسرِ پیکار رہے، اپنی عظمت و قوت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا۔ اور برطانیہ کے بعد سب سے بڑی سامراجی طاقت روس تھا۔ اسلامی ممالک کو ان زبردست طاقتوں کا مدِ مقابل بنانا اور ان کی جارحیت، مداخلت اور تسلط سے اسلامی دنیا کو نجات دلانا کوئی ایسا آسان کام نہ تھا جو علامہ

افغانی اپنی زندگی میں مکمل کر سکتے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ مصر میں خدیو توفیق جیسا انگریزوں کا حاشیہ بردار، ترکی میں عبدالحمید جیسا ذاتی اقتدار کا بھوکا، ایران میں ناصر الدین جیسا ظالم و جابر، اور افغانستان میں عبدالرحمٰن جیسا مطلق العنان ملک و ملت کی قسمت کا مالک بنا ہوا ہو(75)۔

علامہ افغانی نے اسلامی دنیا میں اصلاحی، انقلابی اور اسلامی تحریکوں کے جو چراغ جلائے تھے وہ برابر روشن رہے۔ ان کے رفیقوں، شاگردوں، اور معتقدوں نے ان کی تحریک کو اپنے اپنے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا اور ملتِ اسلامیہ میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔

مصر میں علامہ افغانی کی تحریک ان کے نامور شاگردوں محمد عبدہ، اور سعد زاغلول کی قیادت میں منزل مقصود سے ہم کنار ہوئی۔ ترکی میں ان کی پھونکی ہوئی روح زندہ و بیدار رہی۔ صرف چند سال کے مختصر عرصہ میں عبدالحمید کی مطلق العنانی ختم ہوئی اور غازی انور، محمود شوکت، طلعت نیازی اور سعید حلیم جیسے عظیم محبانِ ملت کی قیادت میں نوجوان ترکانِ احرار نے ۱۹۰۸ء/۱۳۲۶ھ میں دستوری انقلاب کو کامیاب بنایا(76)۔

ایران:

ایران میں انگریزوں کو تمباکو کا اجارہ دینے کے خلاف زبردست تحریک اور ناصر الدین کے قتل نے استبداد کی جڑیں کاٹ دی تھیں۔ مظفر الدین شاہ ملی تحریک کا مقابلہ نہ کر سکا اور ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ میں دستوری اصلاحات نافذ کی گئیں، جن سے اس کا جانشین محمد علی شاہ منحرف ہو گیا اور اس کا نتیجہ ۱۹۰۹ء/ ۱۳۲۷ھ کی زبردست بغاوت کی شکل میں نکلا اور محمد علی کو معزول کر کے دستوری نظام قائم کر دیا گیا(77)۔

افغانستان:

افغانستان کے عوام میں سیاسی شعور بیدار نہ تھا اور عبدالرحمٰن کی مطلق العنانی برقرار رہی لیکن رفتہ رفتہ وہاں بھی تبدیلی ہوتی رہی اور امیر امان اللہ خاں (۱۹۱۹ء/ ۱۳۳۸ھ) کی اصلاحات سے اس پس ماندہ ملک میں بھی دستوری نظام کا آغاز ہو گیا(78)۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے اور انگریزوں کے تسلط سے علامہ افغانی بہت متاثر ہوئے تھے اور برطانوی سامراج کے خلاف ان کے شدید جذبات کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ ہندوستانی مسلمان، جس کی علامہ افغانی کی نظر میں بہت وقعت اور اہمیت تھی، برطانوی استبداد کا شکار ہو رہے تھے اور عالمِ اسلامی کے اتحاد و استحکام کے لیے علامہ افغانی ہندی مسلمانوں کے اتحاد اور آزادی کو بہت اہم تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانانِ ہند کی آزاد مملکت قائم کرنے کا ایک منصوبہ بھی ان سے منسوب کیا جاتا ہے اور اپنے تبلیغی جہاد کے منصوبے میں بھی انہوں نے اسلامی ہند کو شامل کیا تھا۔ علامہ افغانی کی تحریک اتحاد اسلامی نے اسلامیانِ ہند کو سب سے زیادہ متاثر کیا، اور علامہ اقبال نے اس تصور میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اسلامی ہند کی ملی

بیداری اسلامی افکار واسلامی شعور کی رہین منت ہے اور پاکستان کا قیام بھی عالم اسلام کی آزادی واتحاد کے لیے علامہ افغانی کے ایک اہم خواب کی تعبیر ہے (79)۔

اسلامی اتحاد:

اسلامی کانگریس منعقد کرنے کا جو اہتمام علامہ افغانی نے کیا تھا وہ ناصر الدین شاہ کی دسیسہ کاری کی بدولت نا تمام رہ گیا۔ لیکن یہ تصور زندہ رہا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء/ ۱۳۴۵ھ میں مکہ معظمہ میں اور ۱۹۳۲ء/ ۱۳۵۱ھ میں بیت المقدس میں اسلامی کانفرنسیں منعقد کر کے مٹے ہوئے نقوش کو ابھارنے کی کوششیں ہوئیں اور قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء/ ۱۳۶۸ھ اور ۱۹۵۰ء/ ۱۳۷۰ھ میں کراچی میں ہونے والی کانفرنسوں نے ملت اسلامیہ کی ایک عالم گیر غیر سرکاری تنظیم مؤتمر عالم اسلامی مستقل بنیادوں پر قائم کر دی، جو اب عالمی اداروں میں ملت اسلامیہ کی ایک مؤثر آواز بنتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں میں دینی روابط کو مستحکم کرنے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں رابطہ عالم اسلامی کا قیام خاص اہمیت کا حامل ہے اور یہ ادارہ بھی برابر ترقی کر رہا ہے۔

اسلامی ممالک کو متحد کر کے ایک ایسی زبردست طاقت بنا دینا جو حریف طاقتوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے اور اپنی آزادی اور حقوق کا تحفظ کرے، علامہ افغانی کا ایک عظیم منصوبہ تھا اور اب یہ سنہرا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء/ ۱۳۸۹ھ میں رباط میں مسلمان سربراہوں کی کانفرنس سے اسلامی اتحاد کے ایک زریں دور کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۲ء/ ۱۳۹۲ھ میں اسلامی ممالک کی تنظیم کا منشور منظور کیا گیا اور اس منشور کو عملی شکل دینے کے لیے فروری ۱۹۷۴ء/ ۱۳۹۴ھ میں لاہور میں اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق اسلامی ممالک کی عالمی تنظیم اور متعدد سیاسی و اقتصادی ادارے مستقل اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو گئے ہیں۔ اسلامی ممالک کے سیاسی اتحاد اور اقتصادی تعاون کے نظریات عملی حقیقت بن چکے ہیں۔ اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ علامہ افغانی کی قائم کردہ فکری بنیاد پر عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق وسیع تر اور عظیم تر عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ اسلامی دنیا میں افغانی کی روح اب بھی بیدار و بے قرار ہے۔ وہ اس دورِ جدید کے بانی اور نقیب ہیں۔ اس دور میں ملوکیت کے شورہ زار جمہوریت کے سبزہ زاروں میں تبدیل ہو رہے ہیں اور ان کے افکار و نظریات کے انقلاب آفرین تخم اب اس زمین میں رائیگاں نہیں جاتے بلکہ بار آور ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے (80)۔

فصل چہارم:

اقوال سید جمال الدین افغانی

۱۔ لا صداقته الا باتحاد المشرب ولا قرابته الالوحدث المارب۔

۲۔ من در جوانی شعرمی سرودم ولیکن در بزرگی بہ ترکش گفتم۔

میں نے جوانی میں شاعری کی لیکن بڑی عمر میں اسے چھوڑ دیا۔

۳۔ الدنیا لعب ہر کہ برد برد و ہر کہ باخت باخت۔

دنیا کھیل ہے جو جیت گیا سو جیت گیا جو ہار گیا سو ہار گیا۔

۴۔ انعدام صاحب نیت اسباب انعدام نیت نمی شود۔

۵۔ دو نوع فلسفہ در دنیا ہست یکے آنکہ ہیچ چیز در دنیا مال ما غیست و قناعت بہ یک لقمہ باید کرد و دیگر آن کہ ہمہ چیز ہا خوب و مرغوب دنیا مال ماست و باید مال ما باشد۔ ایں دو یمی خوب است۔ ایں دو یمی را باید شعار خود ساخت نہ اولی را کہ بالبشریت نمی درزد"۔

دنیا میں دو فلسفے ہیں ایک یہ کہ دنیا کی ہر چیز پر صرف ایک لقمے کے ساتھ قناعت کرنی چاہیے۔ دوسرا یہ کہ دنیا کی ہر عمدہ چیز ہمارا مال ہے یا ہونا چاہیے۔ دوسرا فلسفہ عمدہ ہے اسے عادت بنانا چاہیے۔ پہلے فلسفے کو نہیں اپنانا چاہیے۔

۶۔ جوانان را ادب زیب و زیور کمال است معہذا نہ باید بدین اکتفا نمود۔ چنان قناعت بعدی از درجات کمال با وصف این کہ او را حد و پایہ نے نیست از دون ہمتی و پست فطرتی است۔

ادب جوانوں کے لیے حسن اور عمدہ تحفہ ہے۔ اس پر بس نہیں کرنی چاہیے۔ ایسی قناعت کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ کم ہمتی سے پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ میں کتابیں لکھتا نہیں۔ میں زندہ کتابیں تصنیف کر رہا ہوں۔

مراد یہ ہے کہ لوگ تو عام قسم کی کتابیں لکھتے ہیں جن کی عارضی اہمیت ہوتی ہے لیکن جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ عام کتابوں سے مختلف اور ہمیشہ باقی رہنے والی اور مستقل حیثیت کی مالک ہیں۔

روایت از علامہ رشید رضا، کہ جب شیخ مصر سے جا رہے تھے تو شاگردوں میں سے کسی نے کہا کہ اپنی یادگار کوئی کتاب تصنیف کیجیے اس کے جواب میں یہ فقرہ فرمایا تھا۔

۸۔ اگر کوئی شخص اپنے حق میں نیکی کرنا چاہتا ہو تو یہ مشکل ہے لیکن اگر وہ اپنے ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہو تو اس کو اپنی ذاتی خواہشات قربان کرنا ہوں گی۔

۹۔ در موضوع انحطاط مسلمین شکوہ از او ر بیان خطا است، وخرابی حال مسلمانان از اخلاط فاسدہ درونی خود

مسلمان است۔

اپنے تنزل کے سلسلے میں اہل یورپ کا شکوہ بے کار ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ بربادی ان کی اندرونی خرابیوں کے سبب سے ہے۔

۱۰۔ حق وہ ہے جو دلیل و برہان رکھے۔

صرف ذاتی رائے قیاس یا گمان حقیقت کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ وہ بات قابل قبول ہوتی ہے جو دلیلوں سے سچ ثابت کی گئی ہو۔

۱۱۔ شیر جہاں جاتا ہے اپنے لیے غذا مہیا کر لیتا ہے۔

طاقتور انسان کسی کا محتاج نہیں ہوتا وہ اپنے زور بازو سے جہاں اور جن حالات میں بھی ہو اپنے لیے وسائل خود مہیا کرتا ہے۔ مصر سے خارج البلد ہوئے تو روانگی کے وقت ایرانی سفیر نے کچھ روپیہ بطور زادِ راہ پیش کیا اس کو جواب دیا کہ مجھ سے زیادہ تم کو اس چیز کی ضرورت ہے۔ شیر جہاں جاتا ہے اپنے لیے غذا مہیا کر لیتا ہے"۔

۱۲۔ چند اشعار جو شیخ اکثر پڑھا کرتے تھے (بقول مرزا لطف اللہ)

نخستیں بادہ کندر جام کردند | زچشم مست ساقی دام کردند
بخود کردند سر خویشتن فاش | عراقی را چرا بدنام کردند

بازخت پیرم یک حرف مرا یاد است۔ ویران نشود، عالم تا میکدہ آباد است۔

یا دل کہ تواند بُرد یا جاں کہ تو اندداد

دل بردن و جاں دادن ایں ہر دو خداداد است

من آں شوخ طناز را می شناسم | من آں مایہ ناز را می شناسم
بگوش من آمد ی آواز پائے | من آں صاحب آواز را می شناسم

۱۔ سب سے پہلے وہ شراب جو پیالے میں ڈالی گئی اسے آسانی کی موت آنکھ سے ادھار لیا گیا۔

۲۔ اپنا راز تو خود انہوں نے فاش کیا ہے پھر عراقی کو کیوں بدنام کر رہے ہیں۔

۳۔ میں اگر چہ بہت بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن ایک بات مجھے یاد ہے وہ یہ کہ جب تک مے خانہ آباد ہے۔ دنیا ویران نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ یا تو دل چُرا کے لے جانا چاہیے یا پھر جان دے دینی چاہیے۔

۵۔ دل چرانا اور جان دے دینا دونوں خدا کی طرف سے ہوتے ہیں (81)۔

۶۔ میں اس شوخ محبوب کو پہچانتا ہوں۔ میں اس ناز بھرے محبوب کو پہچانتا ہوں۔

۷۔ کل میرے کانوں میں پاؤں کی آواز آئی۔ میں اس آواز والے کو پہچانتا ہوں۔

خلاصہ کلام

سید جمال الدین افغانی ''کنڑ'' کے ایک گاؤں اسعد آباد میں ۱۸۳۸ء/۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ کابل میں علوم کی تکمیل کے بعد ۱۸ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ واپسی پر امیر دوست محمد خان، امیر محمد اعظم خاں اور امیر شیر علی خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے کابل میں رہے۔ ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ تک وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اسلامی ممالک کی عافیت کا انحصار باہمی اتحاد میں ہے۔ اور یہ پیغام دوسرے اسلامی ممالک تک پہنچانے کے لیے مختلف ممالک کے سفر کیے۔ ہندوستان، روس، مصر، ترکی، فرانس، ایران، جرمنی، بغداد اور حجاز کے ممالک شامل ہیں۔ عمر کے آخری حصہ میں آپ ترکی تشریف لائے۔ ترکی میں سلطان ترکی کے ساتھ اچھے تعلقات کی بنا پر آپ کو حاسدوں کی نظر لگ گئی۔ جس کی بنا پر آپ کو نظر بند کر دیا گیا۔ اسی دوران آپ کو سرطان کا مرض لاحق ہو گیا۔ اس مرض کی وجہ سے ۹ مارچ ۱۸۹۷ء/۱۳۱۴ھ کو سید جمال الدین افغانی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

انا للہ وانّا الیہ راجعون۔

حوالہ جات

1۔ عبداللہ بٹ، جمال الدین افغانی، قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۲۰۔

2۔ ایضاً، ص ۲۱۔

3۔ شاہد حسین رزاقی، سید جمال الدین افغانی (حیات وافکار)، ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، سن ندارد، ص ۴۔

4۔ قاضی محمد عبدالغفار، آثار جمال الدین افغانی، الفیصل ناشران وتاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، ص ۴۰۲

5۔ ایضاً، ص ۴۰۵۔

6۔ ایضاً، ص ۴۰۷۔

7۔ ایضاً، ص ۴۰۸۔

8۔ شاہد حسن رزاقی، سید جمال الدین افغانی، حیات وافکار، ص ۵۔

9۔ مرزا لطف اللہ، شرح حال وآثار، سید جمال الدین افغانی اسد آبادی، برلن، ص ۱۶۔

10۔ شاہد حسین رزاقی، سید جمال الدین افغانی (حیات وافکار)، ص ۸۔

11۔ جمال الدین افغانی، مقدمہ حقیقت نیچری ونیچریان، مکتبہ شعروادب لاہور، ص ۸۔

12۔ شاہد حسین رزاقی، سید جمال الدین افغانی (حیات وافکار)، ص ۱۰۔

13۔ ایضاً، ص ۱۱۔

14۔ مقصود ایاز، شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، شعاع ادب چوک انارکلی، مسلم مسجد لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۲۔

15۔ ہانس کوہن، History of alationalism in the east

16۔ شاہد حسین رزاقی، سید جمال الدین افغانی (حیات وافکار)، ص ۲۱۔

17۔ ایضاً، ص ۲۲۔

18۔ ایضاً، ص ۶۴۔

19۔ ایضاً، ص ۶۷۔

20۔ ایضاً۔

21۔ ایضاً۔

22۔ ماہنامہ معلم شفیق، حیدرآباد (دکن)، دسمبر ۱۸۸۰ء۔

23۔ جمال الدین افغانی سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دار العرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۴۳۔

24۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔

25۔ شاہد حسین رزاقی، سید جمال الدین افغانی، حیات وافکار، ص ۲۳۔

26۔ ایضاً، ص ۲۴۔

27- قاضی محمد عبدالغفار، آثار جمال الدین افغانی، ص ۴۶۔
28- ایضاً۔
29- ایضاً۔
30- ایضاً۔
31- قاضی عبدالغفار، آثار جمال الدین افغانی، ص ۵۹۔
32- ایضاً، ص ۵۵۔
33- مولانا عبدالرحیم، سید جمال الدین افغانی، محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی نمبر ۵، ص ۱۴۔
34- جمال الدین افغانی، ص ۴۱۔
35- قاضی عبدالغفار، آثار جمال الدین افغانی، ص ۱۲۰۔4
36- جمال الدین افغانی، ص ۱۰۴۔
37- ایضاً، ص ۱۰۵۔
38- ایضاً، ص ۱۰۹۔
39- ایضاً، ص ۴۴۔
40- ایضاً، ص ۳۶۔
41- ایضاً، ص ۱۳۵۔
42- ایضاً، ص ۱۳۶۔
43- مبارزالدین رفعت، مقام جمال الدین افغانی، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۴۹ء، ص ۲۶۔
44- ایضاً، ص ۱۳۸۔
45- ضیاء برنی، سید جمال الدین افغانی، ص ۲۶۔
46- ایضاً۔
47- مبارزالدین رفعت، مقام جمال الدین افغانی، نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۴۹ء، ص ۵۲۔
48- ظفر علی خاں، مقام جمال الدین افغانی، ص ۵۴۔
49- شاہد حسین رزاقی، سید جمال الدین افغانی، حیات و افکار، ص ۱۴۳۔
50- ایضاً، ص ۱۴۵۔
51- ظفر علی خاں، مقام جمال الدین افغانی، ص ۵۴۔
52- جمال الدین افغانی، ص ۱۴۹۔
53- ایضاً، ص ۱۴۹۔
54- ایضاً

55- ایضاً،ص۱۶۴۔

56- سید جمال الدین افغانی،ص۲۹۔

57- ایضاً،ص۲۹۔

58- شاہد حسین رزاقی،سید جمال الدین افغانی حیات وافکار،ص۱۹۴۔

59- ایضاً،ص۱۹۵۔

60- جمال الدین افغانی سید محمد عبدہ،العروۃ الوثقیٰ،دار العرب قاہرہ،مصر،۱۹۵۷،ص۵۳۔

61- مبارز الدین رفعت،مقالات جمال الدین افغانی (مقالہ جنسیت اور اسلام) ص۸۱۔

62- مبارز الدین رفعت،مقالات جمال الدین افغانی،مقالہ تعصب،ص۱۵۲۔

63- جرجی زیدان،مشاہیر الشرق،مصر،جلد اوّل،ص۳۰۰۔

64- ایضاً،ص۳۰۱۔

65- سید جمال الدین افغانی،ص۳۶۔

66- شاہد حسین رزاقی،سید جمال الدین افغانی،حیات وافکار،ص۵۴۔

67- ایضاً،ص۵۵۔

68- ایضاً۔

69- ایضاً۔

70- عبدالرحیم مولانا،سید جمال الدین افغانی (محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی کراچی نمبر۵) ص۶۵-۶۸۔

71- ایضاً،ص۶۸۔

72- شاہد حسین رزاقی،سید جمال الدین افغانی،حیات وافکار،ص

73- ایضاً۔

74- شاہد حسین رزاقی،سید جمال الدین افغانی (حیات وافکار) ادارہ ثقافت اسلامیہ،کلب روڈ لاہور،ص۱۹۷۔

75- ایضاً۔

76- ایضاً، ص۱۹۸۔

77- ایضاً۔

78- ایضاً، ص۱۹۹۔

79- ایضاً۔

80- قاضی عبدالغفار،آثار جمال الدین افغانی،ص۲۹۹۔

باب سوم

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ
کے حالات زندگی

پیدائش: 1872ء/1289ھ

وفات:1944ء/1363ھ

قائدملت امام انقلاب
حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ

قائد ملت، امامِ انقلاب — صاحبِ اوصاف بے حد و حساب
داعیٔ فکرِ امام دہلوی — مصلحِ امت فقیہہ لا جواب
شارحِ اسرارِ قرآنِ مبیں — دیدہ ور، بالغ نظر، حکمت مآب
پستیٔ امت کے غم کی آگ سے — جس کا سینہ ہو گیا جل کر کباب
حسرت و حرمان کی ظلمت میں جو — بن کے آیا آفتاب و ماہتاب
قوم کے محبوب و منظورِ نظر — دل فروز و دل ربائے شیخ و شاب
زندگی کی ہر مہم میں کامراں — زیست کے ہر مرحلہ میں کامیاب
شیخ سندھی عالمِ ام الکتاب — رہنما و رہبرِ راہِ صواب
آپ کا ہر فعل ایماں آفریں — روح پرور آپ کا قول و خطاب
باطل و فاسد عقیدے کر دیے — آپ نے سب آشکار و بے نقاب
عمر غربت میں گزاری بسر دیں — اور کیا حبِ وطن سے اجتناب
ریشمی رومال کی تحریک میں — کام آیا آپ کا حسن و شباب
ارتقاء و حفظ ملت میں رہے — رنج و غم ان کے ہمیشہ ہم رکاب
چھوڑ کر باطل، کیا حق اختیار — بارک اللہ، ذالک الحسن المآب

عین پیری میں بالآخر ہو گئے
بارگاہِ کبریا میں باریاب

سرور میواتی، لاہور

تعارف

یہ باب چار فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں نام و نسب، ابتدائی تعلیم وقبول اسلام اور اس کے بعد کے حالات درج ہیں۔ اسی فصل میں آپ کے اساتذہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

فصل دوم میں جلاوطنی اور اسفار کا تذکرہ ہے۔

فصل سوم میں آپ کے تمام تلامذہ کا ذکر ہے۔ اور چوتھی فصل میں آپ کے افکار اور کتب کا ذکر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

فصل اوّل:

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے حالات زندگی

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی برصغیر میں زوال اور غلامی کا ایسا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے گزشتہ تین سو سالہ دور میں کئی جماعتوں اور گروہوں نے اس عظیم ملک کی بہتری و آزادی کے لیے ان تھک محنتیں اور کوششیں کی ہیں۔ لیکن جو کام امام شاہ ولی اللہ کی جماعت نے ملکی آزادی و دین کی فلاح کے لیے کیا۔ اس کی مثال کوئی دوسری جماعت پیش نہیں کر سکتی۔ اس جماعت کی کوشش نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب کی جماعت کے عظیم سپوت۔ آزادی کے مجاہد فلسفہ ولی اللّٰہی کے مبلغ اور عظیم سیاسی راہنما مولانا عبید اللہ سندھیؒ تھے۔

نام ونسب:

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۲ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء ضلع سیالکوٹ کے گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوئے (اب یہ گاؤں گوجرانوالہ میں شامل ہے اور شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ہے)۔ آپ کے والد سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا نام بوٹا سنگھ والد کا نام رام سنگھ اور دادا کا نام جیت رائے تھا۔ آپ کی پیدائش سے چار ماہ پیشتر ہی آپ کے والد وفات پا چکے تھے۔ اس کے دو سال بعد دادا بھی فوت ہو گئے۔ مولانا کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ صرف بہنیں تھیں۔ مولانا کی والدہ ساری زندگی سکھ دھرم پر قائم رہیں۔ مولانا کی پرورش بڑی ناز و نعم سے ہوئی۔ مولانا سندھی اپنی ذاتی ڈائری میں اپنے خاندان کے متعلق لکھتے ہیں:

میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصل پیشہ زرگری تھا۔ لیکن کچھ عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہو گیا اور بعض افراد ساہوکاری بھی کرتے تھے (1)۔

پیدائش کے بارے میں مولانا اپنی ذاتی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں شب جمعہ قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا۔ تو میری والدہ مجھے ننھیال لے آئی۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا (2)۔

اپنے نام کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں کہ:

میں سلمان فارسی کی اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار پر والد کی طرف منسوب کر کے لکھنا پڑا۔ تو عبید اللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی بہن کا نام جیونی تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبید اللہ بن راما بن رائے لکھوں گا۔ میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جیت رائے ولد گلاب رائے ہے (3)۔

ابتدائی تعلیم وقبول اسلام:

ضلع ڈیرہ غازی خاں (یوں تو پنجاب کا ضلع ہے لیکن اس کی سرحدیں سندھ، بلوچستان اور سرحد سے بھی ملتی ہیں) میں اس دور میں اکثر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ اس علاقہ میں پیروں، فقیروں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور عوام وخاص کو تصوف سے بہت لگاؤ تھا۔ صدیوں سے اس زمین میں بڑے بڑے صوفیائے کرام پیدا ہوتے چلے آرہے تھے۔ یہ ماحول تھا جس میں اس بچے نے ماموں کے ہاں ابتدائی تعلیم سکول سے حاصل کی اور اپنی زندگی کے دس بارہ سال گزارے جبکہ دوسری طرف گھر کے چھوٹے بڑے سکھ تھے۔

جام پور میں (مولانا عبیداللہ سندھی) حصول تعلیم کے دوران اس بچے کا مسلمانوں سے میل جول بڑھتا گیا۔ اور مسلمانوں کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور وہ اسلامی تعلیمات اور معاشرت سے بہت متاثر ہوا۔ ۱۸۸۴ء/۱۳۰۲ھ میں ایک لڑکے (جو کہ ہندو تھا) نے مولانا عبیداللہ سندھی کو"تحفۃ الہند" کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ اس کتاب نے آپ کو بہت متاثر کیا۔ اس کے بعد آپ نے شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویت الایمان" اور مولوی محمد لکھنوی کی کتاب "احوال الآخرت" کا مطالعہ کیا۔

ان کتابوں کے مطالعہ سے متاثر ہو کر مولانا عبیداللہ سندھی نے ۱۸۸۷ء/۱۳۰۵ھ میں جبکہ آپ کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ اسلام قبول کیا۔ اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف عبیداللہ کے نام پر عبیداللہ رکھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ وہ ماموں (جام پور) کے گھر سے نکل جائے۔ اس کی اطلاع نہ انہوں نے ماں کو دی، نہ ماموں کو خبر دی۔ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں کوئی پیچھا نہ کر رہا ہو۔ راستہ میں اسے ماں کی ممتا یاد آئی۔ بہنوں کی محبت بھی پیچھے کی طرف کھینچتی تھی۔ لیکن یہ بچہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اس کے جی میں جو بات سمائی تھی۔ وہ کسی کی محبت اور کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد دین اسلام کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے عزیز واقارب کو چھوڑ کر سندھ کی طرف چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر اپنے وقت کے بہت بڑے عالم سے تعلیم حاصل کی۔

قبول اسلام کے بعد مولانا کا اعزاز:

سندھ پہنچ کر آپ سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی شریف والوں کے پاس حاضر ہوئے۔ حافظ صاحب نے آپ کی تربیت بہت اچھے انداز سے کی اور ایک دن بھرے مجمع میں فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ آج کے بعد ہم اس کے ماں باپ ہیں۔ مولانا سندھی نے سندھ کو اپنا مستقل وطن قرار دیا۔ جس کا اظہار انہوں نے ذاتی ڈائری میں کچھ ان الفاظ میں کیا ہے۔

میں ۱۵ اگست ۱۸۸۷ء/۱۳۰۵ھ کو توکل علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلاں مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ سندھ کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر اس طرح رقمطراز ہیں کہ میں سندھ میں حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی والے) جو اپنے وقت کے

جیداور سید العارفین تھے۔ چند ماہ ان کی صحبت میں رہا۔ اُس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک دن میرے سامنے اپنے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے ہمیں اپنا ماں باپ بنایا ہے۔ اس کلمہ مبارک کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انہیں اپنا باپ سمجھتا ہوں اور محض اس لیے سندھ کو اپنا مستقل وطن بنایا (4)۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہت سفر کیے۔ اس سلسلے میں کبھی وہ بھر چونڈی شریف ہوتے ہیں تو کبھی دین پور اور کبھی دارالعلوم دیوبند غرضیکہ آپ نے تعلیم کے لیے سفر کو جاری رکھا۔

اپنی ذاتی ڈائری میں مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ:

بھر چونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بھاولپور کی دیہاتی مسجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا۔ جہاں سید العارفین کے خلیفہ اوّل مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کی کتابیں میں نے یہیں پڑھیں۔ حضرت خلیفہ نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آ گئیں اور واپس جانے کے لیے بہت زور لگایا۔ مگر میں بحمد اللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی)۔ شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خان پور سے کوٹلہ رحیم شاہ چلا آیا۔ اور مولوی خدا بخش سے کافیہ پڑھی۔ یہیں ایک نو وارد طالب علم سے (جس کا نام عبدالقادر تھا) ہندوستانی مدارس عربیہ کا حال معلوم ہوا۔ اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا'' (5)۔

مولانا سندھی نسلاً سندھی نہ تھے۔ ان کی قومیت اختیار کی۔ لیکن سرزمین سندھ سے نسبت کو انہوں نے دل کی گہرائیوں سے قبول کیا تھا۔ اس لیے انہوں نے سندھی کے لفظ کو اپنے نام کا جزو بنالیا اور یہ لفظ ان کے نام کے ساتھ ایسا چسپاں ہوا۔ پاک و ہند کے کسی گوشہ میں چلے جاتے اور کسی معمولی پڑھے لکھے شخص سے جسے تاریخ آزادی اور اسلامیات کے مطالعہ سے دلچسپی ہو یا عرب و حجاز کا کوئی صاحب علم ہو اگر اس سے پوچھا جائے کہ مولانا سندھی سے کون شخصیت مراد ہے۔ تو ہندوستان کے دور دراز عرب و حجاز کی علمی دنیا میں صرف ایک ہی جواب ہوگا کہ مولانا سندھی سے مراد سندھ کے مشہور عالم دین، مفکر، انقلابی، سیاستدان اور فلسفہ ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے شارح مولانا عبیداللّٰہ ہیں (6)۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے اساتذہ کرام میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور شیخ الہند مولانا محمد حسن کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہوئے۔

اساتذہ

ا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ:

مولانا ہدایت احمد انصاری گنگوہی کے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء کو بروز دوشنبہ بوقت چاشت قصبہ گنگوہ (ضلع سہارنپور) میں شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کی خانقاہ کے متصل مکان میں ہوئی۔ ان کا سلسلہ نسب والد کیطرف سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور دادای کی طرف سے گیارھویں پشت میں شیخ عبدالقدوس گنگوئی سے مل جاتا ہے(7)۔

مولانا رشید احمد گنگوہی کی عمر سات سال کی تھی جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے دادا نے ان کی تربیت کی۔ ابتدائی تعلیم ماموں مولوی محمد تقی اور محمد بخش رام پوری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں (۱۸۴۵ء/ ۱۲۶۱ھ) میں دہلی آ گئے۔ اور وہاں مولوی قاضی احمد الدین جہلمی کی شاگردی اختیار کی، اس کے مولانا مملوک علی نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت دہلی کالج (اجمیری دروازہ دہلی) کے مدرس اوّل تھے۔

انہوں نے مفتی صدر الدین سے بھی اکتساب علم کیا اور حدیث شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی۔ ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء میں وہ تحریک آزادی میں حصہ لینے کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ انہوں نے تین مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء سے ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء تک صرف چند سال چھوڑ کر تقریباً ۵۰ برس انہوں نے گنگوہ میں تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیا۔ ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء ان کی بصارت جاتی رہی۔ پھر وفات تک اصلاح باطن اور تربیت مریدین میں مشغول رہے(8)۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۸۵۷ء/ ۱۲۷۳ھ میں شاملی اور تھانہ بھون وغیرہ میں جہاد حریت کی علمبردار تھے۔ اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی سرپرستی میں بڑے بڑے کارنمایاں انجام دیئے۔ برطانوی دور میں وہ خاص طور پر معتوب رہے لیکن خدا نے ہمیشہ گزند سے محفوظ رکھا۔ ۱۲یا ۱۷ جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ کو وہ نفل ادا کرنے حجرے میں گئے۔ جہاں پاؤں کی دو انگلیوں کے ناخن سے ذرا نیچے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا جس سے شدت کا بخار ہوگیا۔ ہر چند علاج کیا گیا لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اور باختلاف روایت ۸ یا ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ/ ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو بعد از نماز جمعہ وفات پا گئے(9)۔

۲۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ:

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ممتاز عالم سر برآوردہ مجاہد رہنما تھے۔ وہ دیو بند (ضلع سہارن پور، ہندوستان) کے عثمانی شیوخ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی عربی زبان کے مشہور ادیب تھے۔ مولانا محمود حسن ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتب اپنے چچا سے پڑھیں۔ ۱۸۶۶ء/ ۱۲۸۳ھ میں دار العلوم دیو بند قائم ہوا۔ تو مولانا محمود حسن دار العلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ انہوں

نے کتب صحاح ستہ مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند سے پڑھیں۔ اور سفر وحضر میں بھی ان کے ہمراہ رہے۔ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے۔ ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں بطور معین مدرس دارالعلوم میں پڑھانے لگے (10)۔

مولانا محمود حسن نے ہندوستان کے سیاسی حالات پر نظر رکھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک انگریز ہندوستان سے نہ نکلیں گے۔ اس وقت تک ملک میں سکون نہیں رہے گا۔ ان حالات نے انہیں مجبور کر دیا اس میدان عمل میں نہ صرف خود اتریں بلکہ ہندوستان کے دوسرے ذی اثر علماء اور دوسرے مسلم قائدین سے مل کر حالات کا مقابلہ کریں۔ مولانا کے بہت سے شاگرد اور احباب پنجاب، سرحد اور سندھ میں تھے۔ مولانا محمود حسن نے اپنے شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا سیف الرحمٰن کو آزاد قبائل میں تبلیغ جہاد کیلئے بھیجا۔ ۱۹۱۵ء/۱۳۳۴ھ میں مولانا نے مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیجا کہ وہ امیر حبیب اللہ خاں کو جہاد پر قائل کرے۔ وہ متذبذب رہا اور کوئی مدد نہ کر سکا۔ تا آنکہ امیر امان اللہ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا (11)۔

مولانا محمود حسن بنیادی طور پر مصلح عالم اور شیخ طریقت تھے۔ ان کا اصل کام درس وتدریس اور تزکیہ وتربیت تھا۔ انہیں بعض حالات اور ضروریات کے تحت عملی سیاست میں حصہ لینا پڑا۔ اور وہ برطانوی استعمار کو دنیائے اسلام کا کٹر دشمن سمجھتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک ہندوستان پر انگریز قابض رہیں گے۔ دنیائے اسلام پر بھی ان کا اقتدار قائم رہے گا۔ انہوں نے علماء کو مسجدوں، حجروں اور درس کے حلقوں سے باہر نکالا۔ اور ان میں حریت طلبی، قومی ہمدردی اور راہ حق میں جانثاری اور فداکاری کی روح پھونک دی۔ اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں مولانا محمود الحسن کو لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بننا پڑا۔ لیکن ان کے پائے لغزش میں کمی نہ آئی۔ انہوں نے تمام مشکلات اور مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کیے۔ لیکن حرف شکایت کبھی زبان پر نہ لائے (12)۔

مولانا محمود حسن وجع المفاصل اور بواسیر کے پرانے مریض تھے۔ اسی حالت میں علی گڑھ اور دہلی کے سفر کیے۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے نہایت توجہ اور دلسوزی سے ان کا علاج کیا۔ مگر شیخ الہند کی طبیعت سنبھل نہ سکی اور وہ ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی میت دہلی سے دیوبند لائی گئی اور انہیں مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے پہلو میں دفن کر دیا گیا (13)۔

دارالعلوم دیوبند

۱۔ اس کا وجود ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں نقش پذیر ہوا۔ اس وقت سے اب تک پاک و ہند کی تاریخ مذہبی و سیاست میں۔ اسلام اور مسلمانوں کی شان و شوکت کی علامت کے طور پر اپنا سر اونچا کیے ہوا کھڑا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے حوادث کے بعد بھی برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا کوئی اجلا نقش اور وطن وملت کی خدمت کا کوئی یادگار مرکز جس کا ہر دور رشاندار جس کا ہر فیصلہ مستحسن نظر آتا ہے وہ صرف دارالعلوم دیوبند ہے۔ اس کا قیام وجود مشیت ایزدی کا مظہر ہے۔ اس لیے انقلاب اور زمانے کی شکست وریخت کا اس کے وجود پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دارالعلوم دیوبند تاریخ کا ایک اور متن باب بھی نہیں بلکہ براعظم ایشیا کے مسلمانوں کی دینی و تعلیمی۔ تہذیبی وثقافتی اور سیاسی وملی تاریخ کے ایک جلی نقش کا نام ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد علوم دینیہ کی تعلیم واشاعت ہے۔ اس مدرسہ کی وجہ سے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی دور دراز گوشہ ایسا نہیں ہو سکتا جہاں دیوبند کے اکابر اور فیض یافتگان کے دست تعلیم وتربیت کا کوئی اثر موجود نہ ہو۔

اس کے قیام کا ایک مقصد ہندوستان میں مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کا حصول اور قیام ملت اسلامیہ ہندیہ کی تدابیر کے لیے ایک مرکز اور نظام فکر کے ایک بنیادی نقطہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

۲۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی (بانی مدرسہ دارالعلوم دیوبند):

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تاریخی نام خورشید حسن ہے۔ آپ ۱۸۳۲ء/۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ اسد علی تھا۔ مولانا مملوک علی کے ساتھ دہلی جا کر ابتدائی تعلیم حاصل کی مولانا محمد قاسم کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جاملتا ہے۔ قرآن مجید جلد ختم کیا۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ جہاد آزادی کا آغاز ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ میں کیا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت حاجی امداد اللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبدالغنی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا شیخ محمد تھانوی سے جہاد حریت کے سلسلہ میں تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد حریت کی مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ ہم اصحاب بدر سے بھی بے سروسامانی میں زیادہ ہیں۔ حضرت امیر امداد اللہ نے طرفین کی بات سنی۔ فرمایا کہ الحمدللہ انشراح ہو گیا اور جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ امیر امداد اللہ نے امامت قبول کر لی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی سپہ سالار مقرر ہوئے (14)۔

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۷ء بروز جمعرات دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ موجودہ دور کی عالیشان عمارت کے متصل جنوب کی طرف مسجد چھتہ میں انار کے درخت کی ٹہنیوں کے سایہ میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا اور سب سے پہلے معلم ملا محمود اور سب سے پہلے متعلم مولانا محمود حسن قرار پائے۔

آپ نے چوتھی جمادی الاولیٰ ۱۸۷۹ء/ ۱۲۹۷ھ بروز جمعرات بعد نماز ظہر وفات پائی۔ گھر میں وسعت نہ تھی۔ مدرسہ میں جنازہ لا کر رکھا گیا۔ حکیم مشتاق احمد نے خاص قبرستان کے لیے ایک قطعہ زمین اسی وقت وقف کر دیا جو وہاں اوّل مولانا

صاحب کو دفن کیا۔ اس قبرستان میں شیخ الہند حضرت مدنی کے مزار بنے (15)۔

۳۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ:

جب انہوں نے ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند سے دریافت فرمایا کہ سیاسیات میں حضرت کا مسلک کیا ہے؟ تو حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور حضرت نے فرمایا: حضرت الاستاذ (حضرت نانا توی) نے اس مدرسے کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلیم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں۔ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کر دیا گیا۔ تاکہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے اور ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ کی ناکامی کی تلافی کی جائے (16)۔

۴۔ دار العلوم دیو بند اور حصول تعلیم:

تقریباً ۲۵ برس کی عمر میں سندھ میں مولانا عبید اللہ سندھی دینی تعلیم کی خاطر دیو بند آئے۔ یہاں انہیں محمود الحسن عالی مرتبہ شیخ سے استفادے کا موقع ملا۔ جو شاگرد کی رہنمائی اس اسلوب سے کرتا ہے کہ شاگرد کی ذات اپنی تکمیل کی راہ میں کسی قسم کی کوئی روک محسوس نہیں کرتی۔ استاد کامل تھا۔ شاگرد کو اپنے ساتھ کمال کی منزل پر لے جاسکا۔ ورنہ بعید نہ تھا کہ جو شخص دلی تسکین نہ پا کر اپنی ماں اور عزیز رشتہ داروں سے منہ موڑ سکتا ہے۔ وہ استاد کی رہنمائی سے سرتابی نہ کرتا۔

مولانا نے دار العلوم دیو بند میں درج ذیل علوم کا مطالعہ کیا:

مولانا عبید اللہ سندھی نے دیو بند میں قیام کے دوران اسلامی علوم پر عبور حاصل کیا۔ عربی زبان پڑھی تاکہ قرآن سمجھیں۔ تفسیر اور حدیث کا مطالعہ کیا۔ فقہ پڑھی، منطق اور فلسفہ میں کمال حاصل کیا۔ ان کی طبیعت دیو بند میں جم گئی۔ اور اس تعلیم اور مطالعہ نے انہیں پکا مسلمان بنا دیا۔ انہیں اس امر کا یقین ہوگیا کہ خدا تک پہنچنے کا راستہ سب سے سیدھا ہے۔

ذاتی ڈائری میں مولانا صاحب نے لکھا ہے:

صفر ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ھ میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہوا۔ پانچ ماہ تک قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن سے پڑھی۔ ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ میں تفسیر بیضاوی اور دورہ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہند سے پڑھی۔ اور سنن ابوداؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد کی خدمت میں گنگوہ پہنچا (17)۔

دار العلوم دیو بند وہ پہلی درسگاہ ہے جس نے مدرسہ دہلی کے بعد اس اصول پر کام شروع کیا۔ جو پروگرام شاہ ولی اللہ نے شروع کیا تھا۔ اس نظام کو مزید مستحکم بنانے کے لیے شاہ محمد اسحاق نے ترکی خلافت سے اشتراک پیدا کرنا ضروری سمجھا۔ اس لیے اس مدرسہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

مدرسہ کانپور:

حکمت اور منطق کی کتابیں پڑھنے کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی مدرسہ کانپور تشریف لے گئے اور وہاں پر چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری سے تفسیر کی کتابیں پڑھیں اور واپس دار العلوم دیو بند تشریف لے گئے۔

۵۔ ۱۸۸۹ء/۱۳۰۷ھ میں آپ نے امروٹ میں اپنے استاد حضرت شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے نام سے ایک مطبع ''محمود المطابع'' کے نام سے قائم کیا۔ جس میں انہوں نے عربی اور سندھی زبان میں بعض قیمتی نوادر کو چھاپ کر انہیں دستبرد زمانہ سے ہمیشہ کیلئے محفوظ کر دیا (18)۔

محمود المطابع سے کچھ مدت تک وہ ایک ماہوار رسالہ ''ہدایت الاخوان'' کے نام سے نکالتے رہے۔ اس طرح انہوں نے صحافت کے ذریعہ بھی دینی وسیاسی خدمات انجام دیں۔

۶۔ دارالرشاد:

مولانا عبیداللہ سندھی نے امروٹ واپس آ کر ایک مطبع قائم کیا۔ تقریباً دو سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں۔ اور ایک ماہ نامہ رسالہ ''ہدایت الاخوان'' نکالا۔ چھپائی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ لیکن مولانا کے دل میں خواہش بھی تھی اور کوشش بھی کرتے رہے کہ مدرسہ کا اجراء کیا جائے لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ جو کام مولانا سندھی کرنا چاہتے تھے وہ بغیر مدرسے کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے وہ کوشش کرتے رہے کہ حضرت مولانا راشد اللہ نے ۱۳۱۹ھ مولانا سندھی کی تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ مدرسہ کا نام بھی مولانا سندھی کی تجویز سے ''دارالرشاد'' رکھا گیا۔ سات برس تک اس مدرسہ کے اختیارات آپ کے پاس رہے۔ اکابر علماء سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن یمانی امتحان کے لیے تشریف لائے۔ اس مدرسہ کی مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک شاخ کراچی میں کھولی۔ ایک دو معلم وہاں تعلیم والے رکھے تھے۔ چار پانچ ماہ تو وہ شاخ چلتی رہی مگر بعد میں سرمائے کی کمی کے باعث اس کو بند کر دیا گیا۔ ان اساتذہ کی تنخواہ باقی تھی۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا ارادہ تھا کہ کابل جانے سے پہلے قرض سے دامن پاک کر لیں۔ سندھ میں گوٹھ پیر جھنڈا تشریف لائے۔ مولانا عبداللہ انصاری اس وقت مدرسہ ''دارالرشاد'' کا انتظام چلا رہے تھے۔ اس سے ہزار روپیہ یومیہ منگوایا اور کراچی میں اساتذہ کی تنخواہیں دیں (19)۔

۷۔ مولانا سندھی دارالرشاد میں تقریباً آٹھ سال تک علوم و معارف اسلامی کے درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اور مخصوص طلبہ اور اصحاب استعداد کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حکمت اور ان کے فلسفہ کے مطابق قرآن حکیم کا درس دیتے رہے (20)۔

سندھی زبان کو دینی علوم و معارف اور انقلابی افکار سے مالا مال کر دیا اور شاہ ولی اللہ کے فلسفے کے مطابق علوم و تفسیر قرآن کے سلسلے میں اپنے افادات کے ایک بڑے ذخیرہ کو مرتب کروا دیا (21)۔

۸۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ، دلی:

یہ ایک مشہور ادارہ ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ۱۹۱۳ء/۱۳۳۲ھ کو قائم کیا۔ نظارۃ المعارف کا ظاہر مقصد یہ تھا۔ وہ انگریز خواہ مسلمانوں میں عربی تعلیم کا شوق پیدا کرے۔ اصل میں یہ مسلمانوں کو مشنری کی ٹریننگ دینے کا ارادہ تھا۔ اس ادارہ میں

مولانا عبیداللہ سندھی کے خاص ساتھی ایم احمد علی، قاضی ضیاء الدین ایم۔اے، اصطفیٰ کریم بی اے، انیس احمد بی اے، وغیرہ تھے۔ جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، محمد علی آف کامریڈ، مولانا شبلی نعمانی، نواب مشتاق حسین وغیرہ۔ اس کے پرجوش ہمدرد تھے۔ مصارف ڈاکٹر انصاری کا پچاس روپیہ ماہانہ کا چندہ اور مشیروں کے ذریعہ جمع ہونے والی رقوم سے پورے ہوتے تھے۔ ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ میں تجویز تھی نظارہ کو کلکتہ کے دارالارشاد میں ضم کر دیا جائے لیکن بعد میں اسے رد کر دیا گیا۔ آزاد علاقہ کو جانے والے اور وہاں سے واپس آنے والوں کے لیے قیام گاہ کا کام دیتا رہا۔ مولانا سندھی کے کابل جانے کے بعد ایم احمد علی نے کچھ دنوں تک اس ادارہ کا نظام چلایا۔ اس کے بعد ۲۵ جون ۱۹۱۶ء کو اس کو بند کر دیا گیا(22)۔

فصل دوم:

جلاوطنی کا دور

(۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ تا ۱۹۴۴ء/۱۳۶۴ھ)

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وطن (ہندوستان) سے باہر گزارا۔ اپنے وطن سے دور رہے۔ انہوں نے افغانستان، ماسکو، ترکی وغیرہ میں اپنی زندگی کے ایام گزارے۔

ا۔ افغانستان میں مولانا عبیداللہ سندھی:

۱۹۱۴ء/۱۳۳۲ھ کی جنگ عظیم کے بعد جرمن، ترکی کا حلیف ہوگیا۔ علمائے دیوبند کا آئیڈیل عالم اسلام کا اتحاد تھا۔ اس کا مرکز ترکی میں تھا اور علمائے دیوبند کے قائد مولانا محمود الحسن سرپرست مدرسہ دیوبند نے اس کام کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے خاص خاص شاگردوں کو صوبہ سرحد اور سندھ میں موجود تھے۔ ترکی کی امداد میں لگا دیا۔ اس کام کے لیے مولانا عبیداللہ سندھی کو بھی افغانستان جانے کا حکم ملا۔ مولانا سندھی کو کابل جانے کا حکم تو فرمادیا لیکن کوئی پروگرام نہیں دیا۔

مولانا شیخ الہند نے ترکی کی امداد کا یہ طریقہ سوچا کہ ایک طرف صوبہ سرحد میں شورش پیدا کی جائے اور دوسری طرف مولانا عبیداللہ سندھی کو کابل بھیج دیا جائے۔ مولانا عبیداللہ سندھی وہاں جا کر افغانی سلطنت کو ترکی کی امداد کے لیے تیار کریں۔

ہندوستان سے روانگی:

شیخ محمود حسن کے حکم پر مولانا نے اپنے سفر کا آغاز دہلی سے کیا اور مختلف مقامات سے ہوئے مورخہ اگست ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کو کابل پہنچے۔ جس کا تفصیل کے ساتھ انہوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں شوال ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء کو کابل روانہ ہوا۔ اس سے تقریباً چار ماہ پہلے ہندوستان چھوڑنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کے شروع میں دہلی سے سندھ چلا آیا۔ اور چار ماہ مختلف مقامات پر گزارے (23)۔

اس حوالے سے مولانا عبداللہ لغاری لکھتے ہیں کہ: اس عرصہ میں آپ پشاور گئے اور سردار عبدالقیوم خاں اور افضل خاں سپرنٹنڈنٹ سے باتیں کیں۔ سندھ آنا دو سبب سے ہوا۔ ایک تو کچھ قرضہ لیا ہوا تھا وہ واپس کرنا تھا۔ وہ قرضہ ادا کیا اور دوسرا بلوچستان کے راستے کوئٹہ پہنچنا تھا (24)۔

افغانستان میں داخلہ:

مولانا عبیداللہ سندھی بلوچستان سے گزر کر ۱۵ اگست ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کی نماز مغرب افغانستان کی سرحد پر پڑھی۔ کسی پاسپورٹ کے بغیر افغانستان میں داخل ہوئے اور ۱۵ اکتوبر کو کابل پہنچے۔

۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ میں افغانستان کی سیاسی و معاشی صورت حال:

اس دور میں افغانستان کا حکمران امیر حبیب اللہ تھا۔ یہ بہت ذہین آدمی تھا۔ جدید تہذیب و تعلیم کو بہت پسند کرتا تھا۔ مگر اخلاقی لحاظ سے کمزور تھا۔ انگریزی وظیفے وصول کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے افغانستان کی خارجہ پالیسی برطانیہ کے ماتحت تھی۔ پورا ملک جاگیرداری سسٹم میں جکڑا ہوا تھا۔ جدید ترقی نام کو نہ تھی۔ صرف کابل شہر کے قریب ایک بجلی گھر تھا۔ جو کہ شاہی محلات اور چند کارخانوں کی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ پورے ملک میں چند موٹر گاڑیاں تھیں جو کہ شاہی خاندان کے استعمال میں تھیں۔ تار برقی کا نام بھی موجود تھا جو کہ صرف بڑے بڑے شہروں کے درمیان کام کرتا تھا۔ کابل میں جدید تعلیم کا ایک کالج قائم تھا۔ جس کا نام حبیبیہ کالج تھا۔ اس کو ہندوستان سے گئے ہوئے مسلمان اور انگریز چلاتے تھے۔

امیر صاحب کا چھوٹا بھائی سردار نصر اللہ خاں ولی عہد تھا۔ یہ شخص انگریزوں کا سخت دشمن تھا۔ اور افغانستان سے انگریزوں کو نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے مولانا سندھی کے کام میں بڑی مدد کی۔ انگریز اس کو ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے انگریز اور امیر حبیب اللہ چاہتے تھے۔ سردار نصر اللہ کی بجائے امیر صاحب کے بڑے لڑکے سردار عنایت اللہ کو ولی عہد مقرر کیا جائے۔ سردار عنایت اللہ ایک سادہ مزاج آدمی تھا۔ اور سیاست سے دور رہتا تھا۔

امیر افغانستان کی بیوی علیا حضرت ایک ذہین اور سیاسی مزاج رکھنے والی خاتون تھیں۔ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ علیا حضرت کے والد بہت زیادہ سیاسی طاقت کے مالک تھے۔ امیر حبیب اللہ کو حکومت دلوانے والے بھی یہی تھے۔ اس کے علاوہ علیا حضرت کے بھائی سردار خاں فوجوں کا کمانڈر انچیف اور باقی رشتہ دار بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔

امیر حبیب اللہ سے مولانا سندھی کی ملاقات:

مولانا سندھی کو کابل آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس دوران آپ نے شہزادوں اور بڑے بڑے عہدداروں سے ملاقاتیں کرلی تھیں۔ ان لوگوں کو آپ نے اپنے نقطہ نظر سے کسی حد تک متفق کرلیا تھا۔ اس کام میں حضرت شیخ الہند اور حضرت گنگوہی کے شاگردوں نے مولانا سندھی سے بہت تعاون کیا۔ امیر حبیب اللہ پیر کے دن ٹینس کھیلنے کلب جایا کرتے تھے جو کہ شہر سے باہر واقع تھا۔ ایک دن مولانا سندھی افغانی لباس زیب تن کر کے راستے کے قریب کھڑے ہو گئے۔ جہاں سے حبیب اللہ کی گاڑی گزرتی تھی۔ امیر حبیب اللہ نے مولانا کو دیکھ کر اپنے مصاحبوں سے پوچھا کہ یہ سفید پوش آدمی کون ہے؟ انہوں نے جب مولانا کا تعارف کرایا تو امیر حبیب اللہ نے مولانا سندھی کو کھانے پر مدعو کیا۔ امیر صاحب مولانا صاحب سے بڑے تپاک سے ملے اور اپنے برابر والی کرسی پر بٹھایا۔ دونوں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ امیر حبیب اللہ نے مولانا کو افغانستان میں رہ کر کام کرنے کی اجازت دی۔ اور مشورہ دیا کہ عالم اسلام کی بجائے ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کریں اور مولانا کو افغانستان کی شہریت بھی دے دی(25)۔

مولانا سندھی ذاتی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

دسمبر ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کے اوّل ہفتہ میں ایک دن سردار نصر اللہ خاں نے مجھے اپنے قصر زین العمارہ میں بلایا۔ اور عصر کے بعد اعلیٰ حضرت (امیر افغانستان) تشریف لائے۔ کوئی آدمی ساتھ نہ تھا۔ اس جگہ صرف دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ جس میں سے ایک پر اعلیٰ حضرت اور دوسری کرسی پر میں بیٹھ گیا۔ امیر حبیب اللہ نے فرمایا کہ ہندوستانی کام کرتے رہو (26)۔

امیر حبیب اللہ کو اتحاد اسلام کے کام سے زیادہ مرغوب نیشنل کام تھا۔ مولانا سندھی اتحاد عالم اسلام کے خیال سے ہندوستان سے نکلے تھے۔ مگر اب ان کا نظریہ حسب الحکم امیر کابل بدل گیا۔ اور مولانا نے ہندوستان کی آزادی کے لیے کوششوں کا آغاز کیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی گورنر قندھار سے ملاقات:

کابل سے مولانا سندھی قندھار تشریف لے گئے اس وقت سردار محمد یوسف خاں قندھار کے نائب الحکومت تھے۔ قندھار میں جتنے علماء تھے وہ ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ اس وقت قندھار کے گورنر محمد یونس خاں تھے۔ جو بہت بڑے عالم اور درویش منش تھے۔ انہوں نے اپنی نظر بندی کے ایام ہندوستان میں گزارے تھے۔ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید و معتقد تھے۔ جب ملا حسن نے ان کو جا کر خبر دی کہ دیوبند کے دو عالم قندھار میں آئے ہیں۔ اور میرے پاس مہمان ہیں۔ تو گورنر اپنے بیٹے کے ساتھ ہماری ملاقات کے لیے آئے پھر ایک دن یہ ساری جماعت گورنر سے ملاقات کے لیے گئی۔ گورنر صاحب دربار میں تھے۔ بڑی عزت سے بٹھایا اور خوش ہو کر فرمایا کہ ہم آپ کی ہجرت منظور کر کے آپ کو نیشنل سرٹیفکیٹ دیں گے۔ نیشنل سرٹیفکیٹ مل جانے پر آپ جماعت افغانی ملت کے فرد بن گئے (27)۔

کابل میں ہندوستانی مشن کی آمد:

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء/۱۳۳۲ھ میں شروع ہوئی۔ اس جنگ میں جرمن اور سلطنت عثمانیہ ایک طرف اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، امریکہ اور روس تھے۔ چند ایک یورپین ملکوں نے روس کا ساتھ دیا اور اکثر نے امریکہ اور برطانیہ کا ساتھ دیا۔ جنگ کے شروع میں جرمن اور ترکوں کو بڑی بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اس دوران پورے یورپ میں پھیلے ہوئے آزادی پسند ہندوستانی برلن میں جمع ہونا شروع ہو گئے اور انڈین نیشنل پارٹی کی بنیاد رکھی (28)۔ راجہ مہندر پرتاپ اس کے صدر اور مولوی برکت اللہ اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انڈین نیشنل پارٹی نے منصوبہ بنایا کہ جرمن کی مدد سے افغانستان کے راستے سے ہندوستان پر حملہ کر دیا جائے اور ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔ ان لوگوں نے جرمن کے ساتھ مذاکرات کیے۔ جرمنوں نے کہا کہ پہلے آپ افغانستان کو اس بات پر آمادہ کریں۔ چنانچہ ایک وفد تشکیل دیا گیا۔ جس میں ہندوستانیوں کے علاوہ جرمن بھی شامل تھے۔ یہ لوگ مولانا سندھی کی آمد سے پہلے ہی کابل پہنچ چکے تھے، مولانا نے اس مشن کے ارکان سے بھی ملاقاتیں کیں (29)۔

چونکہ یہ مشن جو کابل آیا تھا اس میں جرمن اور ہندوستانی ممبران شامل تھے۔ ان کے درمیان بہت زیادہ اختلاف بھی پایا

جاتا تھا۔اس کے بارے میں ظفر حسن لکھتے ہیں" راجہ مہندر پرتاب کا مقصد بحیثیت پریذیڈنٹ ہند (ہند، جرمن، ترک) مشن کچھ اور ہی تھا۔ وہ ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہاں ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ مولانا برکت اللہ مرحوم ہندوستان سے دور رہنے کی وجہ سے وہاں کے تازہ حالات اور مسلمانوں کی اہمیت سے بے خبر تھے۔اس لیے وہ ہر بات میں راجہ صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ جرمن نمائندے بھی راجہ صاحب کی قابلیت کے قائل ہونے کی وجہ سے انہی کی نکتہ نظر کی تائید کیا کرتے تھے۔لیکن مولانا سندھی سے مل کر جرمن اور آسٹرین نمائندوں کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ راجہ صاحب نے برلن میں جرمن گورنمنٹ کو ہندوستان کے موجودہ حالات اور اس کے مستقبل کے متعلق کہا تھا۔ وہ حقیقت سے دور ہے اور اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ان کو آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود اور ان کی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا (30)۔

مولانا سندھی اپنی ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی مشن کا مقصد جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا کہ جرمن اور ترکی اتحاد میں افغانستان شمولیت کا قصد کرے۔اور اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے" (31)۔

حکومت مؤقتہ ہند کا قیام:

راجہ مہندر پرتاپ اور مولوی برکت اللہ کے ساتھیوں نے کابل میں حکومت مؤقتہ ہند (جلا وطن حکومت) کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کام شروع کر دیا۔ بعد میں مولانا سندھی بھی اس عبوری حکومت میں شامل ہو گئے۔ راجہ مہندر پرتاپ صدر، مولوی برکت اللہ اس کے وزیراعظم اور مولانا سندھی وزیر امور ہند مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد راجہ صاحب سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ان کے جانے کے بعد مولانا سندھی اس کے صدر مقرر ہوئے۔ مولانا سندھی نے اس عبوری حکومت میں اپنا اہم رول ادا کیا۔عبوری حکومت کے قیام کا مقصد ہندوستان کی کامل آزادی تھا۔مگر پہلے مرحلے میں ماورائے سندھ کا علاقہ فتح کرنا تھا۔ جس میں صوبہ پنجاب، سندھ، بلوچستان، کشمیر اور سرحد وغیرہ شامل تھے۔ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد باقی ہندوستان کو فتح کرنا طے پایا۔

اس مقصد کے لیے روس، جرمن اور ترکی وغیرہ سے امداد طلب کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ان ممالک سے رابطہ کے لیے مختلف سفارتی وفود بھیجے گئے۔اس مقصد کے لیے جو وفد روانہ ہونے کے لیے تیار ہوا۔ راجہ مہندر کی خواہش تھی کہ اس میں کچھ ہندوستانی مقیم کابل جوان بھی شامل ہوں۔ مولانا سندھی کے ساتھ بہت سے نوجوان تھے۔ان میں مسلم بھی تھے اور سکھ بھی۔ یہ سکھ نوجوان غدر پارٹی کے ممبر تھے اور ہندوستان سے بھاگ کر افغانستان میں داخل ہو گئے تھے۔ راجہ مہندر کی تجویز یہ تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو اسی روسی مشن پر ساتھ بھیجا جائے۔ مولانا برکت اللہ نے اس کی تائید کی۔ مولانا سندھی نے اس میں ترمیم پیش کی کہ اس مشن میں ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ ایک نوجوان مسلمان بھی ہونا چاہیے۔اس کو راجہ نے پسند نہیں کیا۔لیکن کافی بحث و تمحیص کے بعد ڈاکٹر خوشی محمد☆ کو منتخب کر لیا گیا کہ یہ آدمی اس مشن میں ساتھ جائے گا۔اس مشن میں اس کا نام محمد علی تجویز کیا گیا

☆ ڈاکٹر خوشی محمد۔۔۔ یہ نوجوان جالندھر کا رہنے والا تھا۔میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم حاصل کر چکا تھا۔نوجوانوں کی ہجرت کی تحریک کا لیڈر تھا۔اس کا نام مشن کے لیے محمد علی تجویز کیا گیا۔

مولانا ذاتی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

میری جس قدر کامیابی افغانستان اور اس کے بعد روس میں مانی جاسکتی ہے۔اس میں مرزا محمد علی کی محنت و ہمت کا حصہ غالب ہے۔اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ مل جاتا تو شاید میں کوئی بڑا کام نہ کرسکتا(32)۔

عالمی جنگ اس وقت زوروں پر تھی۔ایک طرف جرمن اور ترک فوجیں جبکہ دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس اور امریکہ کی فوجیں لڑ رہی تھی: روس میں اس وقت زارشاہی کی حکومت تھی۔روسی فوجیں جرمنوں سے بری طرح پٹ رہی تھیں۔ روس نے برطانیہ سے مدد مانگی۔برطانیہ نے معذرت کی کہ آپ تک امداد پہنچنے کا کوئی راستہ محفوظ نہیں ہے۔مسلسل شکستوں کے بعد روسی فوجوں میں بددلی پھیل رہی تھی۔ان حالات میں حکومت مؤقتہ ہند نے ڈاکٹر خوشی محمد اور ڈاکٹر متھرا سنگھ پر مشتمل دورکنی وفد ۱۹۱۶ء میں روس کی طرف بھیجا۔اس وفد کی روانگی ولی عہد افغانستان سردار نصر اللہ کی زیر نگرانی ہوئی۔وفد کی روانگی کو امیر حبیب اللہ سے خفیہ رکھا گیا۔

جب ہندوستانی مشن روس کی طرف جانے لگا۔تو راجہ مہندر کو مولانا سندھی نے مشورہ دیا کہ میں آپ کو ایک مسودہ بھیجوں گا۔اس کا مضمون انگریزی میں ترجمہ کر کے ایک سونے کی تختی پر کندہ کروا کے چاندی کے صندوق میں بند کر کے روس بھیجو۔جو مسودہ دیا گیا اس میں زار روس کے لیے بڑے بڑے القابات لکھے اور سچی ہمدردی ظاہر کی۔اور کہا کہ ہماری حکومت موقتہ ہند آپ سے ہمدردی رکھتی ہے۔انگریزوں کو آپ سے بغض و حسد ہے۔آپ کو طاقتور دیکھنا نہیں چاہتے۔لطف کی بات یہ ہے کہ جب یہ لوگ مسودہ انگریزی ترجمہ کرنے کے لیے بیٹھے تو ان کے پاس انگریزی لکھنے والوں کا فقدان تھا۔پھر دو نوجوان جو انگریزی جانتے تھے وہ ہمارے ساتھ تھے۔انہوں نے صاف کہہ دیا کہ عبید اللہ سے اجازت لو۔آخر مولانا نے اجازت دے دی اور یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔حکومت مؤقتہ نے اس خط کے ذریعے انگریزوں اور روسیوں کے درمیان بدظنی پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ ہندوستان پر حملہ کے وقت روس پیچھے سے افغانستان پر حملہ نہ کردے۔

یہ وفد دریائے آمو عبور کر کے تاشقند میں داخل ہوا۔تاشقند کے گورنر نے زار کو خطوط اور سونے کی پلیٹ کے بارہ میں آگاہ کیا۔انگریزوں کو بھی اس وفد کی اطلاع مل چکی تھی۔انگریزوں نے زار کو پیغام بھیجا کہ آپ اس وفد کے ارکان کو گرفتار کر لیں۔لیکن تاشقند کے گورنر نے وفد کے ارکان کو گرفتار کرنے کی بجائے انہیں افغانستان واپس بھیج دیا اور وفد بخیر و عافیت واپس افغانستان پہنچ گیا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کا خط انقلاب روس کا پیش خیمہ:

مولانا سندھی کے خط نے انقلاب روس کے برپا ہونے میں اہم کردار ادا کیا۔معاملہ یہ ہوا کہ جب گورنر نے اس مشن کے مسودے کو پڑھا۔وہ مسودہ کیمونسٹ انقلابیوں کے ہاتھ آگیا۔انہوں نے اس مسودے کو ایک کتابچے کی صورت میں چھاپ کر ساری فوج میں تقسیم کیا۔اس سے فوج بڑی متاثر ہوئی اور میدان جنگ چھوڑ کر ماسکو کی طرف بھاگ گئی۔ جب برطانیہ کو اطلاع ہوئی۔تو لارڈ کچز کو جو اس وقت ساری فوج کا فیلڈ مارشل تھا اس کو ماسکو بھیجا۔تاکہ یہ غلط فہمی دور کرے۔لیکن جرمنوں نے

اس کے جہاز کو راستے ہی میں تباہ کر دیا اور لارڈ کچز مر گیا۔

مولانا سندھی کے خلاف انگریزوں نے بہت احتجاج کیا۔اس کا اثر مولانا سندھی پر بھی پڑا۔لیکن مولانا سندھی نے امیر حبیب اللہ سے کہا کہ تم نے جو ہم مسلمانوں سے بیعت نامے لیے ہیں۔وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ آپ ہندوستان پر حملہ کر دیں۔افغانستان کے تمام بڑے بڑے سرداروں اور مشہور علماء نے بھی امیر حبیب اللہ سے التجا کی کہ ہم اور صبر نہیں کر سکتے تو جرگہ بلایا گیا۔اس سے مشورہ لیا گیا کہ جنگ کی جائے یا نہیں۔تو عوام نے کہا جنگ کی جائے صرف ایک سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت نے کہا کہ ہمیں جنگ نہیں کرنی چاہیے۔امیر صاحب حیران رہ گئے۔

جنود اللہ کا قیام:

کابل میں ایک جماعت جنود اللہ کے نام سے بنائی گئی۔اس جماعت میں وہ افراد شامل تھے جن پر مولانا سندھی کو مکمل اعتماد تھا۔لہذا ان افراد کے متعلق کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔مولانا سندھی ذاتی ڈائری میں تحریر فرماتے ہیں:

جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارۃ المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے۔جو تین سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے۔انہیں ہم نے علیحدہ کر دیا۔ان میں شیخ محمد ابراہیم اور محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔اس عرصہ میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے پہنچ گئے۔جن میں مولانا منصور (۱)،مولانا سیف الرحمٰن (۲)،حاجی ترنگ زئی (۳)،مولانا محمد بشیر (۴)۔ان لوگوں کے مشورہ سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی جسے جنود اللہ کا نام دیا گیا۔اس میں اگر عسکریت تھی تو اسی قدر جتنی سالوشن آرمی میں موجود ہے۔اس نظام کے ذریعہ ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دور کر سکے (33)۔

تحریک ریشمی رومال:

اس تحریک کے لیے پانچ ملکوں میں کام کیا گیا جن میں چین، جاپان، برما، فرانس اور امریکہ شامل ہیں۔یہ تحریک بہت طویل تھی۔اس تحریک کیلئے دس منصوبے بنائے گئے۔اس منصوبہ بندی کے بعد ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کو انقلاب برپا کرنا تھا۔دس منصوبہ جات کا اجمالی خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اقوام عالم سے اخلاقی امداد کا حصول۔

۲۔ جاپانی مشن۔

۳۔ فرانسیسی مشن و امریکی مشن۔

۴۔ جنگی نقشوں کی تیاری۔

۵۔ عارضی حکومت کا اجمالی خاکہ۔

۶۔ اندرون ملک مراکز بغاوت کا قیام۔

۷۔ بیرونِ ملک امدادی مراکز کا قیام۔

۸۔ دوسری حکومتوں کو ترکی کا حمایتی بنانا۔

۹۔ حملہ کرنے کے بعد راستوں کا تعین اور ان کا تحفظ۔

۱۰۔ ہندوستان کے اندرونی محاذوں پر بغاوت کا منصوبہ۔

آخری منصوبہ کا مقصد یہ تھا کہ جس وقت بیرونی حملہ ہو۔ اس وقت اندرونی محاذوں پر بغاوت شروع ہو جائے۔ اس مقصد کیلئے حضرت شیخ الہند نے سارے معاملات طے کر لیے۔ صرف افغان حکومت سے معاہدے کی آخری تاریخ طے کرنا باقی تھا کہ اگر افغانستان ہمیں راستہ دینے پر راضی ہو جائے تو افغانستان کے محاذوں والے حملوں کی تاریخ کا تعین کر کے ہمیں اطلاع دیں۔ تا کہ ہم اس تاریخ کو حملہ کا انتظام کریں اور حملہ سے صرف دس دن پہلے ہماری فوج افغانستان پہنچ جائیگی۔ اس ریشمی خط کے ذریعہ سے افغان حکومت سے معاہدہ کر کے افغانستان ہیڈ کوارٹر نے ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کی تاریخ کا تعین کر دیا تھا۔ یہ ریشمی خط مولانا شیخ الہند کو مدینہ منورہ میں ملنا تھا اور اس کے مطابق ترکی حکومت سے بات چیت کو آخری شکل دے کر ایک ماہ پہلے یکم جنوری ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کو کابل ہیڈ کوارٹر اطلاع دینی تھی۔ پھر کابل کے ہیڈ کوارٹر نے دہلی کو یکم فروری ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ تک حملے کی تاریخ سے مطلع کرنا تھا۔ اس کے بعد ۹ فروری کو ترکی فوجوں نے افغانستان پہنچنا تھا۔ اور پھر انیس فروری ۱۹۱۵ء/۱۳۳۳ھ کو حملہ کر دینا تھا۔ اور اسی تاریخ کو ہندوستان کے ہر محاذ نے اپنے اپنے علاقوں میں علم بغاوت بلند کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہند ابتداً مدینہ منورہ ٹھہر گئے۔ ارادہ یہی تھا کہ ترکی حکومت سے آخری بات چیت کر کے افغانستان جائیں گے۔ بعد میں جب کابل ہیڈ کوارٹر کے جواب ملنے سے مایوس ہو گئے تو سمجھ گئے کہ کوئی حادثہ پیش آ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز ریشمی خط پکڑ لینے کے بعد ہندوستان کے انقلابی لیڈروں کو ۱۹ فروری سے پہلے پہلے ہی گرفتار کر لیا (34)۔

تفصیل اس باب کے آخر میں دی گئی ہے۔

مولانا سندھی کی نظر بندی:

مولانا سندھی نے اپنے ساتھیوں کی فوجی تربیت کے لیے بھی انتظام کیا۔ اور ایک فوجی دستہ ترتیب دیا۔ اس فوج کو جدید

۱۔ مولانا منصور: جمعیۃ الانصار میں کام کر چکے تھے۔

۲۔ مولانا سیف الرحمٰن: دہلی سے یاغستان جاتے ہوئے کابل پہنچے۔ یہ قندھاری افغانی ہیں۔ انہوں نے مولانا گنگوہی سے حدیث پڑھی۔

۳۔ حاجی ترنگ زئی: ترنگ زئی چارسدہ ضلع پشاور میں موضع اتمان زئی کے قریب ایک گاؤں کے باشندہ ہیں۔
مولانا عبید اللہ سندھی کے علاوہ جن مشاہیر کو حضرت شیخ الہند نے اپنی تحریک میں ہم نوا اور ہم خیال بنایا ان میں سے نہایت سرگرم ممبر جناب حاجی ترنگ صاحب ہیں۔

۴۔ مولانا محمد بشیر: سرحد میں مجاہدین کی جماعت کے وکیل تھے جو لاہور کے اہل حدیث جماعت کے معزز رکن تھے اور ہجرت کر کے جماعت مجاہدین میں رہتے تھے۔

انداز سے استوار کیا گیا تا کہ مسلح جنگ میں حصہ لیا جا سکے۔اس فوج نے جنگ آزادی افغانستان میں بھی حصہ لیا۔

مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں کی سرگرمیوں سے انگریز بہت پریشان ہوئے۔اور انہوں نے امیر حبیب اللہ سے زبردست احتجاج کیا۔امیر حبیب اللہ مولانا کی سرگرمیوں سے لاعلم تھا۔وہ انگریزوں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔اس لیے اس نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کو ایک تنگ مکان میں نظر بند کر دیا۔لیکن شہزادوں اور کمانڈروں کی مداخلت پر بعد میں مولانا کو ایک باغ میں منتقل کر دیا گیا۔

امیر حبیب اللہ کا قتل:

ترک انگریزوں سے جنگ میں الجھ چکے تھے۔اس لیے ضروری تھا کہ افغانستان کی طرف سے فوراً جہاد کا اعلان کر کے ہندوستان پر حملہ کر دیا جائے۔مگر امیر افغانستان پر کوئی اثر نہ ہوا۔کیونکہ وہ انگریزوں سے معاہدہ کر چکے تھے۔معاہدہ اس طرح تھا کہ اگر والی افغانستان اس جنگ میں غیر جانبدار رہے تو انگریز حکومت ان کو تین کروڑ روپیہ دے گی۔اس لالچ میں امیر نے انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد نہ کیا۔

امیر حبیب اللہ کا عزت دار لوگوں کی بہو بیٹیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنا معمول بن چکا تھا۔بعض عورتوں نے عصمت دری کے بعد خودکشی کر لی۔اس دوران ترکوں کو شکست ہوئی اور ترکوں کی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔اس کے فوراً بعد امیر صاحب نے جمعہ کے خطبہ میں اپنے آپ کو امیر المومنین کہلوانا شروع کر دیا۔آخر کار قدرت نے اپنا انتقام لیا۔بارہ بجے رات کے قریب کسی نے امیر کو گولی سے ہلاک کر دیا۔گولی سر میں لگی تھی۔دربان نے آواز دی کہ امیر صاحب شہید ہو گئے۔دلی اور ہاشم ان کے نگہبان تھے اور ان کا خیمہ امیر کے قریب تھا۔وہ دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے دربان کو گولی مار دی (۱۹۱۹ء/ ۱۳۳۸ھ)۔اس سے امیر کا قاتل مخفی ہو گیا۔مولانا سندھی اس وقت مستوفی الممالک وزیر خزانہ کے ہاں نظر بند تھے (35)۔

امیر حبیب اللہ کی وفات کے بعد امان اللہ خاں ☆ کو بادشاہ بنایا گیا۔۱۹۱۹ء/ ۱۳۳۸ھ دن دو بجے امیر امان اللہ خاں کی بیعت ہوئی۔

امیر امان اللہ کی بیعت کے وقت بعض سرداروں نے مشورہ دیا کہ امیر حبیب اللہ کو اس لیے قتل کیا گیا ہے کہ وہ بہت عورتیں رکھتا تھا۔اب امیر امان اللہ جو امیر حبیب اللہ کا بیٹا ہے۔یہ بھی اپنے باپ کی تقلید کرے گا۔اوّل ان کو خصی کر دو پھر بادشاہ بناؤ۔دوم جو خصی ہونے پر راضی ہو گیا وہ بادشاہ بنایا جائے گا۔اس پر امیر امان اللہ خاں نے قسم کھائی کہ میری ایک عورت ہے۔اس سے علاوہ کوئی اور عورت نہیں کروں گا۔اس وقت امیر امان اللہ خاں کے گلے میں قرآن مجید حمائل تھا۔اس قسم کے بعد بیعت شروع ہوئی۔غالب گمان ہے کہ وہ اپنی اس بات پر آخر وقت تک قائم رہا (36)۔

☆ میر امان اللہ (۱۸۹۲ء تا ۱۹۶۰ء) عہد حکومت ۱۹۱۹ء-۱۹۲۹ء کے بعد حکومت سے علیحدہ ہو کر روم چلے گئے اور آخری وقت تک وہیں مقیم رہے (شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، ص ۸۵)۔

مولانا سندھی کی رہائی:

امیر امان اللہ خاں نے حکومت سنبھالتے ہی پہلے دن مولانا سندھی اوران کے ساتھیوں کی رہائی کا اعلان کر دیا جب امیر امان اللہ شہزادے تھے تو ان کی ملاقات مولانا سے ہوئی۔ حضرت سندھی فرماتے ہیں کہ "میں نے اس وقت امان اللہ کو ایسے مخاطب کیا جیسے وہ ولی عہد ہوں" (37)۔

اس کے بعد امیر امان اللہ نے ہمیں بلایا۔ جب ہم حاضر ہوئے تو انہوں نے کہا (من ہموں ہستم) میں وہی ہوں یعنی اس ملاقات کی طرف اشارہ تھا۔ جس میں مولانا نے امان اللہ کو ولی عہد کی طرح مخاطب کیا تھا۔

امیر امان اللہ پر مولانا سندھی کا اعتماد:

امیر امان اللہ نے بادشاہ بنتے ہی افغانستان کی آزادی اور استقلال کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ اس سے پہلے افغانستان کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ برطانیہ کی رضامندی کے بغیر کسی سے خارجہ تعلقات بنائے۔ امیر امان اللہ کے متعلق مولانا سندھی ارشاد فرماتے ہیں: جس طرح وہ اپنے وزراء کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ان کا معاملہ اس کے قریب قریب تھا۔ ہم ان کی پرائیویٹ مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ ہم سے ان کا برتاؤ بھی اس طرح کا ہوتا تھا۔ ہم نے کوئی مشورہ ایسا عرض نہیں کیا۔ جو قبول نہ فرماتا ہو۔ ہم نے کوئی سفارش ایسی نہیں کی جو رد کر دی گئی ہو۔ اس حالت میں ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا۔ ہم نے سلطنت افغانستان کو مستقل و مستحکم بنانے میں کیا (38)۔

امیر امان اللہ کی شیخ الہند سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ حضرت کی وفات (۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ) پر مجلس قرآن خوانی کرائی اور اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا: مولانا محمود الحسنؒ یک کار را شروع کروند من او را تکمیل میکنم یعنی مولانا محمود حسن نے جو کام شروع کیا تھا۔ میں اس کو پورا کروں گا (39)۔

مولانا سندھی کو وزیر اعظم بننے کی پیش کش:

امیر امان اللہ نے پہلی یا دوسری ملاقات میں مولانا سندھی سے کہا کہ میں آپ کو وزیر اعظم بنانا چاہتا ہوں۔ اس کا جواب جو مولانا نے دیا۔ انہی کی زبانی سنیے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"بیعت کے چند دن بعد مجھے بلایا اور کہا کہ میں آپ کو بڑا وزیر بنانا چاہتا ہوں۔ میں نے جواباً عرض کیا یہ عہدہ کسی افغانی کو دیا جائے۔ پھر وہ جو مشورہ لے گا میں دوں گا۔ میں کسی منصب یا عہدہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں وزیر اعظم بن گیا تو افغانی سرداروں میں ناراضگی پھیل جائے گی۔ جو مصلحت اور خیر خواہی افغانستان کے استحکام کے متعلق ہوگی۔ آپ کی خدمت میں عرض کرتا رہوں گا۔ اور جو وزیر اعظم بنایا جائے گا۔ اسے بھی مشورہ دیتا رہوں گا۔ تو امیر امان اللہ اس بات سے بہت خوش ہوئے (40)۔

اس وقت تک عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ تاہم انگریزی فوجیں ابھی تک یورپ اور افریقہ میں موجود تھیں۔ اور

ہندوستان تقریباً خالی تھا اور افغانستان سے حملہ کر دیا گیا جس کا مقابلہ کرنا انگریزوں کے مشکل ہو گیا۔ انگریزوں نے افغان حکومت کو مذاکرات کی دعوت دی۔ تقریباً ایک سال تک مذاکرات ہوتے رہے۔ مذاکرات میں طے پایا:

ا۔ افغانستان کی آزادی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

۲۔ جنگ بند کی جاتی ہے۔

۳۔ ہندوستان کو دس سال کے اندر سیلف گورنمنٹ (خودمختاری) دی جائے گی (41)۔

انگریز حکومت کے ساتھ مذاکرات میں محمود طرزی نے جو کہ وزیر خارجہ تھا افغانستان کی طرف سے اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ یہ انگریز کی طرف مائل تھا اور مولانا کی سرگرمیوں سے انگریزوں کو آگاہ رکھتا تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد جب افغانستان کو آزادی مل گئی تو امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں سے کہا کہ انگریزی گورنمنٹ نے امیر حبیب اللہ خاں سے وعدہ کیا تھا کہ اس جنگ میں تم غیر جانبدار رہو تو ہم تین کروڑ پاؤنڈ افغانستان کو دیں گے۔ انگریزوں نے کہا کہ تم نے ہم سے جنگ کی ہے۔ تو ہم نے تمہاری آزادی تسلیم کر لی۔ ہم کچھ نہ دیں گے۔ اس پر امیر امان اللہ خاں نے کہا کہ جب تک جنگ عظیم شروع رہی افغانستان غیر جانبدار رہا۔ اس طرح یہ جھگڑا چلتا رہا۔ آخر انگریزوں نے ایک شرط پر تاوان دینا قبول کر لیا کہ مولانا سندھی کو سیاسی تحریک سے علیحدہ کر دو۔ اور اپنے ملک سے نکال دو۔ امیر امان اللہ نے مولانا سندھی سے کہا کہ اب اپنا کام بند کر دو کیونکہ میں نے انگریزوں سے معاہدہ کر لیا ہے (42)۔

انگریزوں کا اعتراف:

جب افغانستان کے جشن آزادی کی تیاری ہوئی تو اس جشن آزادی میں انگریزی نمائندہ بھی شامل ہوا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

''یہ آزادی افغانستان کی نہیں بلکہ مولانا عبید اللہ سندھی کی فتح ہے'' (43)۔

راجہ مہندر پرتاب کی امداد:

پہلی عالمی جنگ کے دوران راجہ صاحب افغانستان سے سوئٹزرلینڈ چلے گئے تھے۔ افغانستان کی آزادی کے بعد وہ واپس تشریف لائے تو مولانا سندھی سے عرض کیا کہ اگر میرے پاس تیس ہزار روپیہ ہوتا تو میں جا کر نیپال کو انگریزوں کے خلاف کر دیتا۔ مولانا سندھی نے یہ خواہش راجہ مہندر پرتاب کی امیر امان اللہ خاں کے روبرو پیش کی اور کہا کہ اگر اس ہندو نوجوان کی آرزو پوری کر دی جائے تو ہندوستان کے ہندو خوش ہو جائیں گے۔ مولانا سندھی نے راجہ مہندر کو امیر امان اللہ سے تیس ہزار روپے دلوا دیئے۔ راجہ مہندر نیپال روانہ ہو گیا۔ جب تین ماہ بعد واپس کابل آئے تو بتانے لگے میں جب نیپال کی سرحد پر پہنچا تو وزیر اعظم نیپال نے کہا کہ اگر آپ نیپال میں داخل ہوئے تو آپ کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دوں گا۔ اس لیے میں واپس چلا آیا۔ بعد میں راجہ مہندر ہندوؤں کو بزدل، بے غیرت اور بہت کچھ کہتے رہے (44)۔

ترکی کی آزادی میں مولانا سندھی کا کردار:

ترکی کی شکست کے بعد یورپین اتحادی طاقتوں کے نمائندے لوزان (سوئٹزرلینڈ) میں اکٹھے ہوئے۔ تاکہ ترکی کے متعلق سوچ وبچار کیا جائے۔ اس کانفرنس میں انہوں نے یہ سوچا کہ ترکی کو ٹرسٹی اسٹیٹ بنا دیا جائے۔ یعنی اتحادیوں کی نیم خودمختار ریاست۔ اس کی اطلاع امیر امان اللہ خاں کو ملی۔ وہ بہت پریشان ہوئے اور مولانا سندھی کو بلا کر تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ اور کہا کہ اگر ترکی حکومت یورپ کی غلامی میں چلی گئی تو افغانستان کو انگریزوں کے تسلط سے بچانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لیکن مولانا سندھی نے فرمایا کہ ترکی کو غلامی سے بچایا جا سکتا ہے اور مولانا سندھی نے اس بارے میں مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں مولانا سندھی نے بتایا کہ:

''جن دنوں افغان صلح کا وفد دہلی میں تھا۔ اس وقت لوزان کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس میں یہ تجویز زیر بحث تھی کہ ترکی کو حکم برادری یعنی نیم خودمختاری کے تحت ریاست میں لایا جائے۔ اس پر تمام چھوٹی بڑی سلطنتیں متحد ہو گئیں۔ دراصل یہ تجویز برطانیہ کی تھی۔ خیر رات کو امیر امان اللہ خاں نے مجھے بلایا میں گیا۔ تو دیکھا کہ بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ مجھے کہا کہ روسی ذریعہ سے یہ خبر پہنچی ہے کہ لوزان کانفرنس میں یہ تجویز پیش ہے کہ ترکوں کی آزادی سلب کر لی جائے۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ میں نے کہا کہ تین خط لکھو۔ ایک جاپان کے بادشاہ کو۔ دوسرا اٹلی کے صدر کو اور تیسرا فرانس کے صدر کے نام۔ کہ اگر ترکی کی سلطنت کو جس کا صدر مصطفیٰ کمال پاشا ہے حکم برادری میں لا کر اس کی آزادی صلب کی گئی اور اس سے کوئی بڑی جنگ ہوئی تو آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ ان تینوں خطوط کو امیر امان اللہ نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور لنانے پر بھی اپنا نام لکھا۔ ڈاک بھیجنے کا راستہ صرف ہندوستان تھا۔ بہر حال ڈاک انگریز قونصل جنرل کے حوالے کر دی گئی۔ اس نے تینوں خطوط وائسرائے ہند کے پاس بھیج دیئے۔ وائسرائے نے ان خطوط کو پڑھا۔ تو فوراً وزیر اعظم انگلستان کو اطلاع دی اور تینوں خطوط کی نقول وزیر اعظم کو بھیجیں۔ جس سے وہ بہت ڈرا۔ کیونکہ ان کو علم تھا کہ روس نے افغانستان کو ایک لاکھ فوج دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ وزیر اعظم برطانیہ لائیڈ جارج بذریعہ ہوائی جہاز لوزان پہنچ گیا اور کہا کہ ترکی کو آزاد کر دو اور ترک وزیر سے کہا کہ کسی یورپی ملک کا قانون لے لو۔ تاکہ ہم تمہیں آزاد کر دیں۔ چنانچہ ترکی نے سوئزرلینڈ کا قانون لے کر آزادی حاصل کر لی (45)۔

کابل میں یونیورسٹی کے لیے کوششیں:

برطانیہ اور افغان حکومت کے درمیان معاہدہ طے پا گیا کہ مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں پر پابندی لگا دی جائے تو پابندی کے بعد مولانا سندھی نے سوچا کہ سیاسی کام پر تو پابندی ہے۔ اب علمی کام شروع کیا جائے۔

اس کام کے لیے مولانا سندھی کو افغان حکومت کے سپہ سالار نادر خاں نے ایک قطعہ بھی عنایت فرمایا۔ اس پر ظفر حسن نے ایک سکول قائم کیا اور کلاسیں شروع کر دیں۔ انگریزوں کو یہ بات بھی اچھی نہ لگی اور انہوں نے سازش کر کے سکول بند کروا دیا۔ افغان حکومت تو پہلے ٹال مٹول کرتی رہی جیسے ہی افغان حکومت اور انگریزوں کا معاہدہ طے پا گیا۔ افغان حکومت نے

یونیورسٹی کے قیام کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا(46)۔

مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں کے لیے افغانستان میں کام کرنا مشکل ہو گیا۔اب دو صورتیں تھیں کہ یا تو مولانا بے دست و پا افغانستان میں بیٹھے رہیں۔ یا پھر اس ملک سے کہیں اور چلے جائیں اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کریں اور فیصلہ کیا کہ ترکی پہنچ کر ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کیا جائے۔اس وقت ترکی جانے کے صرف دو ہی راستے تھے۔ایک ایران سے دوسرا روس سے۔ایران میں اس وقت انگریز فوج موجود تھی۔اس لیے روس کے راستے ترکی جانے کا فیصلہ کیا گیا۔

ماسکو:

امان اللہ کے حکومت کے دوران حکومت افغانستان نے ایک اور مشن غلام بچہ محمد ولی خاں کی رہنمائی میں ماسکو کی گورنمنٹ کے ساتھ سیاسی تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے بھیجا(47)۔مولانا نے اپنا بھتیجا عزیز احمد وفد کے ساتھ بھیجا۔جس نے بعد میں یونیورسٹی آف ایشیائی ٹائلرز ماسکو میں پڑھائی کے لیے داخلہ لیا(48)۔

۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ کے شروع میں مولانا نے تیسری مرتبہ خوشی محمد کو روس بھیجا۔۱۹۱۷ء/۱۳۳۶ھ میں عظیم بولشکو انقلاب کے بعد حالات مکمل طور پر تبدیل ہو چکے تھے۔حکومت کزر کو معزول کر دیا گیا اور برطانوی حکومت کے ساتھ اتحاد غالب آ گیا تھا۔ روس اب برطانوی حکومت کے خلاف ہو گیا تھا۔اسی طرح مولانا سندھی انڈیا کی تحریک آزادی کی مدد کے سلسلہ میں اس حکومت کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔اس مقصد کے لیے مولانا نے خوشی محمد کو تاشقند بھیجا(49)۔ جہاں پر بالسیکو حکومت نے ایک مشرقی یونیورسٹی ایشیائی باشندوں کو اس شہنشاہیت کی طاقتوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے تربیت دینے کے لیے کھولی اور ان میں بالشیکوں تخلیلات کو ان کے ذہنوں میں ڈالا۔اس یونیورسٹی کے ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کا انچارج افسر ایک بنگالی ہندو تھا۔جس کا نام ایم۔این رائے تھا(50)۔

میر ندرا ناتھ بھٹہ چاریہ روس میں ہندوستانی ثقافت کا صدر تھا۔خوشی محمد سب سے پہلے اس سے ملا۔اور پھر وہ ماسکو چلا گیا جہاں وہ کیمونسٹ پارٹی کے رہنماؤں سے ملا۔یہاں اس نے کیمونسٹ لٹریچر پڑھا۔جس نے اس کو متاثر کیا اور وہ کیمونسٹ پارٹی کا ممبر بن گیا۔پھر وہ کابل واپس چلا گیا۔اس میں کابل روسی سفارت خانے کے ساتھ رابطہ رکھنے کی ہدایت کی گئی۔اور اس سے رقم لینے کا کہا گیا۔جب بھی مولانا سندھی کو اپنے مشن کے لیے اس کی ضرورت پڑی(51)۔

مولانا نے اپنی پارٹی کے ۹ ساتھیوں کے ساتھ کابل کو خدا حافظ کہا اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۲ء/۱۳۴۱ھ بروز اتوار کو روس کے سفر پر نکلے(52)۔

اس پارٹی میں ظفر حسن،خوشی محمد،اقبال شیدائی،عمر ظفر،عبدالرشید،عبدالعزیز،سیوا ناتھ بیر جی (ایک بنگالی ہندو حبیب اشک سکول کابل میں ریاضی کا استاد) شامل تھے(53)۔

سفر کے لیے راستہ حکومت افغانستان نے مقرر کیا تھا۔راستہ کو مقرر کرنے میں حکومت افغانستان نے کسی قسم کی سہولت نہ دی اور کوئی ہمدردی نہ دکھائی۔ بجائے اس کے کہ وہ کابل سے مزار شریف تک ہائی وے پر سفر کرتے جو کہ افغان،ترکی کے

درمیان راستہ تھا۔ انہیں کسی انجانے راستے پر سفر کرنے کا کہا گیا۔

سات دنوں کے مسلسل اور تھکا دینے والے پہاڑوں کے درمیان میں سے گزرنے والے سفر کے بعد وہ مزار شریف پہنچے۔ ۲۳ اکتوبر کو وہ دریائے آموAmu کے کنارے پہنچے۔ دریا عبور کرنے کے بعد وہ ایک قصبے Patakesar میں داخل ہوئے جہاں پر روسیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ پٹیا کسار سے انہیں ریل کے ذریعہ بخارا اور تاشقند سے ہوتے ہوئے ماسکو پہنچنا تھا۔ لیکن جب وہ دریائے ایموں پر پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ ریل کی لائن ترکی انقلابیوں نے تباہ کر دی ہے۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ پہلے قصبہ کارچی (Qarch) جاتے جو کہ وہاں سے تین یا چار دنوں کے فاصلے پر تھا (54)۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۲۳ء/۱۳۴۲ھ کو پارٹی نے دوبارہ پٹیاک سے اپنا سفر شروع کیا۔ انہوں نے اپنے ساتھ تین دنوں کا کھانے پینے کا سامان لے لیا جو کہ ان کے خیال کے مطابق Qarch تک پہنچنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن جب کشتی کی رفتار کم رہی تو انہیں پتہ چلا کہ یہ سفر چھ دنوں پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ تو مولانا نے ظفر حسن کو خوراک بانٹنے پر لگا دیا۔ وہ Qarchi سات دنوں کے بعد پہنچے۔ انہوں نے وہاں ایک اپنی گھوڑا گاڑی میں سامان لادا اور صحرا میں دو گھنٹے سفر کرنے کے بعد وہ Qarchi ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ ان سے ریاستی مہمانوں کی طرح سلوک کیا گیا۔ اور II Class کے ڈبوں میں بر تھ مل گئے۔ ہر کمپارٹمنٹ میں چار آدمی آسکتے تھے (55)۔

مولانا سندھی، ظفر حسن، ڈاکٹر نور محمد اور عزیز احمد ایک ڈبے میں اکٹھے رہے۔ ریل میں ایک دن اور دو راتیں گزارنے کے بعد وہ بخارا پہنچے۔ جہاں انہیں ایک گھر میں حکومت بخارا کے سرکاری مہمانوں کے طور پر ٹھہرایا گیا۔ انہوں نے وہاں دو دن قیام کیا (56)۔

بخارا میں قیام کے دوران خوشی محمد نے مولانا کو روس میں سیاسی حالات کے بارے میں بڑے اعتماد سے بتایا اور انہیں نصیحت کی کہ وہ اپنے مستقبل کا سیاسی پروگرام اس کی رہنمائی میں طے کریں جو کمیونسٹ پارٹی کے اصولوں کے مطابق ہو۔ اس نے بتایا کہ روس میں کمیونسٹ پارٹی کی مدد کے بغیر انہیں خوراک بھی نہیں ملے گی اور ایک مذہبی رہنما کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے عام پیروکار روس میں ان کی حمایت کے بغیر قیام کریں اور خوشی محمد کی یہ نصیحت مولانا کو پسند نہ آئی۔ بخارا سے وہ تاشقند پہنچے۔ جہاں وہ ایک دن قیام کرنے کے بعد ماسکو کے لیے آگے بڑھے۔ وہاں انہیں ریلوے کے کرائے اور خوراک کے لیے حکومت روس نے انہیں رقم فراہم کی۔ ایک ہفتہ کی مسافت کے بعد ۱۰ نومبر ۱۹۲۳ء/۱۳۴۲ھ کو وہ ماسکو پہنچے۔ اس طرح انہیں کابل سے ماسکو پہنچنے میں ۲۶ دن لگ گئے۔ انہیں لکس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور بعد میں ماسکو میں ایک کرائے کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔ یہ گھر حکومتی جائیداد تھا۔ یہ ہوٹل عام طور پر بیرونی کمیونسٹ اور بیرونی نیشنلسٹ جو کہ روسی حکومت کے مہمان ہوتے تھے۔ ان کو ٹھہرانے کے لیے کرایہ پر لیا جاتا تھا (57)۔

اس کے علاوہ روسی کمیونسٹ اور صوبائی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے اس ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ مولانا سندھی اور ان کی پارٹی کو ایک بڑا کمرہ دے دیا گیا۔ جس کے ساتھ کوئی باتھ روم منسلک نہ تھا۔ یہاں ماسکو میں اپنے کابل کے پرانے ساتھیوں

رحمت علی زکریا اور عبدالحمید☆ سے ملے۔ دونوں نے تاشقند کی مشرقی یونیورسٹی میں بطور طالب علم داخلہ لیا تھا۔ بعد ازاں یونیورسٹی کو ماسکو میں شفٹ کرنے کے بعد وہ بھی یہاں آ گئے تھے۔ عبدالحمید نے کمیونسٹ یونیورسٹی آف ایسٹرن ٹائگرز میں داخلہ لیا اور اس کا قیام یونیورسٹی ہوسٹل تھا۔ رحمت علی نے مولانا اور اس کی پارٹی کے ساتھ ہوٹل میں قیام کرنے کو ترجیح دی (58)۔

روسی حکومتی افسران اور بنگالی ہندو ایم اے رائے جو کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا صدر تھا۔ انہوں نے خوشی محمد کو مولانا سندھی کے پاس تجاویز دے کر بھیجا کہ وہ مشرقی ماسکو یونیورسٹی میں اپنی پارٹی کے چند ایک نوجوانوں کو داخلہ کے لیے بھیجیں۔ ان کا مقصد صرف کمیونسٹ پروپیگنڈہ تیار کرنا تھا۔ مولانا نے ظفر حسن کو یونیورسٹی کے لیے بھیجا۔ ظفر حسن کے متعلق جب اسے یونیورسٹی بھیجا گیا مولانا کے درج ذیل خیالات تھے:

۱۔ یہ جاننا کہ کمیونسٹ پارٹی کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ اور ہندوستان میں ایسا نظام متعارف کرانا جو ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے مرکز کا کردار ادا کرے۔

۲۔ اسلام کے دفاع کے لیے کچھ سکیمیں تیار کرنا۔

۳۔ برطانوی حکومت کو تباہ کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے کمیونسٹ پارٹی کی مدد (59)۔

مولانا سندھی کی ہدایات کے مطابق ظفر حسن نے ماسکو مشرقی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور لکس ہوٹل سے یونیورسٹی ہوسٹل میں منتقل ہو گئے (60)۔

شام میں ظفر حسن مولانا سندھی کو دن کے لیکچر کے بارے میں بتانے کے لیے لکس ہوٹل آتے۔ اس طرح ظفر حسن کے ذریعہ مولانا کمیونسٹ خیالات، کمیونسٹوں کے اصول، ان کی حکومت اور لیبر موومنٹ کے بارے میں بہت کچھ جان گئے تھے۔ کمیونزم کا لٹریچر پڑھنے اور مولانا سے بحث کرنے کے بعد اس نے یہ جانا کہ اس کے دل میں اسلام کے خلاف جذبات کیوں نہیں پیدا ہوئے۔ مولانا سندھی ایک مذہبی آدمی اور مذہب کے بارے میں بہت زیادہ علم رکھنے والے انسان تھے۔ یہ سارے شکوک مولانا سندھی نے ظفر حسن کے ذہن سے دور کر دیے۔ اپنی سوانح حیات میں ظفر حسن چند ایک جگہوں پر بیان کرتا ہے کہ:

۱۔ مشہور اقوال زریں کہ مذہب لوگوں کے لیے افیون ہے۔ یہ فقرہ انہوں نے کارل مارکس کی تعلیمات سے نکالا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ دینی لوگوں کا ایمان اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ مذہب امیر لوگوں کی حمایت کرتا ہے۔ اور غریب امیروں کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کر سکتے۔ اس سلسلہ میں مولانا سندھی کا فرمان ہے کہ اسلامی قانون وراثت کسی ایک ہاتھ میں دولت کو اکٹھا رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جیسا کہ زکوٰۃ کا امیروں پر ٹیکس ہے، جس سے معاشرہ کے غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد ہو جاتی ہے (61)۔

مولانا سندھی، اقبال شیدائی اور ظفر عمر مسعود کے ساتھ ترکی جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے خیالات کو اپنانے پر تیار نہ تھے اور نہ ہی ماسکو یونیورسٹی کو جوائن کرنے کے لیے تیار تھے۔ اقبال ماسکو میں ترک سفارتخانہ گیا اور سفارتکار احمد

☆ عبدالحمید اور رحمت علی زکریا دونوں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے طالب علم تھے۔

مختار بیگ سے ملا۔ جو کہ ترکش اتحادی پارٹی کا ممبر تھا اور جمہوریہ ترکی کا پہلا وزیر خارجہ تھا۔ وہ مسلمانوں کی آزادی کی جنگوں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اقبال نے اس سفارتکار کے ساتھ ملاقات میں مولانا سندھی کی خدمات اور قربانیوں کا تذکرہ بھی کیا۔ اس پر سفارتکار نے مولانا سندھی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سفارتکار کا چھوٹا بھائی خان تحسین بیگ جو کہ انگریزی زبان اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھی وہاں قیام پذیر تھا۔ اس نے ظفر حسن کے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔ اس ملاقات کے بعد اقبال شیدائی اور ظفر مسعود کو آسانی سے ویزا مل گیا اور وہ ترکی روانہ ہو گئے۔ اس طرح مولانا کا ترکی کے دورے کے لیے راستہ ہموار ہو گیا(62)۔

ظفر حسن کو اپنے طالب علم ساتھیوں کے ساتھ اپریل ۱۹۲۳ء/۱۳۴۲ھ کو ایک ہفتہ کے لیے Leningrad (شہر کا نام) کا ٹور ملا۔ انہوں نے مولانا سندھی کو بھی دعوت دی۔ انہوں نے عزیز احمد کے ساتھ مل کر اس گروپ کے ساتھ جانے پر رضامندی دی۔ ظفر حسن نے ان کو سرکاری مہمان کے طور پر علامہ موسیٰ جاراللہ کے گھر ٹھہرایا جو کہ روس میں مسلمانوں کے مذہبی رہنما تھے۔

ظفر حسن نے مولانا سندھی کے ساتھ علامہ موسیٰ جاراللہ کے گھر میں ایک ہفتہ قیام کیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور دن ۲۱ گھنٹوں کا تھا۔ سخت گرمی اور بڑھاپے کے باوجود مولانا سندھی نے باقاعدگی سے روزے رکھے(63)۔

ظفر حسن روسی دفتر خارجہ کے ایک افسر Mr.Reisner کو اردو زبان سکھانے کے لیے جاتے رہے۔ وہ ہفتہ میں دو دفعہ ان سے ملاقات کرتے اور کسی قسم کی فیس نہیں لیتے تھے۔ اس چیز نے Mr.Reisner پر بڑا اچھا تاثر ڈالا۔ ایک دن ظفر حسن نے اس کے سامنے مولانا کی تعریف ان الفاظ میں کی ایک ہندوستانی رہنما روس میں آیا ہے جس کا نہ صرف اپنے ہم وطنوں پر اچھا تاثر ہے بلکہ افغانیوں پر بھی یہ مولانا سندھی ہی ہیں جنہوں نے افغانیوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار کیا اور افغان سرداروں کے ساتھ بھی اس کے اچھے تعلقات ہیں۔ مثلاً جنرل نادر خاں وہ آل انڈیا کانگریس کے کابل کمیٹی کے صدر بھی ہیں اور ہندوستان کی عبوری حکومت کے ہوم منسٹر ہیں(64)۔

پھر ظفر حسن نے Mr.Reisner سے پوچھا کہ کیا روسی حکومت مولانا سندھی کی خدمات کو انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار ہے جو کہ روسی Bolshewik حکومت کے دشمن ہیں۔ پھر انہوں نے مزید کہا کہ آج روسیوں کے پاس ایک موقع ہے جو پھر کبھی نہیں آئے گا۔ مولانا عبیداللہ سندھی ایک عظیم ہندوستانی رہنما ہے جو اپنے ذاتی دوستوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف روسی حکومت کی مدد کے لیے تیار ہے۔ Mr.Reisner اس بات سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے اپنے افسر Mr. sukevian جو کہ روسی دفتر خارجہ میں مشرق وسطی سے متعلق ڈیپارٹمنٹ کا ڈائریکٹر تھا سے فوراً رابطہ کیا اور مولانا سندھی سے وزیر خارجہ چیچرن سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ اس طرح ان کے درمیان یہ ملاقات جون ۱۹۲۳ء/۱۳۴۲ھ کے پہلے ہفتہ میں رات آٹھ بجے طے پائی(65)۔

پروگرام کے مطابق مولانا سندھی، ظفر حسن اور Mr. Reisner وزیر خارجہ کے دفتر پہنچے۔ جب مولانا وہاں پہنچے تو چیچرن نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ ملاقات تقریباً ۴۵ منٹ تک جاری رہی۔ ظفر حسن اور Mr. Reisner نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔ ظفر حسن اس ملاقات کا لب لباب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"ہندوستانی نیشنل کانگریس کے کابل کے برانچ کا صدر ہونے کے ناطے مولانا سندھی نے چیچرن کو بتایا کہ برطانوی حکومت کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے روسی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ایک اتحاد بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں روسی حکومت کے ساتھ وہ کچھ فیصلے کرنا چاہتے ہیں۔ نہ کہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ۔ اس پر چیچرن بڑا حیران ہوا۔ کیونکہ روس میں روسی کمیونسٹ پارٹی کی اجازت کے بغیر حکومت کوئی بھی فیصلہ نہیں کرتی۔ لیکن مولانا سندھی نے صاف بتا دیا کہ وہ ہندوستانی نیشنل کانگریس کا ممبر ہونے کے ناطے وہ روسی کمیونسٹ پارٹی سے کوئی dealing نہیں کر سکتا۔ جبکہ ہندوستان سے برطانوی حکومت کو نکالنے میں روسی حکومت دلچسپی رکھتی تھی۔ اور روسی حکومت انڈین نیشنل کانگریس سے کچھ compromise کرنا چاہتی تھی۔ چیچرن کو مولانا سندھی نے قائل کر لیا کہ وہ ایک منصوبہ روسی کابینہ کے سامنے پیش کریں گے۔ اور ایک ہفتہ بعد پھر ملاقات طے پائی (66)۔

ظفر حسن کے مطابق مولانا کی یہ بڑی کامیابی تھی کیونکہ روسی کمونسٹ کسی بھی غلام قوم کو ان کی آزادی کے لیے کوئی مدد دینے پر راضی نہ تھے۔

مولانا سندھی ظفر حسن کے ساتھ ایک ہفتہ بعد چیچرن سے ملاقات کے لیے ایک بار پھر گئے۔ ان کی ملاقات کا لب لباب ظفر حسن کے مطابق یہ ہے۔

بات چیت کے دوران چیچرن نے مولانا کو یہ اطلاع دی کہ روسی حکومت انڈین نیشنل موومنٹ کی مدد کے لیے تیار ہے۔ لیکن وہ یہ جاننا چاہتی ہے کہ آیا مدد رقم کی ہو یا فوج کی۔ اور یہ مدد ہندوستان کیسے پہنچائی جائے۔ مولانا نے جواب دیا کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک پُرامن جماعت ہے اور جہاں تک مدد کا سوال ہے تو فوجی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ مدد صرف رقم کی صورت میں ہو۔ وقتی طور پر دس ملین روپے انڈین نیشنل کانگریس کو دیئے جائیں اور یہ رقم قرضے کی صورت میں ہوگی اور ہندوستان یہ رقم آزادی کے بعد لوٹا دے گا (67)۔

ایک ہفتہ بعد مولانا کی چیچرن سے ملاقات ہوئی۔ چیچرن نے اطلاع دی کہ روسی حکومت نے مولانا کی ساری تجاویز کو قبول کر لیا ہے اور وہ ہندوستان اور افغانستان دونوں ملکوں کی معاشی مدد کرنے کو تیار ہے۔ حکومت یہ جاننا چاہتی ہے کہ یہ رقم کیسے پہنچائی جائے۔ مولانا نے جواب دیا کہ وہ اس مقصد کے لیے ترکی جائیں گے اور وہاں سے کچھ کانگریس کے ذمہ دار رہنماؤں کو بلائیں گے اور روسی حکومت کی پیش کردہ یہ رقم انڈین نیشنل کانگریس کے لوگوں کے حوالے کر دی جائے گی۔ افغانستان کو امداد دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہاں کی فضا کو سردار محمد نادر خاں کے ذریعہ سازگار بنایا جائے تاکہ افغانستان اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹے۔ جیسا کہ انہوں نے اینگلو افغان جنگ ۱۹۱۹ء/۱۳۳۰ھ میں کیا اور پھر ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ میں کیا۔ جب انہوں نے برطانوی حکومت سے قرض لیا۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اور ان کی پارٹی دوبارہ کابل واپس جائیں۔ اگر وہ ترکی میں قیام

کے دوران اپنا یہ پروگرام مکمل نہیں کر پاتے تو وہ حجاز چلے جائیں گے۔ وہاں وہ اپنے کچھ دوستوں سے ملاقات کریں گے۔ جو وہاں حج کے لیے آئیں گے۔ وہ ان کے ذریعہ ایک پیغام ہندوستان بھیجیں گے۔ اور وہ افغانستان کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔ اس پیش کش کو سننے کے بعد چیچرن نے مولانا کے ساتھ ایک ہفتہ بعد ایک اور ملاقات کا فیصلہ کیا(68)۔

چوتھی ملاقات میں چیچرن نے مولانا کو مطلع کیا کہ روسی حکومت نے ان کی دونوں تجاویز کو قبول کر لیا ہے اور وہ اب ترکی کی طرف چلے جائیں اور اپنا کام شروع کریں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مولانا کے اخراجات سفر اور ترکی کے پروگرام کے اخراجات وہ برداشت کریں گے اور روسی کونسل استنبول کے ذریعہ انہیں جتنی رقم کی ضرورت ہوگی مل جائے گی(69)۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا سندھی روس میں لینن اور سٹالن سے ملے۔ یہ سچ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مولانا روس پہنچے تو اتنے شدید بیمار تھے کہ وہ اپنے قریبی دوستوں کو پہچاننے کے قابل بھی نہیں تھے (70)۔

ترکی میں قیام:

ترکی میں مولانا سندھی ۱۹۲۲ء/۱۳۴۱ھ میں پہنچے۔ یہاں آپ کا قیام ساڑھے تین سال رہا۔ ماسکو سے مولانا سندھی ترکی آئے۔ اس وقت مصطفیٰ کمال ترکی کو کمال ترکی بنا رہے تھے۔ ان سے ملاقات کی۔ اس کے علاوہ کانگریس کے صدر ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی جوہر سے ملاقاتیں کیں۔ اس دوران مشہور کانگریسی لیڈر لالہ لاجپت رائے بھی ترکی آئے اور ان سے ملاقات کی۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے ۱۹۲۴ء/۱۳۴۳ھ میں اپنا سیاسی منشور پیش کیا(71)۔

مولانا عبیداللہ سندھی کی حجاز روانگی:

۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء، موسم حج پر مکہ معظمہ میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جس میں دوسرے ملکوں کے علاوہ ہندوستان کے علماء کی شرکت بھی متوقع تھی۔ مولانا نے سوچا کہ کسی طرح اس سال حج کے لیے آنے والے لوگوں سے مل کر ان کے ذریعے ہندوستانی لیڈروں اور دوستوں کو اپنے پروگرام کے متعلق پیغام بھیج سکیں۔ لیکن یہاں سے جانا ان کے لیے ناممکن تھا۔ کیونکہ کوئی جہاز استنبول سے سیدھا جدہ نہ جاتا تھا اور اسکندریہ کی بندرگاہ سعید سے جہاز بدلنا پڑتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریز مصر پر پوری طرح قابض ہو گئے۔ اسی لیے مولانا عبیداللہ سندھی مصر کی بجائے اٹلی کے راستے اری ٹیریا اور پھر جدہ پہنچے۔ اس راستے میں ان کو اتنی دیر لگ گئی کہ عالمی کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔ مولانا اگست ۱۹۲۶ء/۱۳۴۵ھ میں سعودی عرب پہنچے وہاں پر مولانا تیرہ سال مقیم رہے۔ قیام حجاز کے دوران مولانا علمی کاموں میں مشغول ہو گئے اور ہر سال ہندوستان سے آنے والے حاجیوں سے ملاقات کرتے (72)۔

جلاوطنی کے بعد واپسی کا دور

جامعہ ملیہ میں قیام:

جامعہ ملیہ دہلی میں ہے۔ یہ ۱۶ شوال ۱۳۵۹ھ ۱۶ نومبر ۱۹۴۰ عیسوی میں جامعہ ملیہ پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے پہلے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مقرر ہوئے۔

مکہ معظمہ سے واپسی پر آپ نے کچھ عرصہ جامعہ ملیہ میں گزارا (۱۹۴۰ ہندی) جامعہ کا نصاب تعلیم شائع کیا۔ اس میں ولی اللہ فلاسفی سے قرآن مجید کا سمجھنا اور انسانیت کے اصولوں پر کاشتکاروں کی علمی و عملی خدمت کرنا۔ ابتدائی اور اعلیٰ سکول اطراف میں قائم تھے۔ مثلاً سندھ کا مدرسہ دارالرشاد اور مظہر العلوم۔ ریاست بہاولپور میں دین پور۔ یہ مختلف تعلیم گاہیں جامع کے اس مرکز کے لیے فروغ بن جاتی تھیں (73)۔

جامعہ ملیہ میں مولانا عبیداللہ سندھی نے قیام فرمایا۔ جامعہ ملیہ سے کراچی تک اس تحریک ملیہ کے مرکز اور اس کے فروغ کی خدمت کے لیے سفر کیے۔ اور جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوتے دہلی کے مشرقی علاقہ لکھنؤ، بنارس، پٹنہ اور جنوبی علاقہ میں اجمیر تک سفر کیے۔ آپ نے اپنے اوقات کچھ اس طرح تقسیم کیے۔ ہر دو ماہ جامعہ میں رہنے کے بعد ایک ماہ سندھ میں چلے جاتے۔ طالب علم اس ماہ میں ضبط اور مطالعہ میں مصروف رہتے (74)۔

آخری ایام:

مولانا عبیداللہ سندھی اپنے زمانے کا ایک عظیم انسان تھا۔ وہ نایاب صفات کا مالک تھا۔ وہ سکالرشپ، دانشمندی اور محب الوطنی کے جذبات سے مالا مال تھے۔ اگرچہ وہ غیر مسلم پیدا ہوئے اور بعد میں دین اسلام قبول کیا اور باقی ساری زندگی مضبوطی سے اس پر قائم رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے افغانستان، روس اور ترکی کے لیے سفر کیے اور بہت سی چیزوں نے ان پر اثر ڈالا لیکن یہ سارے اثرات اسلام سے محبت پر غالب نہ آسکے۔ اسلام کی محبت کے ساتھ ساتھ آپ میں وطن اور انسانیت کی بہت زیادہ محبت تھی۔ یہ دونوں کردار آپ کی زندگی میں موت تک آپ کے کردار پر غالب رہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی اپنے اصولوں کے خلاف کبھی بھی مفاہمت نہ کی۔ مولانا عبداللہ مکی، ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس کے وہ خود گواہ ہیں۔ ان کے مطابق یمن اور نجد کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کی وجہ سے کعبہ کے علاقے میں دو یمنی باشندوں کا قتل تھا۔ جب نجد کا حکمران عبدالعزیز خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا تو یمن کے باشندوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ نجد کا وزیر دفاع جو کہ اس وقت مکہ میں فوج بھرتی کرنے کے سلسلہ میں قیام پذیر تھا۔ اس نے مولانا کی طرف اپنا ایک نمائندہ بھیجا کہ ایک ملاقات طے کی جائے۔ نمائندہ مولانا سندھی سے ملا اور ایک تاریخ مقرر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مولانا نے ہر مرتبہ یہی بتایا کہ وہ اپنی آسانی سے وزیر سے ملاقات کریں گے۔ جب نمائندے نے اصرار کیا تو مولانا نے اسے جھڑک دیا اور کہا وہ ایک بیوقوف ترین انسان ہے۔ نمائندہ مایوس واپس لوٹ گیا۔

مولوی عبداللہ اور آپ کے ساتھی اس چیز سے ڈر گئے کہ نجدی حکمران ان سے بدلہ لے گا۔ جب مولوی عبداللہ نے مولانا کو بتایا کہ ان کا وزیر دفاع سے ملاقات سے انکار ان کو کسی مصیبت میں ڈال سکتا ہے تو مولانا سندھی غصے میں آ گئے اور فرمایا ''نجد کا بادشاہ ایک بدمعاش حکمران ہے۔ وہ اپنے آپ کو بادشاہ کہتا ہے جبکہ اللہ واحد بادشاہ ہے۔ اسے اپنے آپ کو خلیفہ کہنا چاہیے۔ عرب کے لوگ عرب ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن ان میں نظامی جیسی دانش مندی نہیں ہے۔ جو اپنی شاعری میں اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ حجاج کرام سے ٹیکس وصول کرتے ہیں جو کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے''۔

تب اپنے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ''عبیداللہ سندھی کے جوتے بھی ان کی طرف نہیں جاتے۔ میں اس پاک شہر میں اللہ کا مہمان ہوں اور مجھے اس علاقے سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

وفات:

مولانا سندھی نے اپنی زندگی اس مشن کی خاطر اس قدر وقف کر دی تھی کہ موت کے واضح آثار نظر آنے کے باوجود آپ اپنے مشن سے پیچھے نہ ہٹے۔ چار اگست ۱۹۴۴ء/۱۳۶۳ھ کو مولانا ایک عربی مدرسہ جس کا نام ''محمد قاسم ولی اللہ نظریاتی سکول شہداد کوٹ'' کا سنگ بنیاد کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ آپ اس وقت کراچی میں زیر علاج تھے (75)۔ آپ کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ آپ زیادہ تر وقت بے ہوشی کی حالت میں رہتے۔ جب کبھی آپ کو ہوش آتا تو آپ شہداد کوٹ کے بارے میں پوچھتے اور ریلوں کے اوقات کے بارے میں پوچھتے۔ اسی اثناء میں شہداد کوٹ سے ایک ٹیلی گرام موصول ہوا جس کو آپ کے دوستوں نے اس ڈر سے خفیہ رکھا کہ آپ اس سے شدید ترین بیماری کی حالت میں بھی شہداد کوٹ جانے سے نہیں ہچکچائیں گے۔ ۴ اگست کو جب آپ کی طبیعت تھوڑی سی بہتر ہوئی۔ آپ نے فوراً قلم اور کاغذ منگوایا اور ایک تقریر لکھی۔ اور اسے چھپوا کر اپنے طلباء میں سے کسی ایک کے ذریعہ اسے شہداد کوٹ بھیج دیا (76)۔

آخر کار برصغیر پاک و ہند کے اس عظیم سپوت نے ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء/۱۳۶۳ھ میں دین پور ریاست بہاول پور میں وفات پائی۔ دین پور موجودہ ضلع رحیم یار خان میں تحصیل خان پور سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہندوستان میں مولانا کے پانچ آخری سال اس جدوجہد اور کشمکش میں گزرے۔

فصل سوم:

تلامذہ

میرے علم اور مطالعے کے مطابق درج ذیل حضرات ہیں جنہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی سے علم فیض حاصل کیا:

ابتدائی دور کے تلامذہ

۱۔ مولانا عبدالقادر دین پوری۔
۲۔ مولانا کمال الدین (بھر چونڈی شریف)۔
۳۔ مولانا محمد اکرم ہالائی۔
۴۔ مولانا عبدالوحاب کولاچی۔
۵۔ مولانا محمد (ٹھیری)۔
۶۔ پیر ضیاء الدین راشدی (پیر جھنڈا)۔
۷۔ مولانا احمد علی لاہوری۔
۸۔ مولوی محمد علی۔
۹۔ مولانا عزیز احمد۔
۱۰۔ مولوی امید علی جیکب آبادی۔
۱۱۔ مولانا عبدالرزاق بستی تیرا۔
۱۲۔ مولانا عبداللہ لغاری (مکہ معظمہ میں قیام کے دوران خصوصی استفادہ)۔
۱۳۔ محمد علی شاہ سندھی۔

دوران قیام دیوبند و دہلی کے تلامذہ

۱۔ مولوی مظہر الدین شیر کوئی۔
۲۔ مولانا خواجہ عبدالحی فاروقی۔
۳۔ مولوی انیس احمد۔
۴۔ قاضی ضیاء الدین۔
۵۔ پیر مصباح الدین۔
۶۔ اصطفی کریم۔
۷۔ فضل الرحمٰن۔

افغانستان میں قیام کے دوران تلامذہ

۱۔ ظفر حسن ایبک۔
۲۔ خوشی محمد۔
۳۔ محمد وارث بٹ۔
۴۔ شیخ عبدالقادر۔
۵۔ عبدالنبی۔

مکہ مکرمہ کے دورِ قیام کے تلامذہ

۱۔ علامہ موسیٰ جاراللہ۔
۲۔ مولانا محمد طاہر پنج پیری۔
۳۔ مولوی عبدالوھاب مکی۔
۴۔ محمد انور مرشد مکی۔

۵۔ شیخ عمر فاروق حبشی۔
۶۔ مولوی عبداللہ عمر پوری۔
۷۔ مولوی محمد اسماعیل گودھروی۔
۸۔ شیخ محمد بن عبدالرزاق۔
۹۔ داد شاد بن عبدالحق۔
۱۰۔ پروفیسر محمد سرور۔
۱۱۔ ڈاکٹر فیرز الدین۔

وطن واپسی کے بعد کے تلامذہ

۱۔ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی۔
۲۔ مولوی علی محمد کاکے پوتی۔
۳۔ مولانا عبدالحق ربانی۔
۴۔ مولوی خلیل احمد۔
۵۔ مولوی نور محمد نور۔
۶۔ مولوی محمد وارث دل۔
۷۔ مولوی شیخ عبدالمجید امجد۔
۸۔ مولوی عزیز اللہ جر دار۔
۹۔ میاں ظہیر الحق دین پوری۔
۱۰۔ مولانا بشیر احمد لودھیانوی۔
۱۱۔ مولانا مقبول عالم۔
۱۲۔ غازی خدا بخش۔
۱۳۔ پیر وہب اللہ شاہ راشدی (پیر آف جھنڈا)
۱۴۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید۔
۱۵۔ مولوی دین محمد وفائی۔
۱۶۔ مولوی محمود۔
۱۷۔ مولوی عبدالغفور۔
۱۸۔ مولوی محمد یونس ندوی۔
۱۹۔ مولانا عبیداللہ انور۔
۲۰۔ قاضی مولوی عبدالرزاق۔
۲۱۔ علامہ محمد صدیق بہاولپوری (86)۔

غیر تدریسی تلامذہ:

غیر رسمی طور پر بھی مولانا سندھی کے درس و افادہ سے فیض یاب ہونے والوں کی ایک طویل فہرست ہے مثلاً:

۱۔ مولانا محمد اسماعیل غزنوی۔
۲۔ ڈاکٹر غلام حسین جلبانی۔
۳۔ مولانا غلام رسول مہر۔
۴۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔
۵۔ خواجہ عبدالوحید۔
۶۔ سردار محمد امین خاں کھوسو۔
۷۔ مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوری
۸۔ مولانا محمد ادریس میرٹھی (77)

درج بالا تلامذہ میں سے چند ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ مولانا عبیداللہ لغاری
۲۔ مولانا احمد علی لاہوری
۳۔ علامہ موسیٰ جاراللہ
۴۔ محمد سرور

۵۔ ظفر ایبک ۶۔ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی۔

ا۔ مولانا عبداللہ لغاری:

عبداللہ بن نہال خاں بن محمد خاں بن رستم خاں بن فتح محمد خاں لغاری ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں بمقام "لا ر لغاری" تحصیل میر پور ماتھیلو (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد یعقوب سے صرف کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ صرف کی بقیہ کتابیں اور نحو کی کچھ کتابیں "گوٹھ پنھواتی" میں مولوی عبدالقادر سے پڑھیں۔ اس کے بعد "نوشہرو فیروز" میں قاضی محمد عالم، قاضی عبدالرزاق، قاضی عبدالحفیظ اور مولوی فیض الکریم کے یہاں تعلیم حاصل کی اور سندھ کے مشہور حکیم شمس الدین احمد صاحب (سلمہ اللہ تعالیٰ) کے چچا مولوی عبدالکریم بن مولوی محمد عثمان جو حافظِ حدیث تھے اور علامہ شوکانی کے شاگرد تھے) تعلیم پائی۔ پھر موقع ملا تو مقام "ڈبھرو" کے قریب مخدوم غلام محمد بن مخدوم حبیب اللہ سے مستفیض ہوئے۔ اسی مقام کے قریب ایک گاؤں نگون ہے وہاں ایک صوفی اور مشہور خطاط مولوی عبدالقدوس تھے۔ ان سے بھی فیض حاصل کیا۔ پھر کراچی میں مولانا محمد صادق کے والد مولانا عبداللہ سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد ٹھٹھہ کے مشہور عالم مولانا محمد علی مرحوم کے بعض شاگردوں سے بھی استفادہ کیا۔ اور گھر واپس آئے تو مولوی محمد امین ناراض ہوئے کہ تم نے سیر وسیاحت میں اپنا وقت ضائع کیا ہے اب ملتان جاؤ چنانچہ یہ ملتان کے مشہور محدث مولانا سلطان محمود کے پاس ایک سال تک علمِ حدیث حاصل کرتے رہے۔ پھر بہاولپور میں "صاحب السیر" کی خانقاہ میں مولوی عبدالرشید سے تعلیم حاصل کی اور کچھ دن مولوی محمد عاقل سے بھی مستفیض ہوئے۔ پھر مولوی الٰہی بخش لنگاہ منطقی عمر پوری سے حدیث، فقہ اور منطق کی آخری کتابیں پڑھیں اور سلسلہ تعلیم ختم ہوا۔ وطن واپس آئے تو ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء میں شادی ہوئی۔ اس کے بعد "امروٹ" میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے ملاقات ہوئی اور ان کی انقلابی سیاست میں رفیق کار بن گئے۔ مولانا کے نظریات کے نشر و اشاعت کے لیے امروٹ میں ایک مدرسہ اور ایک پریس بھی قائم کیا اور ایک رسالہ "ہدایت الاخوان" جاری کیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی گوٹھ "پیر جھنڈا" میں وہاں کے پیر صاحب کی حمایت سے ایک مدرسہ 'دارالرشاد' قائم کیا۔ مولانا عبداللہ اس کے مہتمم ہوئے۔ اس طرح وہاں ان دونوں بزرگوں کو ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) سات سال تک طلبہ میں "ذہنی بیداری" پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیہ الرحمہ نے مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد صادق کو طلب کیا اور سیاسی زندگی میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ مولانا عبداللہ بھی ساتھ گئے تھے۔ وہ بھی متاثر ہو کر واپس آئے اور شیخ الہند کے مشورے کے مطابق ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ تک اس مدرسے کا انتظام سنبھالتے رہے۔ لیکن اسی سال مولانا عبیداللہ وہاں تشریف لائے اور "کابل" چلنے کے لیے فرمایا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ان کے ساتھ کابل گئے۔ اور مولانا عبیداللہ کے رفیق کار اور معتمد خاص بن کر رہے۔

تقریباً دو سال بعد مولانا عبیداللہ نے ان کے ہاتھ اپنے اور راجہ مہندر پرتاب کے چند خصوصی خطوط بھیجے کہ وہ ہندوستان میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم محمد اجمل خاں وغیرہ کو پہنچا دیں۔ نیز یہ کہ دین پور، امروٹ اور پیر جھنڈا والے بزرگوں سے ایک عبارت پر (جو کہ ان کو قلم بند کرادی تھی) دستخط لے کر انگریزوں کے خلاف جہاد کی اجازت لیں۔ مولانا عبداللہ نے

دونوں کام کرنے کی اجازتیں لے کر سردار عبدالرزاق (میزان العلماء) کو کابل روانہ کر دیا۔

''ریشمی خطوط'' والے واقعے کے سلسلے میں مولانا عبداللہ صاحب اور چند رفقا گرفتار کیے گئے۔ لیکن مولانا کے بیان سے وہ رفقاء بعد میں رہا کر دیے گئے۔ اور خود مولانا دو سال تک لاہور، پٹھان کوٹ، دین پور اور کراچی وغیرہ جیلوں میں نظر بند رہے۔ اور پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر رہا کیے گئے۔ اور جب انگریزوں کے خلاف امیر امان اللہ خاں (والی کابل) برسر پیکار ہوئے تو مولانا عبداللہ کو ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ کیونکہ اس جنگ کے محرک مولانا عبیداللہ سندھی ہی تھے۔ جن کے یہ رفیق تھے (78)۔

۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء میں مولانا عبیداللہ سندھی مکہ معظمہ پہنچے۔ بعد میں مولانا عبداللہ لغاری بھی یہاں ان کی خدمت میں پہنچے۔ مولانا سندھی نے تفسیر قرآن، علوم اسلامیہ اور فلسفہ شاہ ولی اللہ پر جو تقریریں کیں وہ سب مولانا عبداللہ نے قلم بند کیں۔ بلکہ جتنی کتابیں مولانا سندھی کی افکار اور شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے فلسفے سے متعلق شائع ہوئی ہیں۔ ان سب کا مواد در حقیقت مولانا عبداللہ ہی کا جمع کردہ تھا۔ ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی واپس تشریف لا رہے تھے تو بعض انتظامات کی خاطر مولانا عبداللہ ان کے آنے سے پہلے سندھ پہنچ گئے۔ اور ان کے آخری دم تک ساتھ رہے۔ مولانا سندھی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تقریباً چھ سال سندھ یونیورسٹی کے بعض استادوں اور شاگردوں کو قرآن پاک کی تفسیر و حکمت سمجھانے کے لیے یونیورسٹی میں وہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب اور بعد ازیں ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ صاحب کے یہاں تین چار سال تک مقیم رہے۔ اور وہاں سے قرآن شریف اور حکمت ولی اللّٰہی کی تعلیم جاری رکھی۔ آخر میں سندھ یونیورسٹی میں ایم۔اے کے طلبہ کو تفسیر پڑھانے کے لیے معلم مقرر ہوئے۔ لیکن جلد ہی اچانک ۱۳ ستمبر ۱۹۵۸ء/ ۱۳۷۸ھ کو پیشاب بند ہوا تو ۱۵ ستمبر کو ڈاکٹر ہالے پوتہ کی رہائش گاہ سے سول ہسپتال حیدرآباد منتقل کیا گیا۔ ۱۷ ستمبر بروز چہار شنبہ ان کا آپریشن ہوا۔ حافظ محمد صاحب سے فرمایا کہ ''دے چند خوردیم و گفتیم و بس'' اس کے بعد والی شب یعنی شب پنجشنبہ ۱۸ ستمبر بمطابق ۴ ربیع الاول ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء کو گیارہ بجے انتقال فرمایا۔

اس وقت ڈاکٹر ہالے پوتہ جاپان گئے ہوئے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ (آپا امینہ صاحبہ) نے اپنے مکان ہی پر غسل دلوایا اور محترمہ خیر النساء عباسی صاحبہ نے تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا اسی روز شام کو سانگھڑ میں تدفین ہوئی (79)۔

۲۔ مولانا احمد علی لاہوری:

حضرت مولانا احمد علی کا آبائی وطن قصبہ جلال ضلع گوجرانوالہ ہے۔ یہ قصبہ ریلوے اسٹیشن گکھڑ سے چار میل جانب مشرق واقع ہے۔ آپ کے والد ماجد شیخ حبیب اللہ صاحب ایک دیندار بزرگ اور نسبت چشتیہ میں بلند مقام کے مالک تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ پیدائشی مسلمان اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹے عنایت فرمائے۔ حضرت مولانا احمد علی قدس سرہ العزیز، حافظ مولوی محمد علی صاحب مقیم یاغستان، مولوی عزیز احمد صاحب مقیم کراچی اور حکیم رشید احمد صاحب (لاہور)۔ حضرتؒ سب بھائیوں میں بڑے تھے۔ ۲ رمضان المبارک ۱۸۸۶ء/ ۱۳۰۴ھ کو جمعۃ المبارک کے روز آپ اسی قصبہ جلال میں پیدا ہوئے اور والد بزرگوار نے آپ کا نام احمد علی تجویز فرمایا (80)۔

ابتدائی تعلیم:

جس ذات بابرکات نے دنیا میں معلّم قرآن اور مفسّر قرآن ہو کر قرآنی علوم و معارف کی اشاعت کا مقدس فریضہ سر انجام دینا تھا اس کی تعلیم کا آغاز بھی قرآن عزیز پڑھنے سے ہوا اور اسے کائنات ارضی پر مبعوث بھی اسی ماہ مبارک میں فرمایا کہ جس میں قرآنِ حکیم کا نزول ہوا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو قرآن خود پڑھایا اور تھوڑے دنوں بعد آپ سکول میں داخل کرا دیئے گئے۔ یہ اسکول قصبہ جلال سے ایک میل دور کوٹ سعد اللہ میں واقع تھا۔ حضرتؒ اپنے ہم مکتبوں کے ساتھ ہر روز صبح اسکول جاتے اور شام کو واپس لوٹ آتے (81)۔

حضرتؒ کے والد ماجد کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ انہوں نے اعزہ و اقرباء کی اسلام دشمنی کے باعث قصبہ جلال کی سکونت ترک کے موضع باہو چک میں رہائش اختیار کر لی۔ یہ گاؤں اول الذکر مقام سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں چونکہ تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ اس لیے حضرتؒ کو قریب کے ایک قصبہ تلونڈی کھجور والی کے اسکول میں داخل کرایا گیا جس میں آپ نے پانچویں جماعت تک تعلیم پائی۔

بعد ازاں آپ کے والد ماجد نے آپ کو مولانا عبدالحقؒ صاحب خطیب جامع مسجد گوجرانوالہ کے حلقہ درس میں داخل کر دیا جہاں نصابِ فارسی سے آپ کی دینی تعلیم کی ابتداء ہوئی۔ اس خوش بخت استاد نے حضرتؒ کو اپنے گھر ہی رکھا اور اپنے دونوں بیٹوں محمد ابراہیم اور محمد اسمٰعیل کے ساتھ آپ کی تعلیم و تربیت کرتے رہے۔ اس دوران میں حضرتؒ مستقل طور پر گوجرانوالہ ہی قیام پذیر رہے لیکن گاہے گاہے والدین سے ملنے کے لیے اپنے گاؤں بھی تشریف لے جاتے تھے (82)۔

مولانا سندھی سے تلمذ:

ابھی چند ہی مہینے گذرے تھے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فراغتِ دار العلوم دیوبند کے بعد حسب ارشاد شیخ رحمۃ اللہ علیہ دینی کتب کے مطالعہ اور تدریس علوم کے سلسلے میں سندھ جاتے ہوئے اپنی والدہ ماجدہ سے ملنے کے لیے سیالکوٹ تشریف لے گئے۔ آپ کی والدہ نے آپ سے حضرتؒ کے والد ماجد کے قبولِ اسلام اور دینی شغف کا تذکرہ کیا اور مولانا سندھیؒ کو ان سے ملانے کے لیے باہو چک ہمراہ لائیں۔ حضرتؒ کے والد ماجد نے اس موقع پر تعلیم و تربیت کے لیے حضرت کو مولانا سندھی کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا ''یہ بچہ میں نے دین کیلیے وقف کیا ہے۔ اسے قبول کیجئے۔ مولانا سندھیؒ نے خوشی سے حضرتؒ کو قبول کر لیا اور جاتے ہوئے حضرتؒ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ چنانچہ مولانا سندھیؒ، حضرتؒ کو تفسیر قرآن مجید اور علم حدیث کی سند دیتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

ان الصالح السعید المولوی احمد علی لاھوری کفلتہ لنذر نذر بہ ابواہ ''سعادت مند مولوی احمد علی لاہور کو میں نے اس کی نذر کی وجہ سے اپنی تربیت میں لے لیا جو آپ کے والدین نے دین کی خدمت کے لیے مانی تھی''۔

حضرتؒ ابھی صرف نو برس کے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چونکہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرتؒ کے والد

کے درمیان قرابتداری کے تعلقات تھے۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد بچوں کی نگہداشت کے خیال سے حضرت دین پوری نور اللہ مرقدہ نے حضرتؒ کی والدہ ماجدہ کا نکاحِ ثانی مولانا سندھیؒ سے کر دیا اور اس طرح حضرت مولانا سندھیؒ گویا حضرتؒ کے سوتیلے والد بن گئے۔ چنانچہ حضرتؒ اور آپ کے دوسرے بھائی مولوی محمد علی، مولوی عزیز احمد اور حکیم رشید احمد بچپن ہی سے مولانا سندھیؒ کے زیر دست آ گئے۔

مولانا سندھیؒ کی پہلی اہلیہ فوت ہو چکی تھیں۔ یہ دوسرا نکاح محض تکمیل سنت اور تعمیل ارشاد مرشد تھا۔ اس عقدِ ثانی سے مولانا سندھی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور نہ حضرتؒ کی والدہ ماجدہؒ نکاح کے بعد زیادہ عرصہ تک زندہ رہیں۔ چنانچہ کم سنی میں ہی حضرت والد کے بعد والدہ کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔

حضرتؒ کے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ بہت پُر مشقت اور تکلیف دہ تھا۔ مولانا سندھی سخت مزاج تھے۔ وہ آپ کو ہر وقت کام میں مصروف رکھتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا، گھر کا پانی بھرنا، مولانا سندھی اور اپنے تینوں چھوٹے بھائیوں کے کپڑے دھونا بھی آپ کے فرائض میں داخل تھا۔ اور یہ سلسلہ خدمات قیام دہلی اور نظارۃ المعارف میں تدریس کے ابتدائی زمانے تک جاری رہا، زمانہ تعلیم میں حضرتؒ کے صبر و شکر، بے نفسی اور قناعت پسندی کا یہ حال تھا کہ آٹھ سال تک ایک روٹی کھا کر گزارا کرتے رہے۔ حضرت مولانا سندھیؒ کے گھر سے ان کے لیے دو روٹیاں آتی تھیں۔ ایک مولانا خود کھا لیتے اور دوسری حضرتؒ کو کھلا دیتے۔ حضرتؒ کا بچپن تھا۔ طبیعت سیر نہ ہوتی تھی لیکن پھر بھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ جب بھوک ستاتی تو جنگل میں جا کر کیکر کی پھلیاں اور جنگلی بیر کھا کر پیٹ بھر لیتے۔

حضرت نے لاہور میں مستقل قیام کیا اور وہاں سے ایک رسالہ ''خدام الدین'' نکالا۔ آپ مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء/۱۳۸۲ھ بروز جمعہ دس بجے صبح اپنے مکان سے حسب معمول مسجد لائن والی میں خطبہ جمعہ کے لیے تشریف لائے لیکن طبیعت بہت ہی خراب تھی اور خطبہ جمعہ مولانا عبید اللہ انور نے پڑھایا۔ اسی دن رات کو ساڑھے نو بجے آپ نے نمازِ عشاء کی نیت باندھی اور سجدہ کی حالت میں آپ کا وصال ہو گیا(83)۔

۳۔ علامہ موسیٰ جار اللہ:

مولانا عبید اللہ سندھی مکہ میں ہمیشہ اس تلاش میں رہتے تھے کہ کوئی پڑھنے والا مل جائے جسے وہ پڑھا سکیں۔ اگر کوئی تعلیم یافتہ ہندوستانی آ جاتا تو اس کا آمادہ ایک بہت بڑی نعمت سمجھتے اور اسے دن رات پڑھاتے رہتے۔ مشہور روسی ترک عالم شیخ موسیٰ جار اللہ جنہیں سٹالن نے جلاوطن کر دیا تھا، پھرتے پھراتے مکہ پہنچے وہاں ان کی مولانا سندھی سے ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے جب مولانا روس گئے تھے تو وہ شیخ موسیٰ جار اللہ سے ملے تھے بلکہ ان کے گھر پر بھی قیام فرمایا تھا۔ اب جو یہ دونوں بزرگ مکہ میں ملے تو شیخ جار اللہ نے مولانا سے قرآن پڑھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ مولانا نے سارا قرآن شیخ کو پڑھایا۔ موصوف نے مولانا کی یہ ساری تفسیر اپنے الفاظ میں عربی زبان میں قلمبند کر لی۔

شیخ موسیٰ جار اللہ عالمِ اسلام کی ایک مشہور شخصیت تھے۔ ان کی تصنیفات عربی، فارسی اور ترکی میں ہیں۔ مصر کے علمی د

دینی حلقوں میں وہ آج سے نصف صدی سے بھی قبل بڑے معروف تھے ان کی آخری عمر ہندوستان میں گزری۔ دوسری جنگ عظیم میں سوویت یونین کے ایماء پر انہیں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ نظر بندی کے زمانے میں بھی انہوں نے کئی کتابیں لکھیں شیخ جاراللہ مولانا سے پہلے ہندوستان آ گئے تھے۔ اور سب سے پہلے انہوں نے یہاں آ کر بتایا کہ مکہ میں جو شیخ عبیداللہ سندھی جلاوطن ہیں، وہ بہت بڑے عالم محقق اور مجدد ہیں۔

مولانا سندھی بعض دفعہ شیخ موصوف کا ذکر کرتے اور مسکرا کر کہتے کہ میں ان کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے خود میرے اہل وطن سے متعارف کرایا اور ان کے یہ بتانے سے کہ میں ایک بڑا عالم ہوں، میرے اہل وطن نے مجھے جانا اور پہچانا۔ غرض مجھے اپنے وطن میں زندہ کرنے والے شیخ موسیٰ جاراللہ ہیں۔ اس پر ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے (84)۔

۴۔ پروفیسر محمد سرور:

پروفیسر محمد سرور اصل میں گجرات، قصبہ مدینہ سادات کے رہنے والے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے گجرات کے اس ہائی سکول میں جس کو میر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب نے قائم کیا تھا۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں داخل ہوئے اور وہاں تعلیم کی تکمیل کی۔ جامعہ ملیہ تمام برصغیر میں علی گڑھ یونیورسٹی کا بدل خیال کیا جاتا تھا۔ سرور صاحب نے جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسی ادارے میں تعلیم دینی شروع کر دی۔ پھر وہاں کے اہل وعقد کے مشورے سے آپ مصر گئے اور جامعہ الازہر اور مصر کے بعض دیگر جامعات سے علمی استفادہ کرتے رہے۔ پھر بدستور جامعہ ملیہ میں برصغیر کی تقسیم تک بطور معلم اور استاد کام کرتے رہے۔ پھر پاکستان چلے آئے۔ بعض صحائف و جرائد کے اندر بطور مدیر بھی کام کرتے رہے۔ خاص طور پر شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے ماہانہ مجلہ الرحیم میں، پھر ادارہ تحقیقات اسلامی کے فکر و نظر میں بھی کام کرتے رہے۔

پروفیسر محمد سرور بہت اچھے اخلاق اور نہایت مہذب انسان تھے۔ زبان میں کسی قدر لکنت تھی۔ لیکن قلم کے دھنی تھے۔ جامعہ کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر مجیب وغیرہ نے پروفیسر محمد سرور کو مکہ مکرمہ روانہ کر دیا۔ اس طرح وہ مکہ پہنچ کر مولانا عبید اللہ سندھی کی خدمت میں کچھ عرصہ رہے اور ان کی شاگردی اختیار کی (85)۔

۵۔ ظفر حسن ایبک:

ظفر حسن ایبک پانی پت کرنال کے ایک متوسط زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو ۲۶ ستمبر ۱۸۹۵ء/۱۳۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ لاہور گورنمنٹ کالج میں گریجویشن کر رہے تھے جبکہ جنگ بلقان کے خون خوار واقعات اس سے قبل پیش آ چکے تھے اور برطانیہ کی تمام اتحادی طاقتوں کی ترکی خلافت پر حملہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے بالعموم اور برصغیر کے حساس مسلمان نوجوانوں کے لیے بالخصوص انتہائی الم ناک تھا۔ مسلمان نوجوانوں کا خون کھولتا تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے ترک مسلمان بھائیوں کا کسی نہ کسی طرح دفاع کر سکیں اور اپنے ذمہ سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ظفر حسن اور ان کے دیگر رفقاء اپنی تعلیم یہاں نامکمل چھوڑ گئے تھے۔ اس کا بھی انہیں مستقبل میں خمیازہ بھگتنا پڑا (86)۔ یہ تمام داستان انتہائی دلچسپ اور عبرتناک ہے۔ ظفر حسن تقریباً بارہ

سال تک مولانا سندھیؒ کے ساتھ رہے ہیں اور مولانا سے قرآن کریم بھی پڑھا اور مولانا شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ اور حکمت کا بھی ایک معتد بہ حصہ حاصل کیا۔ مولانا کے مشیر اور سیکرٹری اور معاون اور خادم رہے تھے اور برصغیر کی آزادی کے سلسلہ میں مولانا سندھی کی جو کوششیں تھیں ان میں ایک ذمہ دار فرد کی طرح ظفر حسن بھی شریک کار رہے (87)۔

مولانا سندھیؒ کے کابل میں سات سال اور روس میں ایک سال اور ترکی میں چار سال کے عرصہ میں ظفر حسن برابر مولانا کی تربیت اور رفاقت میں رہے اور بہت کچھ مولانا سے سیکھا اور تاحیات ترکی میں رہے (88)۔

۶۔ علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی:

علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی سندھ کی نامور شخصیت تھے۔ آپ نے ۷۰ سال سے زیادہ عمر پائی۔ آپ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد کے ڈائریکٹر اور سندھی ادبی بورڈ جام شورو کے چیئرمین رہے (89)۔ دار العلوم القاسمیہ دیوبند کی نسبت سے جس طرح علیگڑھ کے فارغ التحصیل کو علیگ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دیوبند کے اس دار العلوم کے فارغ التحصیل کو قاسمی کہتے ہیں۔

آپ کا تعلق رئیس گوٹھ (ضلع لاڑکانہ) سندھ سے تھا۔ قاسمی صاحب کی پانچ بہنیں اور سات بھائی تھے۔ سب سے چھوٹے تھے۔ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی والد صاحب فوت ہو گئے (90)۔

آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ مولانا عبید اللہ سندھی سے پڑھی۔ آپ نے ۲۰۰۵ء/۱۴۲۶ھ میں انتقال کیا۔

مکاتیب مولانا عبید اللہ سندھی:

مولانا عبید اللہ سندھی نے مختلف ممالک میں اپنے دوستوں اور شاگردوں کو جو خطوط لکھے ان میں جتنی اتحاد کی تلقین کی۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے خطوط سے

۱۔ ان کے سیاسی فکر کے تعین میں بہت مدد ملتی ہے۔ سیاسی مسائل میں کیا اصول ان کے پیش نظر تھا۔

۲۔ ان خطوط سے ان کے کابل، ماسکو، ترکی، حجاز وغیرہ کے بارے میں مصروفیات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان خطوط میں ان کے سوانح کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

۳۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے سیاسی افکار و مسائل اور تحریک آزادی کے سلسلے میں خصوصاً ان مہا بھارت سرو راجیہ پروگرام میں بہت ہی اہم تذکرہ ہے۔

۴۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سندھی نے بہت مشکل زندگی گزاری۔

۵۔ یہ خطوط نہایت معلومات افزا اور عبرتوں کا مرقع ہیں۔

یہ حالات حافظ محمد صاحب (اسسٹنٹ لائبریرین) سندھ یونیورسٹی سے حاصل کیے گئے ہیں جنہوں نے سندھی ادبی بورڈ کے رسالہ مہران کے سوانح حیات نمبر مطبوعہ حیدر آباد ۱۹۵۷ء اصل مضمون بعنوان "مولوی عبداللہ لغاری اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ" سے اخذ کیے تھے اور پھر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل" از عبد اللہ لغاری مرتب کرتے ہوئے کتاب کے آخر میں لکھ دیے۔

فصل چہارم:

افکار مولانا عبید اللہ سندھی

ہم پر (جو قرآن کریم کو ماننے والے ہیں) قطعی طور پر لازم ہے کہ ہم تمام اقوامِ عالم کے سامنے ثابت کر دیں کہ انسانیت کے ہاتھ میں قرآن کریم سے زیادہ درست اور صحیح کوئی پروگرام نہیں۔ پھر ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ جو لوگ قرآن کریم پر ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی جماعت کو منظم کیا جائے۔ خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہم ان کی کسی اور حیثیت کی طرف نہ دیکھیں۔ بجز قرآن کریم پر ایمان لانے کے پس ایسی جماعت ہی مخالفین پر غالب آئے گی، لیکن ان کا غلبہ استبدادی شکل میں نہیں ہوگا، بلکہ ہدایت اور ارشاد کے طریق پر ہوگا۔ جیسا کہ والد اپنی اولاد پر غالب ہوتا ہے۔ اب اس نظام کے خلاف جو بھی اٹھ کھڑا ہوگا۔ وہ فنا کر دینے کے قابل ہوگا۔

۲۔ ظالم بزدل ہوتے ہیں اور لڑائی میں شجاعت کے ساتھ موصوف وہی لوگ ہوتے ہیں جو عادل ہوں اور قتال فی سبیل اللہ صرف عادل ہی کر سکتا ہے۔ ہم نے یہ بات سمجھی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کہ جو شخص چاہتا ہے کہ وہ عزیز اور محترم ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر ممکن طریق پر سعی اور کوشش کرے۔ ایسی حکومت کی تشکیل میں جس کی بنیاد ایسے قانون پر ہو جس کے بارے میں اس کو یقین ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور یہ سعی یقیناً اس شخص سے ہی ممکن ہوگی۔ جو عدل کو پسند اور ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور جوامت (جماعت) بھی عدل کے نقطہ نگاہ سے تشکیل پائے گی۔ تو ایسے لوگ ہی دنیا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے" (91)۔

۳۔ میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بے شک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر ابھرے گا، لیکن خارج میں اس کا ڈھانچہ وہ نہیں رہے گا جو اس وقت ہے" (ذاتی ڈائری، ص ۳۲)۔

۴۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے مسلمانوں کی داء عضال (لاعلاج بیماری) شاہ ولی اللہ کی حکمت کے مطابق دو چیزوں کو قرار دیا ہے: (۱) قرآن کریم کی حکمتِ عملی سے روگردانی (۲) دولت و ملت کے تمام اخلاقی اور عملی مفاسد کا مرجع اور مدار اقتصادی عدم توازن کو قرار دیا ہے"۔

۵۔ جوامت قرآن کریم کا پروگرام نہیں اپنائے گی۔ وہ کبھی کامیاب نہ ہوگی۔ مسلمان قرآن کی عالمی تنظیمی دعوت کا پروگرام لے کر اٹھے اور پھر وہ اپنی اس تنظیمی دعوت میں کامیاب ہو گئے اور یہ صرف پچاس سال کی مدت یعنی واقعہ صفین کی تحکیم تک ہوا۔ اب جب کوئی امت اپنی تنظیمی دعوت لے کر اٹھے گی، تو وہ کبھی بھی کامیاب نہ ہوگی جب تک وہ قرآن کے پروگرام کو نہ اپنائے۔ ہم نے یہ بات تحقیق سے دریافت کی ہے اور موجودہ دور میں عالمی تحریکات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارا ایمان اس بات پر پختہ ہو گیا ہے۔ لوگ بالعموم یہ جانتے ہیں کہ روسی انقلاب فقط ایک اقتصادی انقلاب ہے۔ ادیان اور حیات اخروی سے بحث نہیں کرتا اور ہم ان روسیوں کے پاس بیٹھے ہیں اور ان کے افکار و خیالات ہم نے معلوم کیے ہیں اور ہم نے بتدریج اور آہستہ آہستہ نرمی اور

لطافت سے امام ولی اللہؒ کا پروگرام جو انہوں نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں پیش کیا۔ ان روسیوں کے سامنے رکھا، تو انہوں نے اسے نہایت ہی مستحسن خیال کیا اور ہم سے پوچھنے لگے کہ کیا کوئی جماعت اس وقت ایسی ہے جو اس پروگرام پر عمل کرتی ہو۔ جب ہم نے نفی میں جواب دیا تو انہوں نے بہت افسوس کیا اور کہنے لگے۔ اگر کوئی جماعت اس پروگرام پر عمل کرنے والی ہوتی تو ہم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور ہم بھی ان میں داخل ہو کر ان کا مذہب اختیار کر لیتے اور یہ بات ہمارے لیے آسانی بنا دیتی۔ ہماری ان مشکلات کو جنہوں نے ہمارے پروگرام کو کسانوں میں نافذ کرنے سے روک رکھا ہے۔ یہ ان روسیوں کی بات کا بلا کم و کاست اور بغیر تحریف کے خلاصہ ہے۔ اس کے بعد مجھے یقین ہوا کہ یہ لوگ ہمارے قرآنی پروگرام کو قبول کرنے کی طرف مجبور ہوں گے۔ اگرچہ ایک زمانہ کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ ہم آج کے دور میں عالمی تحریکوں میں سے کسی تحریک کو ایسا نہیں پاتے کہ وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف اور مناقض ہو۔ جس طرح انقلابی روس کی تحریک قرآنی پروگرام کے مناقض اور مخالف ہے اور باوجود اس کے کہ وہ بھی مجبور اور مضطر ہیں کہ قرآن اور اس کے پروگرام کی طرف رجوع کریں۔ باقی تحریکات کا کیا پوچھنا اور اسی چیز نے میرے ایمان میں زیادتی اور قوت پیدا کر دی ہے کہ ہدایت اور فلاح قرآن کے نزول کے بعد صرف قرآن کریم کے اتباع پر ہی موقوف ہے" (92)۔

۶۔ جب کوئی قوم ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے جو نبی کے واسطے سے ملاء اعلیٰ کی جانب سے نازل ہوتی ہے اور اس پر عمل کرنے کا پختہ عزم کر لیتی ہے تو ملاء سافل کے ملائکہ اپنی جبلت سے مجبور ہوتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کی مدد کریں اور امداد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ملائکہ ان لوگوں کے دلوں میں فتح و کامرانی کے خیالات ڈالتے ہیں اور کفار و مخالفین کے قلوب میں شکست و ہزیمت کے خیالات اٹھاتے رہتے ہیں۔ مؤمنین کے حق میں اللہ تعالیٰ کی تائید ملائکہ کے ذریعے اس وقت ہوتی ہے جب وہ عمل کرنے کا پختہ عزم اور مؤکد ارادہ کر لیتے ہیں، چنانچہ بدر میں اس طرح ہوا تھا اور اُحد میں اس کے برخلاف واقعہ ہوا۔ جب کہ مجاہدین کے دلوں میں ہزیمت اور کمزوریوں کے خیالات سرایت کر گئے۔ یہ ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے جو ان سے سرزد ہوئی تھیں اس لیے تائید الٰہی سے اس موقع پر محرومی ہوئی۔ یہ چیز قیادت کی بے تدبیری کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی کیونکہ قیادت تو اس وقت خدا تعالیٰ کے سب سے بڑے رسول خاتم الانبیا ﷺ کر رہے تھے، بلکہ پیغمبر ﷺ نے تو اس دن بڑے عظیم کام انجام دیے اور لوگوں کے لیے مستقل دستور و قانون بنا دیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ آیا شہر سے باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کیا جائے یا شہر کے اندر ہی رہ کر شہر کی دیواروں کی پشت پناہی سے دشمن کے ہجوم کا مقابلہ کیا جائے۔ لوگوں کے خیالات مختلف تھے۔ اکثر نوجوان اور کچھ عمر رسیدہ لوگ (یہ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو پیچھے رہ گئے تھے) اس حق میں تھے کہ شہر سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور اس کے حملے کو روکا جائے اور اکثر شیوخ کی رائے تھی کہ شہر کے اندر ہی رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی رائے مبارک ظاہر نہیں کی تھی۔ تاکہ لوگ آزادی کے ساتھ اپنی اپنی رائے ظاہر کریں پھر آنحضرت ﷺ کی رائے مبارک شیوخ کی رائے کے موافق تھی۔ کیونکہ حضور ﷺ اس بات کو جانتے تھے کہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں اور ممکن ہے کہ شہر سے باہر نکلنے پر دشمن ان کو حقیر خیال نہ کرنے لگ جائیں لیکن اس کے برخلاف حضور ﷺ نے دیکھا کہ اکثریت کی رائے

باہر نکلنے کی ہے، تو آپ نے اسی رائے کو اختیار فرمالیا اور اپنی پہلی رائے ترک کر دی، کیونکہ اکثریت کی رائے تھی۔ اگر دیکھا جائے تو تمام روئے زمین پر یہ شوریٰ کا بہترین نمونہ اور قانون ہے۔ ہم نے اس سے بہتر کوئی قانون نہیں دیکھا، لیکن افسوس کہ مسلمانوں کا ایسے شوریٰ سے اعراض معروف ہے اور بعد میں مسلمانوں نے اس شورائی نظام کی حفاظت نہ کی۔ اس کے برخلاف استبداد کے ڈھیلوں کو خود یاد رکھا اور نتیجۃً اس سے اپنی حکومتوں کی بنیادوں کو متزلزل کیا اور اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے اپنی سلطنتوں کے ستون گرا دیے۔ اور پھر مستبد لوگ برسر اقتدار آ گئے۔ جس سے اسلام کی اجتماعیت باطل ہو کر رہ گئی بلکہ اجتماعیت کو سرے سے ہی انہوں نے گم کر دیا'' (93)۔

۷۔ خلافت اور رئیس کے باب میں صحیح نظریہ یہ ہے کہ خلافت تین باتوں کی طرف تقسیم ہوتی ہے:

۱۔ خلافت بغیر جماعت کے قائم نہیں ہو سکتی۔

۲۔ رئیس صرف اس جماعت میں سے ہو سکتا ہے۔

۳۔ رئیس کا انتخاب صرف یہی جماعت کر سکتی ہے۔ براہِ راست عوام اس کا انتخاب نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ چیز بالآ رنزاع وفساد، تنازع و جھگڑا کا رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس معاملے کا صحیح رُخ یہ ہے کہ جب امت مسلمہ میں سے کوئی امت یا جماعت ایسے آدمی کو آگے بڑھاتی ہے جو:

۱۔ کتاب اللہ کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔

۲۔ حضور ﷺ کے طور طریقوں اور آپ کی سنت و تعلیمات کو سب سے زیادہ جانتا ہو

۳۔ خلفائے راشدین کے حالات کو سب سے زیادہ جانتا ہو۔

۴۔ ضرورت کے وقت مصلحت خاصہ کے مقابلہ میں مصلحت عامہ کو زیادہ ترجیح دینے والا ہو۔ یعنی مصالح خاصہ کو مصالح عامہ کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ قربان کرنے والا ہو، تو ایسا شخص مرکز میں اپنی امت کے لیے نمونہ (نمائندہ) ہوگا اور جب اس قسم کے بہت سے نمائندے مرکز میں جمع ہوں، تو ایک خاصی صالح جماعت مجتمع ہو جائے گی اور اقوام کی اجتماعیت بن جائے گی (یعنی قرآن کریم کے قوانین جاری کرنا اس جماعت کی ذمہ داری ہوگی) اور جو قوم ایسی نمائندہ جماعت نہ بنا سکی تو اس کی ایک ذرہ کے برابر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں خواہ وہ اپنی ماضی کی تاریخ کے پیشِ نظر پدرم سلطان بود کہنے والی ہو یا اپنی باطل آرزوؤں میں ممکن ہو۔ جب ہم نے کتاب اللہ میں غور کیا اور آنحضرت ﷺ اور آپ کے خلفاء کے حالات میں غور کیا تو ہمیں یہ بات معلوم ہوئی ''السابقون الاوّلون من المهاجرين والانصار والّذين اتّبعوهم باحسان'' (توبہ)۔

اس مرکزی جماعت کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ہمیں معلوم ہوا کہ درحقیقت یہی جماعت تھی جس نے قرآن حکیم کے اوامر قوموں پر نافذ کیے اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ یہی لوگ خلفاء اللہ فی الارض ہیں۔ یہی جماعت جب اپنے درمیان کسی کو اپنے رئیس کے منصب پر منتخب کرتی ہے تو اس کو خلیفہ کہتے ہیں جب ایک خلیفہ فوت ہو جاتا ہے تو یہی جماعت دوسرے رئیس کو اس منصب کے لیے منتخب کر لیتی ہے۔ امت کے افراد کو اس کے انتخاب میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ ہاں امت یہ کر

سکتی ہے کہ کسی نمائندہ کو منتخب کر کے اس مرکزی جماعت کا رکن بنا لے، چنانچہ آنحضرت ﷺ تو مدۃ الحیات خلیفہ الخلفاء تھے، لیکن آپ کے بعد اس جماعت نے حضرت صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ کو اسی طرح منتخب کیا۔ خلیفہ کا نصب وعزل اسی جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ اب اگر امت اسلامیہ میں سے کوئی امت چاہتی ہے کہ کتاب اللہ کے اوامر کا نفاذ ہو سکے تو ایسی مرکزی جماعت اسی طرح تشکیل دے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی (پاکستان) افغانی، ثورانی، عربی یہ سب لوگ شرعی سلطنت کو پسند کرتے ہیں، لیکن ایسی حکومت کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ باوجودیکہ اوامر قرآنیہ کی تنفیذ آج بھی کوشش کرنے پر امم مسلمہ سے ممکن ہے۔ اگر سعی و کوشش ہی نہ کی جائے تو پھر کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ اوامر نافذ ہوں۔ درحقیقت ان اوامر کی تنفیذ کے راستہ میں رکاوٹ اور مایوسی اور کوشش نہ کرنا یہ مستبد سلاطین اور فاجس قسم کے ملوک وامراء اور ان کے معاون لوگ اور عیش پسند علماء کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے"(94)۔

ربا:

قرآن کریم میں خلافت الٰہیہ کے قیام سے مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک ایسی قوت پیدا کی جائے۔ جس سے اموال اور حکمت (علم ودانش) دونوں کو لوگوں میں صرف کیا جائے اور پھیلایا جائے۔ اب سودی لین دین اس کے بالکل منافی اور متناقض ہے۔ قرآن کریم کی قائم کی ہوئی خلافت میں ربا کا تامل کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ اس کا جواز تو ایسا ہی ہے جیسا کہ نور ظلمت کا اجتماع۔ ربا (سود) خواروں کے نفوس میں ایک خاص قسم کی خباثت پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے یہ ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اگر یہ خرچ کرتے ہیں تو ان کے سامنے اس کا اضعافاً مضاعفۃ (آل عمران: ۱۳۰) نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سود کی وجہ سے اقتصادیات میں جو فساد اور اخلاق فاضلہ کی تباہی اور بربادی اور فطرت انسانیہ میں بگاڑ اور لوگوں پر اقتصادی طور پر ضیق وتنگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قدر ظاہر باتیں ہیں جن کے بیان کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے قرآن عظیم نے سود کو روئے زمین سے مٹانے کا اعلان کیا ہے اور انسانیت کو اس کے لینے دینے والوں کے شر اور ظلم سے چھڑانے کا اعلان کیا ہے۔ سب سے پہلے مواعظ حسنہ کے ذریعے سودی کاروبار سے منع کیا ہے۔ اگر اس سے باز نہ آئیں اور متنبہ نہ ہوں تو پھر ان کے خلاف سخت لڑائی کا اعلان کیا ہے اور ایسے لوگوں کو سطح ارضی سے مٹانے کا چیلنج کیا ہے اور قرآن میں اس کی اساسی تعلیم بڑے محکم طریق پر دی گئی ہے۔ ربا سے منع کیا گیا ہے۔ سود خواروں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے، لیکن پوری طرح رشد وہدایت کے واضح ہونے کے بعد اور اس کی مضمون کی پوری طرح کھول کر بیان کر دینے کے بعد یقیناً یہ رشد وہدایت کے منافی اور خلاف ہے۔ اب اس کے خلاف جنگ یا کارروائی کرنا اکراہ نہیں ہوگا، بلکہ عین انصاف کا تقاضا ہوگا۔ اس طرح ایسی بڑی بڑی حکومتوں کو مٹانا اور منہدم کرنا ہے جو اس لیے منظم کی جاتی ہیں کہ سودی کاروبار کے ذریعے اموال کمائیں۔ ان کے خلاف خدا اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے، لیکن یہ کام جب ہی ہوگا۔ جب کہ مسلمانوں کی انقلابی قوت موجود ہوگی جو عالم میں ایسا کرے گی۔ اب جو آدمی مسلمانوں کو ایسی قوت پر جمع نہیں ہونے دیتا جو اس کی حکمت پر عمل پیرا ہوں تو ایسا آدمی یا بزدل ہوگا جس کو انسانیت

کے کسی درجہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا یا جاہل ہوگا، جس کو قرآن کریم کی تعلیم اور حکمت کا علم نہ ہوگا اور نہ اس نے قرآن میں کبھی تدبر کیا ہوگا یا سخت مخالف ہوگا جو قرآنی تعلیمات کی مخالفت کرتا ہے۔ بہر حال جو بزدل اور کمزور ہوگا اس کو ہم کہیں گے کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھ جائے اور جو جاہل ہوگا، اس کو ہم تعلیم دیں گے اور اس کی پوری طرح ان باتوں کی طرف رہنمائی کریں گے۔ جس میں اس کے لیے خیر اور بہتری ہوگی اور جو معاند اور مخالف ہوگا اس کو صفحۂ ہستی سے مٹائیں گے۔ خواہ وہ سلطان ہو جو لوگوں پر تسلط جمائے ہوئے ہے یا دینی رہنما ہو'' (95)۔

میں مطمئن ہوں کہ اسلام کا احیاء نشاۃ ثانیہ میں دو اصولوں پر ہوگا۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور جو آدمی ہماری اس بات پر متفق ہو، وہ ہماری جماعت کا فرد ہو گا۔ یہی ایک کلمہ تمام امور کے لیے کفایت کرنے والا ہے۔

۲۔ سود (ربٰو) کی قطعی حرمت اور اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ اس کو روکنا اور سود کھانے والوں کے خلاف اعلان جنگ کرنا۔ مسلمان ان دونوں اصولوں پر عمل پیرا ہوئے بغیر کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتے'' (96)۔

۹۔ جب مسلمان تمام قوموں میں سے ظلم اور جہالت دور کرنے کا پکا ارادہ کرلیں اور اس پر اپنی جان کی بازی لگا دیں تو وہ ضرور غالب آئیں گے۔ یہی انقلاب ہے اس صورت میں اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد کرے گا اور ان کی انقلابی جماعت چاہے وہ چھوٹی ہی ہو، بہت بڑی ارتجاعی طاقت پر غالب آجائے گی کیونکہ اس انقلاب کی بنیاد علم عقل اور عدل پر ہے۔ یہ انقلاب سب لوگوں کو اپنے ساتھ ملائے گا۔ ویثبت اقدامکم (تمہارے پاؤں مضبوطی سے گاڑھ دے گا)۔ جب تک کوئی چیز سوسائٹی کے صرف عقل مند طبقے میں رہتی ہے اور عوام میں نہیں آتی، وہ پائیدار نہیں ہوتی، لیکن جب وہ عوام میں گھر لیتی ہے وہ پائیدار اور مضبوط ہو جاتی ہے'' (97)۔

۱۰۔ ''ہمارے زمانے میں جب وہ مکمل نظام موجود نہیں جس کے بل بوتے پر جہاد کی تحریک ملک میں جاری کی جاسکے۔ جہاد کا ایسا نظام پیدا کرنے کی تیاری کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود جہاد پس اب ہر ایک عالم دعا کا فرض ہے کہ وہ قرآن حکیم کو غالب کرنے کے لیے لادینیت کی ہر شکل کے خلاف انقلاب لانے کی پوری پوری کوشش کرے اور اگر اس میں اسے مال و جان کا نقصان برداشت کرنا پڑے تو برداشت کرے'' (98)۔

۱۱۔ ''کہ دنیا سے ظلم کو دور کیا جائے، چاہے کسی شکل میں ہو اور اسے دور کر کے قرآن حکیم کی حکومت پیدا کی جائے، مثلاً ہمارے زمانے میں معاشی ظلم انتہا کو پہنچ چکا ہے اور یہاں عدم توازن کی وجہ سے عام لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اکثر لوگ غذا نہ ملنے یا ناقص غذا ملنے کی وجہ سے مر رہے ہیں اور صحیح تعلیم نہ ہونے کے سبب سے اپنے انسانی فرائض ادا نہیں کر رہے، اور نہ ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ انہیں اس حالت سے نکال کر ایسے حالات پیدا کرنا کہ وہ فکر معاش سے نجات پا کر اللہ کی یاد میں لگ سکیں، ہر اس شخص کا فرض ہے جو قرآن حکیم کی تعلیم کو مانتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ جان اور مال کی قربانی کے بغیر نہیں رہ سکتا'' (99)۔

۱۲۔ ''ہم ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے پہلی عمومی جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) میں حصہ لے کر بعض باتیں تجربے سے جان چکے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے دینی علوم اور ارشاد و احسان، بہترین عملوں میں سے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان عملوں سے کسی حالت یا کسی شکل میں کافروں کی مددنہ ہوتی ہو، نہیں تو اللہ تعالیٰ ان نیک اعمال کو بھی بیکار اور بے اثر کر دیتا ہے۔ مگر اگر کوئی صوفی اپنے مریدوں کو اللہ اللہ کرنے میں اتنا لگائے رکھتا ہے کہ وہ انہیں قرآن حکیم کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے تیار نہیں کر سکتا اور اس طرح کافروں کو فائدہ پہنچتا ہے تو ان نیک عملوں کے فائدہ مند ہونے میں شبہ ہے'' (100)۔

۱۳۔ ''اگر تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور قرآن حکیم کو غالب کرنے کی تحریک میں جان و مال سے کوشش نہ کی تو کوئی دوسری جماعت اس کام کے لیے تیار ہو جائے گی جو مال بھی خرچ کرے گی اور جان بھی لڑائے گی۔ وہ تم جیسی سست اور کاہل اور جان و مال سے دریغ کرنے والی جماعت نہ ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کا انٹرنیشنل نظام بہت بڑی قربانی کا طالب ہے۔ اس راہ میں بہت خطرے ہیں، لیکن آخرکار بین الاقوامی غلبہ اور عزت ہے۔ اللہ کے فضل سے حضرت محمد ﷺ کی تیار کی ہوئی جماعت نے جان اور مال سے کسی جگہ بھی دریغ نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جماعت کل قومی انقلاب کا مرکز بن گئی اور وہ انقلاب حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد جب عربوں نے اس بین الاقوامی تحریک کو قومی بنا لیا اور رفتہ رفتہ جان و مال سے دریغ کرنے لگے تو عجمی قومیں غالب آ گئیں۔ قرآن کی سرمایہ شکن طاقت بہرکیف غالب رہنی چاہیئے۔ جب اس کی سرمایہ شکنی میں فرق آئے گا اور سرمایہ پرستی پیدا ہوگی ضرور انقلاب آئے گا اور کوئی نہ کوئی سرمایہ شکن طاقت اوپر آ جائے گی، لیکن قرآنی انقلاب وہ ہے جس میں سرمایہ شکنی کے ساتھ خدا پرستی شامل رہے گی'' (101)۔

۱۴۔ مسلمانوں کی جماعت میں جو ایک عظیم الشان بین الاقوامی انقلاب کی داعی ہے، شامل ہونا اللہ تعالیٰ کے کمزور بندوں کی خدمت کر کے خدا تعالیٰ کے ہاں سرخروئی حاصل کرنا، بہت بڑی رحمت ہے'' (102)۔

۱۵۔ ''جہنمیوں سے جب ناکامیوں کے اسباب پوچھے جائیں گے تو جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔ یعنی انسانی بھلائی کے اس پروگرام پر عمل نہ کرتے تھے جو اتحادِ فکر، اجتماعیت اور مساوات وغیرہ بیسیوں بھلائیاں سکھاتا ہے اور جس کا انتہائی معراج اللہ کے ساتھ تعلق ہے۔ یاد رہے کہ انسان کے قلب میں خدا شناسی کی جو قوت چھپی ہوئی ہے جب اسے نماز ترقی دیتی ہے، تو انسان کے اندر ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ گویا وہ اس آئینے میں خدا کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تجلی جو اسے اپنے قلب میں نظر آتی ہے۔ انسان کبیر امام نوعِ انسانی کے قلب کی تجلی کا پرتو ہوتی ہے۔ یہاں تک ترقی کر جانے کا نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان انسانیت کے تقاضوں کو خدا کا حکم سمجھنے لگ جاتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کے کمزور اور مسکین بندوں کا چاکر (خدمت گزار) سمجھنے لگ جاتا ہے، جسے کسی دوسرے بندے کے حقوق کا چھیننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اب وہ ہر وقت خدمتِ انسانیت کے لیے تیار رہتا ہے اور اسے خدا کی عبادت کا جزو جانتا ہے'' (103)۔

۱۶۔ ''اس وقت یورپ میں امپیریلزم (imperialism) کے ردِ عمل کے طور پر جو غلط سیاست اور غلط مذہبیت کی پیداوار تھا۔ کمیونزم (communism) پیدا ہو چکا ہے۔ اس میں خدا کا انکار لازم ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے انکار کی وجہ ہی

سے وہ بھی امپریلزم کی شکل اختیار کرتا چلا جارہا ہے۔ اس کا پہلا قدم استعماریت (colomalism) ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ امپریلزم ہوگا۔ اسے اس دوسری بڑی جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) میں امپریلسٹ طاقتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑا۔ جس کی وجہ سے اسے اپنا کمنٹرن (cumintern) یعنی بین الاقوامی نظام توڑ کر ان سرمایہ دار طاقتوں کے ساتھ مصالحت (compromis) کرنی پڑی۔ نام نہاد کمیونزم میں جس قدر مسکین نوازی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مسکین نوازی امام ولی اللہؒ کے فلسفے میں ہے اور اس میں مزدور اور کاشت کار کے حقوق کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، لیکن اس کی بنیاد خدا کے صحیح اور صاف تصور پر ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک کارکن اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زندہ تصور کے ساتھ گزارتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے سامنے ہے یا کم از کم یہ کہ خدا تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ تصور بھی ایک زندہ اور پائیدار شکل میں اپنے سامنے رکھتا ہے کہ اگر اس نے کم تولا یا کسی کے حق کو ناجائز طور پر پاؤں تلے روندا تو وہ دنیا میں بھی سزا پائے گا۔ اور مرنے کے بعد بھی اسے خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوکر اپنے عملوں کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ امام ولی اللہ صاحب کی حکمت اسے یہ بھی سکھاتی ہے کہ قرآن حکیم پر عمل کرنے والے کارکن کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے اپنے عمل کا بدلہ لینا ضروری نہیں، انسان بے شک اس لیے پیدا ہوا ہے کہ دنیا میں قرآن حکیم کی حکومت بین الاقوامی درجہ پر چلائے۔ لیکن وہ اس حکومت کے ذریعے سے اپنے لیے یا اپنے خاندان کے لیے کوئی فائدہ حاصل کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ قرآن حکیم کی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی حکومتیں بے نظیر ثابت ہوئیں اور آج تک دنیا ان کی مثال پیدا نہیں کر سکی، اب اس دور میں بھی امیر المؤمنین سید احمد شہید (۱۸۳۱ء-۱۷۸۶ء) اور ان کے ساتھیوں نے انہی اصولوں پر اس نمونے کی حکومت پیدا کر کے ایک دفعہ پھر دکھا دی اور ثابت کر دیا کہ اس قسم کی حکومت پیدا کرنا ہر زمانے میں ممکن ہے۔ قرآن حکیم جاننے والوں کے لیے اس میں بہت بڑی عبرت اور ذمہ داری ہے"(104)۔

۱۷۔ جو لوگ ہمت اور طاقت کے باوجود جہاد میں حصہ نہیں لیں گے۔ انہیں دوسری قوم کی غلامی کے عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا اور جو لوگ اس عذابِ غلامی میں مبتلا ہونے کے باوجود اس سے بچنے کی پوری کوشش نہ کریں گے، انہیں اس میں مبتلا رکھا جائے گا"(105)۔

۱۸۔ مشاورت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن اسلامی حکومتوں کو شوریٰ سے خالی کر کے مطلق العنان انسان جاہل حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنا دیا گیا۔ وہ مسلمانوں کی امانت (سرکاری خزانے) سے اپنی شہوت پرستیوں پر روپیہ صرف کرتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی مصلحت کے مقابلے میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس قسم کی غلطیوں کا خمیازہ مسلمانوں کو صرف اس غلط تفسیر کی وجہ سے بھگتنا پڑا۔ ورنہ ہر ایک مسلمان ایک حاکم کے اوپر ننگی تلوار ہے اور وہ حاکم کیوں قانون الٰہی کی اطاعت نہیں کرتا؟ اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنا پر ہم سے اطاعت کا طلب گار ہوتا ہے۔ یہ طاقت مسلمانوں میں پھر سے پیدا ہو سکتی ہے اور اس سے ان کی جماعتی زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے"(106)۔

۱۹۔ "واقعہ یہ ہے کہ جس دن سے مسلمانوں نے موت قبول کرنے کا یہ فکر چھوڑا ہے اسی دن سے ان کی حکومتیں برباد ہونے لگی ہیں۔ اب ہم اس حالت کو دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری زندگی ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہے"(107)۔

۲۰۔ آسمان کی بادشاہی تو فرشتوں کے ذریعے سے ہے۔ زمین کی بادشاہی اس جماعت کے ذریعے سے قائم ہوگی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو زمین میں چلائیں گے۔ یہ انقلاب حضرت عثمانؓ کی شہادت تک رہا۔ اس وقت حجاز میں خدا کی بادشاہی قائم تھی۔ قرآن کا قانون تھا اور اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت تھی۔ وہ اپنے آپ کو قانون کا مالک نہیں سمجھتی تھی۔ بلکہ اپنے آپ کو خدا کا نائب سمجھ کر اس کے حکموں کو بجالاتی تھی اور ان پر عمل کراتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے خود خدا کا نائب (خلیفۃ اللہ) بن کر اپنے ساتھیوں کو جو خدا کے قانون کی عزت اور وقار قائم کرنے میں آپ کے شریک تھے، اپنے ذریعے سے خدا کا نائب (خلیفۃ اللہ) بنادیا'' (108)۔

۲۱۔ قانون کی پابندی کا انتظام ایک جماعت کے ذریعے ہی سے ہوسکتا ہے اور وہ حکومت کرنے والی جماعت ہی ہوسکتی ہے۔ قانون کا انتظام کرنے والی جماعت کا فرض ہے کہ وہ امانت دار ہو، اور اپنا فرض ادا کرنے والی ہو۔ صحیح طور پر قانون کی پابندی کرنے والی جماعت کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ قانون کی تعلیم عام لوگوں کو اس طرح دینا شروع کرے، جیسے باپ اپنی اولاد کو پڑھاتا ہے۔ پھر قانون کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دینا بھی انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ وہ مخالف جماعتیں یا تو اس پارٹی کے اندر ہوں گی یا باہر، جو اندر ہوں گی۔ انہیں قانون توڑنے کی سزا دینے کا نام تعزیر ہے اور جو باہر ہوں گے، ان سے جنگ کرنی پڑے گی۔ تعزیر اور جنگ دونوں میں جتنی قوت استعمال کرنی ضروری ہے۔ اتنی ہی استعمال کرنی چاہئے۔ یہ قانون چلانے والی پارٹی عام لوگوں سے فقط قانون کی پابندی کرائے گی اور ان کی طرح خود بھی اس قانون کی پابندی کرے گی۔ وہ ان سے اپنی خواہشوں کی پیروی نہیں کرائے گی، کیونکہ یہ ظلم ہے۔ قانون کی صحیح پابندی کے لیے عربی زبان میں اصطلاحی لفظ تکلیف بولا جاتا ہے۔

۲۲۔ ''میں نے حضرت شیخ الہند کے حکم سے ۴ شوال ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ کو ہندوستان چھوڑا اور حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ کی خواہش پر اوائل ۱۳۵۸ھ میں واپس آیا۔ اس عرصہ میں ایسے حالات سے دوچار ہوتا رہا ہوں کہ کبھی موت کے منہ میں جا کر بچ نکلا اور کبھی غلبہ یاس کے بڑے اثرات سے بچنے کے لیے ایسی جماعتوں سے متحد ہوکر کام سوچتا رہا جن سے بحالت اطمینان شاید معمولی طور پر ملنا بھی جائز نہ سمجھتا'' (109)۔

۲۳۔ ''میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوا اور بچپن سے دریائے سندھ کے کنارے جام پور ضلع ڈیرہ غازی خان میں پرورش پائی۔ یہیں میں نے اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ اسلام میں نے ایک پنڈت سے سیکھا ہے، ہمارے ملک میں برطانوی قبضہ کے بعد دو دفعہ ہندو سوسائٹی کی اصلاح شروع ہوئی۔ دونوں میں اس قدر فرق ہے جیسے ایکسٹریمسٹ (Extrimist) اور ماڈریٹ (Moderate) میں ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ پنڈت اننت رام نے پرانوں کی شرک آمیز تعلیم کا اسلامی توحید سے مقابلہ کیا اور آخر میں خود مسلمان ہوگیا۔ وہ مسلمانوں میں پنڈت مولوی کے نام سے مشہور ہوگا۔ اس کی تحریک پنجاب میں خوب پھیلی۔ سینکڑوں ہندو نوجوان مسلمان ہوگئے۔ میں سولہ برس کی عمر میں ۱۸۸۷ء/۱۳۰۵ھ میں اس کی کتاب تحفۃ الہند کو بار بار پڑھنے سے اسلام لایا۔ میں نے اپنا نام عبیداللہ پنڈت مولوی کے نام پر خود رکھا ہے۔ میں نے اپنے ہم جماعت

طالب علموں سے نماز سیکھ لی۔ اس زمانہ میں جب میں گھر پر تنہائی میں نماز پڑھتا تو اس قدر سرور حاصل ہوتا جواب تک باوجود اس قدر علم پڑھنے کے اور عمر گزارنے کے کبھی کبھی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس تحریک کو انتہا پسند سمجھنا چاہیئے'' (خطبات، ص ۱۰۳)۔

۲۴۔ میرا خیال ہے اسی طرح اگر نیا اصلاح شدہ عربی نصاب ہمارے مدارس میں غالب آ گیا تو یقین مانیے کہ ہم حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتاب سمجھنے سے عاری ہو جائیں گے۔ ہمارا اپنا فلسفہ جب ذہن سے نکل گیا تو ہم ہر طرح بہکائے جا سکتے ہیں'' (110)۔

۲۵۔ ہندوستانی مسلمان دو برس سے سوتا رہا ہے۔ اس نے اپنے اعلیٰ درجے کی مفکرین کی بے قدری کی، اس نے اپنے خیر خواہوں کو دشمنوں کے ہاتھ قتل کرایا۔ اس قسم کی غلطیاں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کی اکثریت سے تنہا تنہا بار ہا ہوتی رہی ہیں۔ ورنہ ٹیپو سلطانؒ اور مولانا محمد اسماعیلؒ کی جماعتیں یوں شہید نہ ہوتیں۔ انقلاب کا مرکز بننے کی جو قدرتی صلاحیت ہندوستان کے مسلمان میں مستتر تھی۔ ان غلطیوں سے وہ انفرادی استعداد برباد ہو چکی ہے (111)۔

۲۶۔ بے شک ہندو مذہب عیسائیت اور یہودیت کی طرح پرانے زمانے میں سچائی کا مالک تھا، لیکن میں نے دیکھا ہے اس میں اب شرک مل گیا ہے، آپ کو اگر ہندو مذہب کی حقیقت معلوم کرنا ہو تو حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے مکتوبات پڑھیے جو کلمات طیبات نام کی کتاب میں آپ کو ملیں گے (112)۔

۲۷۔ روس کے انقلاب کی دو مرکزی شخصیتیں تھیں۔ کارل مارکس اور لینن۔ میں نے اپنی انقلابی دعوت کے لیے امام ولی اللہؒ اور امام محمد قاسمؒ دو امام چنے ہیں۔ انقلاب روس لادینی ہے اور میرا انقلاب امام ولی اللہؒ کی تعلیمات کا عین خلاصہ اور نچوڑ ہے (113)۔

۲۸۔ ہمارا خیال ہے کہ الصدر الشہید (مولانا شاہ اسماعیل دہلویؒ) کو اگر خلافت کبریٰ سونپی جاتی تو اسے فاروق اعظمؓ کی طرح چلاتے۔ امیر شہیدؒ نے انہیں خدمت خلق پر اپنے اسوہ حسنہ سے لگایا تو وہ گھوڑوں کے لیے گھاس کھودتے تھے۔ ان کی کتاب تقویۃ الایمان میرے اہتداء بالاسلام کا واسطہ بنی ہے۔ اس لیے وہ میرے مرشد اور امام ہیں رضی اللہ عنہ۔

۲۹۔ مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ہم نے اپنا پروگرام بنا لیا کہ ان تبدیل شدہ حالات میں ہم کس طرح اپنے مسلک پر قائم رہ سکتے ہیں۔ یورپین فلاسفی اور ہندی فلاسفی کے ماہرین سے ہم ولی اللہ فلاسفی کا کس طرح تعارف کرا سکتے ہیں۔ ہم اس راستہ پر گرتے پڑتے قدم بڑھا رہے ہیں۔ ہر ایک غلطی کی اصلاح کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں لیکن امام ولی اللہ کی حکمت و سیاست کی جو انقلابی روح ہماری سمجھ میں آ چکی ہے۔ اس میں ایک ذرہ کا فرق بھی برداشت نہیں کر سکتے'' (114)۔

۳۰۔ ہماری سرگزشت ناکامیوں کی طویل فہرست ہے اور غلط کاریوں کے اعتراف سے بھری ہوئی ہے، لیکن اس میں ایک خوبی ضرور محسوس ہو گی، اس میں مایوسی کا شائبہ تک بھی نہیں ہے۔ ہمیں حضرت شیخ الہندؒ کی وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے۔

ایمن مشو کہ مرکب مردان راہ را

در سنگلاخ بادیہ پے ہا بریدہ اند

تو میدہم مباش کہ رندان بادہ نوش

ناگہ بیک خروش بہ منزل رسیدہ اند

ترجمہ: بے فکر نہ رہو کہ لوگوں کی سواریوں کے پتھریلی زمین میں پاؤں زخمی ہو چکے ہیں۔ نا اُمید نہ ہو کیونکہ شراب پینے والے رند ایک ہی چھلانگ میں منزل تک جا پہنچے ہیں۔

۳۱۔ ہندو جب بھی کوئی نیا نظام پیدا کرتا ہے، تو اس کی بنیاد سرمایہ داری پر ہوتی ہے۔ چنانچہ گاندھی جیسا شخص بھی انسانیت کا اتنا بڑا نمائندہ بن کر سرمایہ داری سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکا۔ اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو کیمونسٹ ہیں، مگر وہ بھی سرمایہ دار ہیں۔ ان کے مقابلے میں حسرت موہانی کو لیجیے۔ جس دن اس نے اشتراکیت قبول کی، وہ اپنی تمام جائیداد ختم کر چکا اور اب وہ ایک کوڑی کا بھی مالک نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے یورپ جا کر سوشلسٹوں کے ساتھ رہ کر سوشلزم سیکھا۔ مگر حضرت اپنی ذاتی فکر و کاوش سے اس مرتبے پر پہنچا ہے۔ یہ فرق ہے مسلم سوسائٹی اور ہندو سوسائٹی میں مسلم جس وقت اپنے اصلی نظام پر آئے گا۔ وہ سرمایہ داری کا بت توڑنے والا ہوگا اور آج دنیا میں سرمایہ داری کے سوا اور کون سا بڑا بُت ہے جسے توڑنے کی ضرورت ہے''۔

یہ چند افکار ہیں جن کی روشنی سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا سندھیؒ کی طرف جس قسم کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں، وہ قطعاً غلط ہیں۔ مولانا نہ تو کیمونسٹ تھے اور نہ اسلام کو ترک کیا، بلکہ مولانا انتہائی درجہ کے مخلص مسلمان تھے اور اسی حالت میں انہوں نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کی۔

کتب:

۱۔ تفسیر المقام المحمود (از عبید اللہ سندھی):

جامع: عبد اللہ لغاری۔

مدون: ڈاکٹر منیر احمد مغل، صفحات ۴۳۲، اشاعت ۱۹۸۲ء۔

مطبع: مکتبہ رشیدیہ لاہور۔

سورۃ الفاتحہ اور سورہ البقرہ پر مشتمل وہ مقالہ ہے، جس کی تدوین پر منیر احمد مغل کو سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا ہوئی۔ فاضل محقق نے اسے انگریزی اور اردو میں بیک وقت مرتب کیا۔

مولانا سندھی کی تفسیر کے خصائص وہی ہیں۔ جو مختلف تفسیروں کی ہوتی ہیں۔ لیکن متن کی صحت، حواشی کے التزام میں جو اہتمام ڈاکٹر منیر احمد مغل نے کیا ہے۔ وہ کسی اور تفسیر میں نہیں۔ تفسیر کے شروع میں مندرجہ ذیل تحریریں شامل ہیں:

۱۔	گزارش احوال واقعی	عبد الرشید ارشد
۲۔	تقدیم	مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔
۳۔	چند اقتباسات	مولانا سعید الرحمٰن علوی۔

۴۔ تشکر ڈاکٹر منیر احمد مغل۔

۵۔ مقدمہ (مولانا عبیداللہ سندھی)

ان کے حالات زندگی اور تبحر علمی ڈاکٹر منیر احمد مغل۔

۶۔ تفسیر کی اہمیت ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ۔

۷۔ مولانا عبداللہ لغاری کے حالات زندگی ڈاکٹر منیر احمد مغل۔

۳۔ الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن

از مولانا عبیداللہ سندھی، جلد اوّل، سورۃ فاتحہ تا سورۃ المائدہ۔

جامع (عربی) مولانا علامہ موسیٰ جاراللہ مترجم: مولانا عبدالرزاق و مولانا محمد قاسم۔

صفحات: ۴۷۲ مطبع، مسعود پرنٹرز، لاہور۔

ناشر: ادارہ بیت الحکمہ الامام ولی اللہ دہلوی کبیروالہ، ضلع ملتان۔

علامہ جاراللہ کے مقدمہ و سورہ فاتحہ کا ترجمہ محمد قاسم نے اور سورہ بقرہ تا مائدہ کا ترجمہ مولانا عبدالرزاق نے کیا ہے۔

تفسیر کے ساتھ مندرجہ ذیل تحریرات شامل ہیں:

۱۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے فکری اور انکی تفسیر کے خصائص پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۲۔ عرض ناشر، مولانا ابو معاویہ عبیدالٰہی

۳۔ پیش لفظ و مقدمہ، علامہ موسیٰ جاراللہ۔ جلد دوم: سورہ انعام تا سورہ توبہ۔

جامع (عربی) مولانا موسیٰ جاراللہ، مترجم اردو، مولانا محمد قاسم۔

ناشر: بیت الحکمۃ، کبیروالا، ضلع ملتان۔

۳۔ القاء الرحمٰن فی تفسیر الہام الرحمٰن از مولانا عبیداللہ سندھی۔

جامع علامہ موسیٰ جاراللہ، مترجم اردو محمد اسماعیل گودھروی۔

سورۃ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی اصل عربی مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب الہام الرحمٰن کے نام سے مرتب کر کے بیت الحکمۃ کراچی سے شائع کر چکے ہیں۔ یہ تفسیر اور اس کا اردو ترجمہ ہے۔

مترجم اردو محمد اسماعیل گودھروی خاندان ولی اللہی سے علوم و معارف سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی ملاقات سندھی صاحب سے ۱۹۳۶ء میں مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ وہ مولانا سندھی کے علم و فضل سے بہت متاثر ہیں۔ الہام الرحمٰن کا یہ اردو ترجمہ ان کے تاثر اور عقیدت کا بین ثبوت ہے۔

۴۔ عبقات: از شاہ اسماعیل شہید

اردو ترجمہ: مولانا عبیداللہ سندھی، صفحات ۱۵۱۔

کاتب: شیخ ابوسعید ابن عبدالرحمٰن عبدالمجید، سال کتابت جمادالثانی ۱۳۵۴ھ،۱۹۳۵ء۔

۵۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا افتتاحی خطبہ، صفحات ۲۴، اشاعت اوّل جنوری ۱۹۴۰ء

مطبع: بلوچ لیتھو پریس کراچی۔

ناشر: جمنا نربدا، سندھ ساگر پارٹی کراچی۔

مولانا سندھی کا یہ وہ خطبہ ہے جو مولانا نے ضلع کانگریس کمیٹی کی ٹھٹھہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں ۱۲ جنوری ۱۹۴۰ء کو پڑھا تھا۔

۶۔ مولانا عبیداللہ کے سیاسی مکتوبات (ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی کے نام)۔

مرتب: پروفیسر محمد اسلام، صفحات ۹۱، مطبع عالیہ لاہور۔

ناشر: ندوۃ المصنفین، کمن آباد، لاہور۔

۷۔ آپ بیتی: از ظفر حسن ایبک۔

حصہ اوّل: صفحات ۲۶۷، اشاعت اوّل ۱۹۶۵ء۔

مطبع: اشرف پریس لاہور۔

ناشر: منصور بک ہاؤس لاہور۔

حصہ دوم: صفحات ۱۷۱، اشاعت اوّل، ۱۹۶۵ء۔

مطبع: منصور ایجوکیشنل پریس لاہور۔

ناشر: منصور بک ہاؤس لاہور۔

یہ کتاب مولانا سندھی پر نہیں ہے لیکن کابل، ماسکو اور ترکی میں مولانا سندھی کی مصروفیات کے بارے میں ایک مستند کتاب ہے۔

۸۔ شرح حجۃ اللہ البالغہ، مولانا عبیداللہ سندھی۔

۹۔ قرآنی اصول انقلاب "

۱۰۔ قرآنی فکر انقلاب "

۱۱۔ قرآنی دستور انقلاب، از مولانا عبیداللہ سندھی، صفحات ۱۷۲، اشاعت ۱۹۴۴ء۔

مطبع: فی المطبعۃ العربیۃ ۳۰، لیک روڈ بالمقابل منشی چیمبر، پرانی انارکلی لاہور۔

ناشر: ادارہ نشریات اسلام، اردو بازار لاہور۔

۱۲۔ قرآنی عنوان انقلاب، مولانا عبیداللہ سندھی، صفحات ۱۴۴، مرتبہ شیخ بشیر احمد لدھیانوی۔

ناشر: مکتبہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ۔

یہ سورۃ فتح کی حکیمانہ انقلابی تفسیر ہے۔

۱۳۔ قرآنی جنگ انقلاب، مولانا سندھی، صفحات ۹۷، مرتبہ شیخ بشیر احمد (بی اے) لدھیانوی۔

مطبع: مکتبہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ۔

ناشر: شیخ بشیر احمد بی اے لدھیانوی نے طبع کرا کے ادارہ حکمت اسلامیہ ۲۲۳، این سمن آباد لاہور سے شائع کیا۔ یہ سورہ محمد کی حکیمانہ انقلابی تفسیر۔

۱۴۔ شعور و آگہی:

۱۵۔ اساس انقلاب: صفحات ۶۴۔

مطبع: مکتبہ حنفیہ اردو بازار گوجرانوالہ۔

ناشر: ایضاً۔

۱۶۔ التمہید التجدید (عربی) از مولانا عبید اللہ سندھی۔

۱۷۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ از مولانا عبید اللہ سندھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے تفسیر، حدیث، تصوف اور حکومت و فلسفہ پر بڑی نادر اور بے مثال کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا سندھی نے اس کتاب میں شاہ صاحب کے ان معارف کا ایک مختصر خاکہ پیش فرمایا ہے۔

۱۸۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک:

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہے جس کے نہ جاننے سے آج مسلمان پریشان ہیں۔

۱۹۔ قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟ مولانا عبید اللہ سندھی۔

۲۰۔ کابل میں سات سال (ذاتی ڈائری) مولانا عبید اللہ سندھی۔

- صفحات: ۱۶۰، مرتبہ: محمد سرور اشاعت: اکتوبر ۱۹۸۷ء۔

ناشر: محمد صدیق پبلشرز، سندھ ساگر اکادمی لاہور۔

مطبع: ایچ وائی پرنٹرز لاہور۔

۲۱۔ خطبات مقالات۔ مرتبہ محمد سرور۔

صفحات: ۲۸۷۔

ناشر: محمد صدیق۔

پبلشر: سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور۔

مطبع: ایچ، وائی پرنٹرز، لاہور۔

اشاعت: اکتوبر ۱۹۸۷ء۔

تحریک ریشمی رومال

حضرت سندھی اور نصر اللہ خاں نے مل کر ایک ماہر کاریگر سے ایک ریشمی رومال اس طرح بنوایا کہ اس کی بناوٹ میں معاہدہ کی پوری عبارت اور تاریخ حملہ کی منظوری کی عبارت بھی بُن دی گئی۔ یہ عبارت عربی زبان میں تھی اور دستخط حبیب اللہ اور اس کے تینوں بیٹوں یعنی امان اللہ، نصر اللہ اور عنایت اللہ خاں کے ایک دفعہ تو بُننے میں آ گئے تھے۔ پھر اس رومال کے اوپر ان چاروں کے دستخط زرد رنگ کی سیاہی سے کروائے گئے۔ یہ رومال بھی زرد رنگ کا تھا جس کی لمبائی ایک گز تھی اور عرض بھی اتنا ہی تھا۔ ایک رکن تحریک جو پیغام رسانی کا کام کیا کرتے تھے اور افغانستان و ہندوستان میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ہندوستان کا کپڑا افغانستان لے جاتے اور پھر افغانستان کا ہندوستان اس طرح ان کا کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا اور ساتھ ہی تحریک کی پیغام رسانی کا کام بھی اچھی طرح انجام دیتے تھے۔ حضرت مولانا شیخ الہند سے بیعت تھے اور آپ کی اس تحریک کے معتمد علیہ رکن بھی تھے۔ یہ نومسلم نوجوان تھے۔ انگریزی ایم اے تھے معاملہ فہم اور زیرک شخص تھے۔ ان کا اسلامی نام شیخ عبدالحق تھا۔ یہ بنارس کے ایک ہندو لڑکے تھے۔

یہ بہت بڑے رئیس خاندان سے تھے، اسلام کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا۔ غرضیکہ ریشمی رومال ان کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ حسب ہدایت اسے لے کر پشاور پہنچے۔ رومال ان کے تجارتی پارچات میں تہہ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے اسی قسم کے رومال پانچ درجن خرید لیے تھے اور انہی میں یہ بھی رکھوا لیا تھا۔ اس لیے سرحد پر کسی کو پتہ نہیں ہوسکا۔ ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ اگر ہوسکے تو خود حیدر آباد سندھ میں شیخ عبدالرحیم صاحب کو دے دیں اور شیخ عبدالرحیم کو مولانا ہادی حسن صاحب پہلے پروگرام دے چکے تھے کہ یہ رومال لے کر حج کو جائیں اور وہاں شیخ الہند کے حوالے کر دیں اور اگر شیخ عبدالحق کو کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو یہ رومال پشاور میں تحریک کے رکن خان بہادر حق نواز صاحب کو دے دیں اور ان کو یہ سب ہدایات سمجھا دیں۔ چنانچہ شیخ عبدالحق صاحب کا پہلے تو یہی ارادہ تھا کہ خود حیدر آباد سندھ جائیں گے اور یہ امانت منزل مقصود تک پہنچا دیں گے۔ مگر پشاور اور سرحد پر اس دفعہ اتنی پوچھ گچھ اور تلاشی ہوئی کہ آپ کو خطرہ محسوس ہوا اور آپ نے ارادہ بدل دیا اور ریشمی رومال حق نواز خاں کے حوالے کر کے ہدایات دے دیں۔ حق نواز خاں کو یہ امانت رات کو نو بجے ملتی ہے آپ اسے سحری کے چار بجے روانہ کر دیتے ہیں۔ اور آپ کے با اعتماد آدمی نے یہ امانت بہاولپور میں دین پور سجادہ نشین خواجہ غلام محمد کو دینی تھیں۔ وہ پیغامبر بخیر و عافیت اس کو دین پور خواجہ صاحب کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ ادھر پشاور میں صبح کی نماز سے پہلے ہی حق نواز کے مکان پر فوج کا چھاپہ پڑتا ہے لیکن وہ چیز تو اب نکل چکی تھی۔ خان صاحب کو گرفتار کر لیا اور زبردست پوچھ گچھ ہوئی۔ لیکن آپ مضبوط رہے۔ اور جو کچھ پوچھتے رہے۔ آپ انکار کرتے رہے۔ ایک ماہ بعد آپ کو رہا کر دیا گیا۔ ادھر دین پور میں امانت پشاور سے صبح چل کر دوسرے دن صبح تقریباً دس بجے پہنچتی ہے۔ جنگ کا زمانہ تھا اس لئے آپ نے بھی ایک معتمد آدمی کے ہاتھ بارہ بجے سندھ روانہ کر دی۔ یہ امانت تو خواجہ صاحب نے سندھ روانہ کر دی مگر شام کے چار بجے فوج پہنچ گئی۔ مکان کا محاصرہ کر کے تلاشی لی جاتی۔ دس بجے رات تک لیتی رہی مگر کچھ برآمد نہ ہوا۔ مگر خواجہ صاحب کو پہلے بہاولپور پھر فیروزپور لے جا کر پوچھ گچھ کی گئی۔ آپ نے کچھ نہ بتایا تو قید کر دیا۔ چار ماہ بعد رہا ہوئے۔ ادھر یہ

امانت دوسرے دن ظہر کو شیخ عبدالرحیم صاحب کو ملتی ہے۔ وہ عشاء کو اس ریشمی رومال کو اپنے ایک کپڑے میں رکھ رہے تھے کہ حلیہ بدل کر ابھی گھر سے روپوش ہو جاتا ہوں۔ انہوں نے حلیہ بدل لیا تھا۔ اب صرف اس رومال کو اپنے ایک فقیرانہ رومال میں چھپانا چاہتے تھے۔ انہوں نے رومال نکالا ہوا تھا۔ ہاتھ میں سوئی دھاگا لئے اس کو گودڑی میں سی رہے تھے کہ اچانک فوج دیواریں پھاند کر اندر آ گئی۔ انہوں نے اس ریشمی رومال پر قبضہ کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اتنے میں یہ بھی دیواریں پھاند کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ایسے فرار ہوئے کہ آج تک پتہ نہیں چلا۔ آپ مسٹر کرپلانی کے حقیقی بھائی تھے۔ مولانا سندھی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اسلامی نام شیخ عبدالرحیم رکھا۔ غالباً آپ اس لئے روپوش ہوئے کہ کہیں حکومت کے تشدد سے گھبرا کر میں تحریک کے راز نہ بتا دوں جس سے کہ میرے بزرگوں کو تکلیف ہو۔ کہتے ہیں کہ آپ روپوشی کی حالت میں روس چلے گئے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں ہندوستان میں فقیری حالت میں رہے اور آخر سرہند میں انتقال کر گئے۔ واللہ اعلم! لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اپنے بزرگوں کی بھلائی کے لئے اپنی زندگی ختم کر دی۔ اس کا نام صحیح محبت اور عقیدت ہے۔

غرضیکہ ریشمی رومال حکومت کو مل گیا اور اس کے ذریعے رازہائے سربستہ معلوم کر لئے گئے۔ اس سے پہلے بھی تحریک کی پوری رپورٹ سی آئی ڈی حکومت کو دیتی رہی تھی مگر ان کے پاس کوئی تحریری ثبوت نہیں تھا۔ اب جب کہ حکومت کو تحریری ثبوت مل گیا تو سی آئی ڈی کی پچھلی سب رپورٹوں پر یقین ہو گیا۔ اب رہی یہ بات کہ ریشمی رومال کی رپورٹ حکومت کو کس نے پہنچائی۔ مولانا سندھی کو کسی نے غلط بتایا کہ حق نواز نے یہ خبر حکومت کو دی یا یہ کہ اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ حق نواز نے ڈر کر حکومت کو یہ معاملہ بتا دیا تھا۔ یہ محض قیاسات ہیں ورنہ حق نواز خاں صاحب بڑے مضبوط آدمی تھے۔ پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ اگر حق نواز نے دین پور اور سندھ کا پتا بتا دیا تھا تو پہلے حق نواز خاں کو خبر کس نے دی کہ رات کو انہیں خط ملتا ہے اور صبح سویرے ہی ان پر چھاپہ پڑتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے۔ مزید برآں شیخ عبدالحق صاحب کی سرحد اور پشاور شہر میں کیوں تلاشی لی جاتی ہے اور پوچھ گچھ کی جاتی ہے؟ یہ باتیں کس نے بتائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سب خبریں اور ان مقامات کے پتے اور ریشمی رومال کی پوری تفصیل امیر حبیب اللہ خاں اور اس کے لڑکے عنایت اللہ خاں نے حکومت برطانیہ کو بتا دی تھیں۔ اور بذریعہ لاسلکی یہ سب خبریں ہندوستان پہنچائی جا چکی تھیں۔ امیر حبیب اللہ خاں کے یہی کارنامے تھے جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئے اور عنایت اللہ خاں کی بھی ولی عہدی کے سب خواب پریشان ہو گئے (115)۔

یہ خطوط زرد رنگ کے ریشمی کپڑے کے تین ٹکڑوں پر ہیں ان میں پہلا خط شیخ عبدالرحیم صاحب کے نام ہے۔ یہ ٹکڑا چھ انچ لمبا اور پانچ پانچ انچ چوڑا ہے۔

دوسرا خط مولانا کے نام ہے یہ دس انچ لمبا اور آٹھ انچ چوڑا ہے۔ تیسرا خط بظاہر پہلے خط ہی کے سلسل میں ہے۔ پندرہ انچ لمبا اور دس انچ چوڑا ہے۔

پہلے اور تیسرے خطوط پر ''عبیداللہ'' دستخط ہیں۔ عبدالحق نے ہمیں بتایا ہے کہ مولوی عبیداللہ نے اس کو یہ تینوں ریشمی رومال دیئے ہیں جن پر اس کی موجودگی میں عبیداللہ نے خطوط لکھے تھے۔

اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ عبیداللہ نے خود ہی یہ خط لکھے تھے۔ عبیداللہ نام کے دستخط عبیداللہ کے ان دستخطوں سے پوری مطابقت رکھتے ہیں جو یہاں ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ جہاں تک عبیداللہ کی شخصیت کا تعلق ہے میں اپنے دفتر کی مرتب کردہ وہابی تحریک کی ممتاز شخصیتوں کی تاریخ محریہ ۱۹۱۵ء سے یہ اقتباس نقل کر رہا ہوں۔

مولوی عبیداللہ شاید اس تحریک کی اس اہم ترین شخصیتوں میں شامل ہے۔ ایسا ظاہر ہوسکتا ہے کہ وہ شروع میں سکھ تھے۔ اور سیالکوٹ کے رہنے والے تھے لیکن انہوں نے شروع اسلام قبول کر لیا اور سترہ برس کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ جہاں انہوں نے علوم دینیہ کی تکمیل کی اور استاذ بن گئے۔ دیوبند کے طلباء قدیم کی انجمن قائم کی۔ انہوں نے سندھ میں بارہ برس گزارے۔ جہاں انہوں نے مسلمانوں میں امتیازی پوزیشن حاصل کر لی اور پیر جھنڈے والا میں ایک مدرسہ قائم کر دیا۔

اگست ۱۹۱۵ء میں ان کے بارہ میں شبہ ہوا کہ وہ کچھ رسالے لکھ رہے ہیں جن میں جہاد پر اُکسایا گیا ہے۔ یہ رسالے ہندوستانی انتہا پسندوں میں پہنچ گئے تھے۔

جنگ بلقان کے موقع پر غیر ملکی سامان کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۱۲ء میں وہ دلی میں مقیم ہو گئے اور ادارہ نظارۃ المعارف قرآنیہ قائم کیا۔ بظاہر اس ادارہ کی شاخیں سندھ میں ہیں اور اس کا مقصد مسلم نوجوانوں میں مجنونانہ افکار پیدا کرتا ہے۔

عبیداللہ پیر جھنڈے والا کے ہمراہ ۲۷ جون ۱۹۱۵ء کو کراچی پہنچے تھے اور کہا جاتا ہے کہ چند دن بعد لکھنؤ روانہ ہو گئے تھے۔ لکھنؤ میں اُن کے بارہ میں کچھ معلوم نہ ہوسکا فی الحال وہ مفقود الخبر ہیں۔

مخبر (جی۔ بی) نے بیان کیا تھا کہ مجاہدین بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ اس کا نام لیتے ہیں۔

(۱۹۱۵ء کا اختتام) کہا جاتا ہے کہ لاہوری طلباء کی مہم جوئی اور سیف الرحمٰن کے مشن کے پیچھے عبیداللہ تھا۔ جب وہ دلی میں تھے تو مولانا محمد علی کے بہت قریبی ساتھی تھے۔

اس پر اتنا اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ عبدالحق کے بیان کے مطابق عبیداللہ نے کابل پہنچتے ہی بڑی عزت و عقیدت کا مقام حاصل کر لیا تھا (فروری ۱۹۱۶ء کے لگ بھگ) پہلی مرتبہ عبدالحق کے سامنے اِن کا یہ کہہ کر تعارف کرایا گیا کہ وہ نہایت ذہین دانشمند لائق قابل اور بااثر و مقتدر شخص ہیں اور برطانیہ کے خلاف سازش کرنے میں مصروف ہیں۔

عبدالحق کے مزید بیانات سے ظاہر ہے کہ سردار نصراللہ خاں عبیداللہ پر بہت بھروسہ اور اعتماد کرتے تھے۔

ان خطوط کی تحریر بہت اچھی نہایت صاف اور پختہ ہے۔ نہ تو کوئی لفظ کھرچ کر صاف کیا گیا ہے نہ کہیں کچھ مٹایا گیا ہے، نہ کسی لفظ کی اصلاح کی گئی ہے۔ صرف ونحو کی صرف ایک نہایت معمولی غلطی پوری تحریر میں نظر آتی ہے۔ خط کی زبان اگرچہ بعض مقامات پر مبہم ہے جیسا کہ بالعموم سازشی تحریروں میں ہوتی ہیں لیکن اچھے تعلیم یافتہ بلکہ عالم شخص کی زبان ہے (116)۔

تحریک ریشمی رومال کے اہم نام

۱۔ ابراہیم شیخ آف سندھ

محمد صادق کا بھتیجا جو کھڈہ کراچی کا مشہور متعصب مولوی اور عبیداللہ کا دوست ہے۔ شیخ محمد ابراہیم ایم اے نے پونہ میں تعلیم پائی ہے۔

۲۔ ابراہیم مولوی آف سیالکوٹ

پسر مستری قادر بخش سکنہ سیالکوٹ مشہور اور نہایت با اثر اور متعصب وہابی مبلغ۔ ہندوستان میں سفر کرتا رہتا ہے اور وہابیوں کے جلسوں میں دوسرے فرقوں سے مناظروں کے دوران نہایت پرجوش تقریریں کرتا ہے۔

۳۔ ابراہیم مولوی آف سیالکوٹ

پسر مستری قادر بخش سکنہ سیالکوٹ، مشہور اور نہایت با اثر اور متعصب وہابی مبلغ ہندوستان میں سفر کرتا رہتا ہے اور وہابیوں کے جلسوں میں دوسرے فرقوں سے مناظروں کے دوران نہایت پرجوش تقریریں کرتا ہے۔ اس لیے اس کی وقت مانگ رہتی ہے۔

۴۔ ابومحمد احمد مولوی آف لاہور

کنیت مولوی احمد چکوالی پسر غلام حسن ذات اعوان ساکن چکوال ضلع جہلم گنگوہ اور دیوبند میں تعلیم پائی ہے۔ دیوبند میں مولانا محمود الحسن اس کے استاد تھے۔ اس جگہ اس کی عبیداللہ سے پہلی ملاقات ہوئی وہ بھی اس وقت طالب علم تھا وہ محمود الحسن کا پر خلوص مرید بن گیا۔

۵۔ احمد علی مولوی نائب ناظم نظارۃ المعارف

پسر شیخ حبیب اللہ آف بابو چک ضلع گجرانوالہ۔ سندھ میں مولوی عبیداللہ کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ تکمیل تعلیم کے بعد مدرسہ گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد سندھ میں استاد مقرر کیا گیا۔ بعد میں اس کو اسی عہدہ پر نواب شاہ میں عبیداللہ کے قائم کردہ دوسرے اسکول میں منتقل کر دیا گیا۔

۶۔ اسداللہ شاہ پیر سندھی

غالباً مقام امروٹ ضلع سکھر (سندھ) کا رہنے والا ہے۔ عبیداللہ کا رفیق ہے۔ مدرسہ گوٹھ پیر جھنڈا میں اس وقت تعلیم کی جب عبیداللہ وہاں تھے کچھ عرصہ اس کے نظارۃ المعارف القرآنیہ میں بھی طالب علم رہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عبیداللہ کا نہایت سرگرم ایجنٹ ہے۔

۷۔ اللہ نواز خاں

پسر خان بہادر رب نواز خاں آنریری مجسٹریٹ ملتان۔ لاہور کے ان جہادی طلباء (گورنمنٹ کالج لاہور) میں سے ایک ہے۔ جو فروری ۱۹۱۵ء میں فرار ہو کر سرحد پار پہنچے۔ طلباء میں ہجرت کے سوال پر انتہائی کٹر تھا۔ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں

اس کا کمرہ اس وقت سازشیوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

۸۔ انصاری ڈاکٹر

جنود ربانیہ کی فہرست میں وہ لفٹننٹ جنرل ہیں۔ جدہ کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے عبیداللہ نے حضرت مولانا کو جو خط لکھا ہے اس میں ان کا تذکرہ "ڈاکٹر صاحب" کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔

۹۔ عبدالعزیز

حضرت مولانا کے نام خطوط میں اس کا تذکرہ ہے۔ ضلع پشاور کا باشندہ بیان کیا جاتا ہے۔ دیوبند کے مدرسہ کا اس وقت طالب علم تھا جب مولوی فضل ربی وہاں تھے۔

۱۰۔ عبدالعزیز مولوی، ساکن رحیم آباد

پسر حمداللہ ساکن رحیم آباد نزد دور بھنگہ بہار واڑیسہ، مشہور وہابی مولوی ہے جو شمالی ہند میں سفر کرتا رہتا ہے اور وہابیوں کے جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں اس کا نام لفٹننٹ جنرل کی حیثیت سے شامل ہے۔

۱۱۔ عبدالباری مولوی مہاجر

پسر مولوی غلام جیلانی ریٹائرڈ منصف لائل پور لاہور کے ان طلباء میں شامل تھا جو فروری ۱۹۱۵ء میں جہاد کے لیے آزاد علاقہ کو فرار ہو گئے تھے۔ کابل میں بڑے سازشیوں کو اس پر مکمل اعتماد رہتا اور اسے آزادی کے ساتھ خفیہ میٹنگوں میں شامل کر لیا جاتا تھا جو کابل سول لائنز میں جرمن مشن کے ساتھ ہوتی تھی۔

۱۲۔ عبدالحق مولوی آف لاہور

پسر مولوی محمد غوث کوچہ چابک سواران لاہور مالک رفاہ عام پریس مولوی عبدالرحیم عرف مولوی بشیر اس کا برادر نسبتی ہے۔ عبدالحق کٹر وہابی ہے انتہائی متعصب ہے اور ہندوستانی جنونیوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ان کے لیے وہ لاہور میں اکثر روپیہ جمع کیا کرتا ہے۔

۱۳۔ عبدالحق شیخ

جو ریشمی خطوط لے کر آیا تھا وہ ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ اس کا پرانا نام جیون داس ہے وہ لڑکا ہے لورندا رام ساکن موضع درچھا تھانہ جچیال ضلع شاہ پور کا اس نے انٹرنس تک پڑھا ہے۔

۱۴۔ عبداللہ انصاری مولوی

ایم عبداللہ انصاری ضلع سہارنپور صوبہ جات متحدہ کا باشندہ ہے۔ ایم اے او کالج میں وہ ناظم دینیات رہا ہے۔ اس کی طرف ۱۹۱۳ء میں توجہ ہوئی جبکہ اس نے یورپین مال کے بائیکاٹ کے فضل الحسن حسرت موہانی کے فتویٰ پر دستخط کیے۔

۱۵۔ عبداللہ مولوی آف سندھ

پسر نہال خاں ساکن موضع گوٹھ ملاں بخش نواری تھانہ مٹھیلو ضلع سکھر۔ پیر غلام محمد آف دین پور ریاست بھاول پور کا مرید ہے۔ کچھ عرصہ تک گوٹھ پیر جھنڈا اسکول تحصیل ہالا ضلع حیدرآباد سندھ میں فارسی کا استاد رہا ہے۔

۱۶۔ عبدالقادر مولوی ساکن دین پور

مولوی غلام محمد ساکن دین پور (ریاست بہاولپور) کا داماد۔ عبیداللہ کا پہلا معلم۔ یقین ہے کہ اس نے اور اس کے خسر نے مولوی عبیداللہ سے حیدرآباد سندھ کے شیخ عبدالرحیم سے جس کو تشریحی ریشمی خط بھیجا گیا تھا۔ اپنا تعلق قائم رکھا ہے۔

۱۷۔ عبدالرحیم شیخ صاحب ساکن حیدرآباد سندھ

جس کو ریشمی خطوط میں سے تشریحی خط بھیجا گیا تھا۔ بھگوان داس زمیندار کا لڑکا ہے۔ ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ دوسرے باحیثیت ہندوؤں کو مسلمان کرنے کی کوششوں کے باعث کافی بدنام ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے درزی ہے۔

۱۸۔ فتح محمد سندھی

سابق ہندو جسے دین پور ریاست بھاولپور کے مولوی غلام محمد نے اس وقت مسلمان کیا جب وہ لڑکا تھا۔ تبدیل مذہب کے بعد رہنے کے لیے وہ امروٹ ضلع سکھر کو چلا گیا۔ جہاں چھ برس گزارے۔ شکارپور اور سکھر میں بیکری کی دوکانیں ہیں۔

۱۹۔ غلام محمد صاحب مولانا آف بہاولپور

پسر حاجی نور محمد یہ خاندان ابتداء میں ضلع جھنگ کے مقام اہلما میں رہتا تھا لیکن پچاس برس گزرے ریاست بھاولپور میں متوطن ہو گیا تھا۔ مولوی غلام محمد دین پور علاقہ بہاولپور میں ۱۸-۱۹ برس سے مقیم ہے۔

۲۰۔ حبیب اللہ غازی

حضرت مولانا کے نام عبیداللہ کے خطوط میں یہ نام آیا ہے۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں میجر ہے۔ کاکوری یوپی کا باشندہ ہے اس کو غازی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے جنگ بلقان میں ترکوں کی طرف سے حصہ لیا تھا۔

۲۱۔ حاجی صاحب ترنگ زئی

حضرت مولانا کے نام عبیداللہ نے اپنے خط میں صرف حاجی لکھ کر اس کا تذکرہ کیا ہے اور جنود ربانیہ کی فہرست میں وہ لفٹنٹ جنرل ہے۔ اس کا اصلی نام فضل واحد ہے لیکن حاجی صاحب ترنگ زئی کے نام سے مشہور ہے۔

۲۲۔ محمود الحسن مولانا

حضرت مولانا بھی کہا جاتا ہے۔ ریشمی خطوط کے مکتوب الیہ مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے صدر مدرس پارسائی اور تقدس کے لیے مشہور۔ ان کے مرید جن میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں ہندوستان بھر میں ہیں۔

۲۳۔ محمد علی بی اے آف قصور

جنود ربانیہ کی فہرست میں میجر جنرل ہے۔ عبدالقادر پلیڈر قصور کا لڑکا ہے اور محی الدین عرف برکت علی کا بھائی ہے۔ ڈگری لینے کے بعد سول سروس کا امتحان دینے انگلینڈ گیا تھا لیکن امتحان پاس نہ کر سکا اور ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس آ گیا۔

۲۴۔ محمد میاں مولوی عرف مولوی منصور

جنود ربانیہ کی فہرست میں لفٹننٹ جنرل ہے۔ تشریحی ریشمی خط بنام شیخ عبدالرحیم حیدرآباد سندھ میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ مولوی محمد میاں، مولوی عبداللہ پروفیسر دینیات ایم۔ اے او کالج علی گڑھ کا لڑکا اور شمس العلماء حافظ احمد پرنسپل مدرسہ دیوبند کا بھانجا ہے۔ وہ انبیٹھہ ضلع سہارنپور کا باشندہ ہے۔ اس نے دیوبند میں تعلیم پائی ہے۔

۲۵۔ عبیداللہ

اس نے ریشمی خطوط پر دستخط کئے ہیں۔ پہلے سکھ تھا اس کا اصلی نام بوٹا سنگھ ہے۔ چیانوالی ضلع سیالکوٹ کا رہنے والا ہے۔ اوائل عمر میں اسلام قبول کر لیا تھا۔

۲۶۔ رب نواز خاں، خان بہادر

ریٹائرڈ رسالدار میجر اور ملتان شہر کا آنریری مجسٹریٹ مکمل وفادار شخص ہے۔ اس کے دو لڑکے اللہ نواز خاں اور شاہ نواز خاں لاہوری طلباء کی جہادی پارٹی میں شامل ہیں۔

۲۷۔ رشید اللہ پیر جھنڈے والا

مشہور سندھی پیر ساکن موضع گوٹھ پیر جھنڈا تحصیل ہالا ضلع حیدرآباد بہت متعصب اور جنونی ہے۔ سندھ کاٹھیاواڑ، بلوچستان، ریاست بہاولپور وغیرہ میں ٦ لاکھ مرید ہیں۔

۲۸۔ شاہ بخش حاجی ڈاکٹر سندھی

جنود ربانیہ کی فہرست میں لفٹننٹ کرنل ہے حضرت مولانا کے نام عبیداللہ کے خط میں بھی یہ نام آیا ہے۔ ڈاکٹر حاجی شاہ بخش ولد امام بخش لشاری بلوچ ٹھر و نواچاری شہر حیدرآباد سندھ۔ یہ کٹڑی ساز اور بہت چھوٹا زمیندار ہے۔

۲۹۔ شاہ نواز خاں

پسر خان بہادر رب نواز خاں آنریری مجسٹریٹ ملتان۔ اللہ نواز خاں مہاجر طالب علم کا بڑا بھائی اپنے بھائی کے اصرار پر لاہور کے جہادی طلباء کے ساتھ ہو گیا تھا۔

۳۰۔ ولی محمد مولوی

جنود ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے۔ یہی مولوی محمد عرف مولوی موسیٰ ساکن موضع فتوحی والا تھانہ گنڈا سنگھ والا ضلع لاہور ہے۔ نہایت متعصب وہابی مولوی ہے جو سرگرمی سے جہاد کے نظریہ کی تبلیغ کرنے اور اس مقصد کے لیے روپیہ اور آدمی جمع کرنے میں مصروف ہے (117)۔

خلاصہ کلام

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی برصغیر میں زوال اور غلامی کا ایسا دور شروع ہوا جو اب تک جاری ہے گزشتہ تین سو سالہ دور میں کئی جماعتوں اور گروہوں نے اس عظیم ملک کی بہتری و آزادی کے لیے ان تھک محنتیں اور کوششیں کی ہیں۔ لیکن جو کام امام شاہ ولی اللہ کی جماعت نے ملکی آزادی و دین کی فلاح کے لیے کیا۔ اس کی مثال کوئی دوسری جماعت پیش نہیں کر سکتی۔ اس جماعت کی کوشش نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ شاہ صاحب کی جماعت کے عظیم سپوت۔ آزادی کے مجاہد فلسفہ ولی اللٰہی کے مبلغ اور عظیم سیاسی راہنما مولانا عبید اللہ سندھی کے عملی سیاسی کام کو اپنے مقالہ میں پیش کر رہا ہوں۔

مولانا عبید اللہ سندھی ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء بمطابق ۱۲ محرم الحرام ۱۲۸۹ھ ضلع سیالکوٹ کے گاؤں چیانوالی میں پیدا ہوئے (اب یہ گاؤں گوجرانوالہ میں شامل ہے اور شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ہے)۔ آپ کے والد سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کا نام بوٹا سنگھ والد کا نام رام سنگھ اور دادا کا نام جیت رائے تھا۔ آپ کی پیدائش سے چار ماہ پیشتر ہی آپ کے والد وفات پا چکے تھے۔ اس کے دو سال بعد دادا بھی فوت ہو گئے۔ مولانا کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ صرف بہنیں تھیں۔ مولانا کی والدہ ساری زندگی سکھ دھرم پر قائم رہیں۔

مولانا کی پرورش بڑی ناز و نعم سے ہوئی۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے ماموں کے ہاں جام پور میں حاصل کی۔ یہیں پر مولانا نے اپنے ایک دوست کی وساطت سے اسلامی کتب کا مطالعہ کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کتب میں شاہ اسمٰعیل کی تقویت الایمان مولوی محمد لکھنوی کی احوال الآخرت قابل ذکر ہیں۔ قبول اسلام کے وقت آپ کی عمر پندرہ برس تھی۔

مولانا نے اپنی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں مکمل کی اور وہیں پر مدرس ہوئے۔ اساتذہ میں مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود حسن معروف ہیں۔ مولانا کی زندگی کا پیشتر حصہ جلاوطنی میں گزرا انہوں افغانستان، روس، یورپ، ترکی اور حجاز کے سفر کیے۔ انہوں نے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد چھوڑی جن میں سے پانچ کا مقالہ نگار نے تفصیلی تعارف کرایا ہے۔

مولانا کے خیال افکار کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ خلافت بغیر جماعت کے قائم نہیں ہو سکتی اور رئیس صرف اسی جماعت میں سے ہو سکتا ہے۔ رئیس کے لیے ضروری ہے کتاب اللہ کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو اور حضور ﷺ کے طور طریقوں اور آپ ﷺ کی سنت اور تعلیمات کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ انہوں نے ۲۲ لگ بھگ کتب اور رسائل تصنیف کیے۔

حوالہ جات

1- عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، لاہور ۱۹۴۶ء، ص۹۔
2- ایضاً۔
3- ایضاً، ص۱۰۔
4- ایضاً۔
5- ایضاً۔
6- ڈاکٹر ابوسلیمان سندھی، مقالات مولانا عبیداللہ سندھی (سیمینار کراچی) مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی کراچی ۱۹۹۴ء، ص۱۲۳۔
7- دائرۃ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
8- ایضاً۔
9- ایضاً۔
10- اصغر حسین، حیات شیخ الہند ۱۹۷۷ء، ص۲۵۔
11- محمد سرور، مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات زندگی وسیاسی افکار، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۲۹۔
12- عبدالحئی، نزھت الخواطر، حیدرآباد دکن، ۱۹۷۰ء، ۸/۳۹۸۔
13- اصغر حسین، حیات شیخ الہند، دارالکتب اصغریہ دیوبند، ضلع سہارنپور، ص۱۸۸۔
14- دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
15- ایضاً۔
16- مناظر احسن گیلانی، سوانح قاسمی، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاھور، ۲/۲۲۶۔
17- ذاتی ڈائری، ص۲۴۔
18- مجلہ مہران، حیدرآباد ۱۹۵۷ء، سوانح نمبر، ص۲۷۲۔
19- عبداللہ لغاری (مرتبہ غلام مصطفیٰ ڈاکٹر) مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل، قومی ادارہ تحقیق اسلام آباد، ص۲۳۔
20- ڈاکٹر ابوسلیمان سندھی، مقالات عبیداللہ سندھی، ص۱۲۷۔
21- ایضاً، ص۱۲۹۔
22- سید محمد میاں، تحریک شیخ الہند، نگارشات میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ لاہور۔
23- عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، ص۲۶۔
24- عبداللہ لغاری (مرتبہ غلام مصطفیٰ ڈاکٹر) مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل، قومی ادارہ تحقیق اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص۴۳۔
25- عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، ص۴۰۔

-26 ایضاً، ص۴۱۔

-27 ایضاً، ص۳۱۔

-28 ظفر حسین ایبک، آپ بیتی، منصور بک ہاؤس، لاہور، ص۵۳۔

-29 ایضاً۔

-30 ظفر حسن ایبک، آپ بیتی، منصور بک ہاؤس لاہور، ص۵۳۔

-31 ذاتی ڈائری، ص۵۳۔

-32 ایضاً، ص۶۲۔

-33 عبیداللہ سندھی، مولانا، کابل میں سات سال، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۵۷۔

-34 مولانا حسین احمد مدنی تحریک ریشمی رومال (مرتبہ مولانا عبدالرحمٰن) کلاسیک لاہور، ص۱۳۷، ۱۹۷۔

-35 عبداللہ لغاری، سرگزشت کابل، ص۱۸۰۔

-36 ایضاً، ص۱۸۵۔

-37 ایضاً، ص۱۸۳۔

-38 عبیداللہ سندھی، مولانا، کابل میں سات سال، ص۱۰۳۔

-39 ایضاً، ص۱۰۳۔

-40 عبداللہ لغاری (مرتبہ غلام مصطفیٰ ڈاکٹر) مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل، قومی ادارہ تحقیق اسلام آباد، ۱۹۸۰ء، ص۱۸۴۔

-41 ایضاً، ص۱۹۷۔

-42 ایضاً، ص۲۰۶۔

-43 ایضاً، ص۲۰۳۔

-44 ایضاً، ص۱۹۹۔

-45 ایضاً، ص۲۰۱۔

-46 ایضاً، ص۲۱۶۔

-47 ظفر حسن ایبک، آپ بیتی، منصور بک ہاؤس، لاہور، جلد ا، ص۲۵۸۔

-48 ایضاً۔

-49 ایضاً، ص۱۴۳۔

-50 ایضاً، ص۲۰۔

-51 ایضاً، ص۲۰۵۔

-52 عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، ص۲۲۲۔

53- ظفر حسن ایبک، آپ بیتی ،منصور بک ہاؤس، لاہور، ص ۲۵۸۔

54- ایضاً، ص ۲۶۷۔

55- ایضاً، پارٹ ۲، ص ۵۔

56- ایضاً، ص ۱۰۶۔

57- ایضاً، ص ۷-۸۔

58- ایضاً، پارٹ ۲، ص ۱۰-۱۱۔

59- ایضاً، ص ۲۰-۲۱۔

60- عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، ص ۲۶-۲۷۔

61- ایضاً، ص ۳۶۔

62- ایضاً۔

63- ایضاً، ص ۴۴-۴۵۔

64- ظفر حسن ایبک، آپ بیتی ،منصور بک ہاؤس، لاہور (حصہ دوم)، ص ۴۰-۴۲۔

65- ایضاً۔

66- عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، ص ۵۱-۵۲۔

67- ایضاً، ص ۵۳-۵۴۔

68- ایضاً، ص ۵۶۔

69- ایضاً۔

70- ظفر حسن ایبک، آپ بیتی ،منصور بک ہاؤس، لاہور، ص ۴۲۔

71- مولانا عبدالحمید سواتی، مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم و افکار، نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، ۱۹۹۰، ص ۲۲۶۔

72- ایضاً، ص ۲۲۷۔

73- ایضاً۔

74- ایضاً، ص ۲۲۸۔

75- عبیداللہ سندھی، ذاتی ڈائری، ص ۱۵۷۔

76- ایضاً، ص ۱۵۸۔

77- ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، مولانا عبیداللہ سندھی (پچاس سالہ یوم وفات پروگرام) مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی پاکستان، ۹/۱ علی گڑھ کالونی کراچی، اپریل ۹۶۔

78- عبداللہ لغاری (مرتبہ غلام مصطفی ڈاکٹر)، مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ص ۲۶۲۔

79۔ ایضاً،ص ۲۶۴۔

80۔ عبدالحمید خاں، مولانا احمد علی کے حالات، فیروز سنز لاہور، طبع اوّل ۱۹۶۴ء، ص ۸۔

81۔ ایضاً، ص ۹۔

82۔ ایضاً۔

83۔ ایضاً، ص ۱۰۔

84۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، افادات وملفوظات، سندھ ساگر اکیڈمی، چوک مینارا نارکلی لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۴۲۔

85۔ ایضاً، ص ۴۳۔

86۔ صوفی عبدالحمید خاں سواتی، مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار، ادارہ نشر واشاعت، مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ، ص ۱۰۶۔

87۔ ایضاً۔

88۔ ایضاً، ص ۱۰۶۔

89۔ رسالۃ الولی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد ۱۹۸۶ء۔

90۔ ایضاً۔

91۔ الہام الرحمٰن،

92۔ ایضاً، ص ۷۰۔

93۔ ایضاً، ص ۹۴۔

94۔ ایضاً۔

95۔ ایضاً، ص ۲۰۰۔

96۔ ایضاً۔

97۔ قرآنی انقلاب جنگ۔

98۔ ایضاً، ص ۸۱۔

99۔ ایضاً، ص ۸۲۔

100۔ ایضاً، ص ۸۶۔

101۔ ایضاً، ص ۹۷۔

102۔ ایضاً، ص ۷۹۔

103۔ دستور انقلاب، ص ۲۰۴۔

104۔ عنوان انقلاب، ص ۵۹۔

105۔ ایضاً، ص ۹۷۔

106۔ ایضاً، ص ۱۰۲۔

107۔ ایضاً، ص ۸۷۔

108۔ خطبات، ص ۸۲۔

109۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

110۔ ایضاً، ص ۹۳۔

111۔ ایضاً، ص ۱۲۷۔

112۔ ایضاً، ص ۱۴۰۔

113۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

114۔ ایضاً، ص ۲۰۴۔

115۔ مولانا حسین احمد مدنی تحریک ریشمی رومال (مرتبہ مولانا عبدالرحمٰن) کلاسیک لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۰۔

116۔ سید محمد میاں (مرتبہ) تحریک شیخ الہند، نگارشات، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۷۔

117۔ ایضاً، ص

باب چہارم

سید جمال الدین افغانی

کا تصورِ انقلاب

تعارف

اس باب میں سید جمال الدین افغانی کا تصور انقلاب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے:

پہلی فصل میں آپ کے تصور انقلاب کی خصوصیات کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

دوسری فصل میں آپ کی انقلابی تحریک کا ذکر ہے۔

تیسری فصل میں آپ کی تجاویز کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ جن میں جدید مروجہ دینی تعلیم کی صلاح، قومی زبان اردو ذریعہ تعلیم اور اسلامی اردو یونیورسٹی کی تجاویز شامل ہیں۔

انقلاب

انقلاب کا مفہوم:

انقلب ۔ینقلب ۔انقلاب مصدر ہے باب انفعال سے ۔جس کے معنی میں الٹا جانا ،اوندھانا ،واپس ہونا۔

قلب شی ءکا معنی ہے کہ کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت میں پلٹ دینا، پھیر دینا، انقلاب کا معنی پھیر دینے کا ہے ۔پلٹ جانا بھی اسی کا معنی ہے(1)۔

تغیر وتبدل، گردش، زمانہ کا چکر کھانا، نئے نظام کا نفاذ (Revolution)

جمع انقلابات ہے ۔اسی سے انقلاب آسمان ۔انقلاب دہر، انقلاب زمانہ ۔جیسی تراکیب استعمال ہوتی ہیں ۔اس کا مفہوم زمانے کی گردش اور وقت کی کایا پلٹ جانا ہے۔

انقلاب سے منسوب ۔انقلاب برپا کرنیوالے اور تبدیلی پیدا کرنیوالے کو انقلابی (Revolutionary) کہتے ہیں

انقلاب سے مراد گردش، تبدیلی ہے جو کسی بھی وقت کسی بھی قوم کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور وہاں کی حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔

انقلاب کی ضرورت واہمیت:

انسانی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی ،سیاسی اور ذہنی ارتقاء کے سلسلہ میں بعض بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔ان تبدیلیوں کے سلسلہ میں بڑے بڑے ہنگامے اور خوفناک ٹکراؤ بھی ہوتے ہیں ۔ پہلے پہلے ترقی پسند طاقتیں مروجہ نظام کے اندر پرورش پاتی ہیں ۔اگر ترقی اور فلاح کے لیے ضروری راستوں میں کوئی چیز حائل نہ ہو تو ہنگامے اور ٹکراؤ کی ضرورت پیش نہ آئے لیکن تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ ان قوتوں کے راستے میں جو ترقی اور آزادی کی خواہاں ہوتی ہیں ۔مروجہ نظام کی پابندیاں حائل ہو جاتی ہیں ۔لہذا فلاح کے لیے ان پابندیوں کو دور کرنا ضروری ہو جاتا ہے ۔اس وقت ایسی مثال موجود نہیں کہ مروجہ نظام نے ترقی اور آزادی کا راستہ صاف کرنے کے لیے اپنے آپ کو خود بخود ختم کر لیا ہو ۔لہذا بڑی بڑی تبدیلیوں کے وقت ہنگامے اور ٹکراؤ کی نوبت ضرورت آتی ہے ۔اس ہنگامے اور ٹکراؤ کا نام انقلاب ہے(2)۔

اس قسم کی دفعتاً تبدیلی اور ہنگامے سے غیر ذی روح دنیا بھی مبرا نہیں ۔مثال کے طور پر بھاپ بننے کے عمل کو لیجئے ۔ہم سب جانتے ہیں کہ جب پانی کو گرمی پہنچائی جائے تو بھاپ بن جاتی ہے ۔لیکن بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ بھاپ بننے کا عمل تدریجی نہیں ہوتا ۔بلکہ ایک فوری انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے جب پانی کو حرارت پہنچائی جاتی ہے ۔تو وہ اس میں جذب ہوتی رہتی ہے ۔بظاہر یہ عمل تدریجی اور پُرامن ہوتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ۔ایک نقطے پر پہنچ کر پانی کی سطح پر گڑبڑ شروع ہو جاتی ہے ۔یہ گڑبڑ صرف سطح تک محدود نہیں ہوتی بلکہ پانی کی تمام تہہ پر اثر انداز ہوتی ہے ۔حرارت پہنچنے پر پانی ایک نئی چیز میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے ۔ایک خاص حد تک تبدیلی کا عمل برتن کی حدود میں جاری رہ سکتا ہے لیکن آگے چل کر اس عمل کے لیے برتن کے قیود کو

برداشت کرنا ممکن نہیں رہتا۔اور اگر برتن پر ڈھکنار کھ دیا جائے تو یہ عمل اسے دور پھینک دیتا ہے۔اگر برتن پر ڈھکنا نہ رکھا جائے تو عمل نسبتاً غیر متشدد طریق پر جاری رہتا ہے لیکن ایک کھلے برتن میں بھی پانی کا کھولاؤ بالکل پرامن نہیں ہوتا۔صرف یہ بات ہے کہ گڑبڑ کم ہوتی ہے گڑبڑ بیرونی رکاوٹ کا نتیجہ ہے۔جتنی رکاوٹ زیادہ شدید ہوگی اتنی ہی گڑبڑ زیادہ زوردار ہوگی۔اور اگر بالکل بند برتن میں پانی کھولایا جائے تو دھماکہ بھی ضرور ہوگا۔

مادی دنیا کا یہ قانون انسانی سماج کے ارتقاء پر بھی لاگو ہوتا ہے۔مسلسل ترقی کے لیے جو تبدیلیاں ضروری ہوتی ہیں وہ آخر ایک ایسی سطح پر پہنچ جاتی ہیں جب ان کی مخالفت ہونے لگتی ہے۔اگر سماجی ارتقاء اس مقام پر رک نہیں جاتا تو اس مخالفت اور رکاوٹ کو دور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔رکاوٹ اور مخالفت کو دور کرنا ایک متشددانہ عمل ہے۔لیکن تشدد کا انحصار رکاوٹ اور مخالفت پر ہے۔یہ پانی کے کھولتے ہوئے برتن پر ڈھکنا رکھنے والی بات ہے جسے بھاپ کا زور دور پھینک دیتا ہے(3)۔

ہر قوم میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو یہ کہہ سکیں کہ اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہے۔تقریباً ہر شخص جو موجودہ نظام سے کوئی نہ کوئی شکایت کرتا ہے مزدوروں اور کسانوں کی حالت تو اور بھی دگرگوں ہے۔اگر مزدور اور کسان اپنی بدحالی کے خلاف احتجاج کریں تو لوگ اسے شورو شر خیال کرتے ہیں۔جن لوگوں کی حالت مزدوروں اور کسانوں سے ذرا بہتر ہے بدحالی کی شکایت تو وہ بھی کرتے ہیں لیکن وہ مزدوروں اور کسانوں کی طرح ہنگامہ آرائی نہیں کرتے۔ہنگامہ آرائی صرف وہ لوگ کرتے ہیں۔جن کے لیے بھوک ناقابل برداشت بن جاتی ہے۔

انقلاب کا ایک اصول یہ ہے کہ یہ اس وقت تک رونما نہیں ہوتا۔جب تک تمام سماج کی بہبود کا یہ اقتضا نہ ہو کہ مروجہ نظام میں اہم تبدیلیاں کی جائیں۔سماج کا ایک طبقہ جو تبدیلی کی اس ضرورت کو باقی سماج کی نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔انقلاب کا علمبردار بن کر آگے آ جاتا ہے۔اس طبقہ کی امنگیں باقی سماج کی امنگوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔اور اس کے مفاد بھی باقی سماج کے اجتماعی مفاد کے مطابق ہوتے ہیں(4)۔

فصل اوّل:

سید جمال الدین افغانی کا تصور انقلاب

ا۔ سیاسی انقلاب کا تصور:

سید جمال الدین افغانی نے فکر و عمل کا آپس میں گہرا رشتہ بتایا ہے۔ فکر تحریک پیدا کرتی ہے اور تحریک ہی عمل کا سبب بنتی ہے۔ افغانی لکھتے ہیں:

"نعم إن الإنسان إنسان بفكره وعقائده إلا أن ما ينعكس الى مرايا عقله من مشاهد نظره ومدركات حواسه يؤثر فيه أشد التأثير، فكل شهود يحدث فكراً وكل فكر يكون له اثر فى داعية، وعن كل داعية ينشأ عمل، ثم يعود من العمل الى الفكر، ولا ينقطع الفعل والانفعال بين الاعمال والافكار، ما دامت الارواح فى الاجساد، وكل قبيل هو للآخر عماد..... إذا لم يصحب العقد الفكرى ملجىء لاضرورة اوقوة الداعية الى عمل تنطبع عليه الجارحة وتمرن عليه ويعود اثرتكريرة على الفكر حتى يكون هيئة للروح وشكلا من اشكالها"(5)

وہ مزید لکھتے ہیں: "العالم الإنسانى عالم الفكر والكلام فاحكام الفكر الصالح ونشره فى الكتب والرسائل والجرائد مما يؤثر اجمل الأثر فى تهذيب الناس وتثقيف عقولهم، وإزالة الضغائن المفسدة لمعاشهم ومعادهم (6).

فاذا قام المستبصرون وخطبوا ووعدوا، وكتبوا ونشروا، مع الوقوف عند الحدود الدينية، والأصول الشرعية، كان لفضل الله كافلا لهم النجاح"(7)

سید جمال الدین افغانی نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جو ذریعہ منتخب کیا۔ وہ سیاسی انقلاب کا ذریعہ تھا۔ اس کے نزدیک مسلمان قوموں کے لیے اس آزادی کے حصول کے لیے جو انہیں اپنے حالات درست کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہی ذریعہ سب سے زیادہ سریع العمل اور یقینی تھا۔ ان کے نزدیک تدریجی اصلاح اور تعلیم کے طریقے غیر یقینی تھے۔ وہ نتائج کو اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے موجودہ نظام کو توڑ پھوڑ دینے کے لیے کام کیا۔ سیّد صاحب کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے لیے یہ بالکل جائز تھا کہ ان مسلمان حکمرانوں کو معزول یا مقتول کر دیا جائے ☆۔ جو یورپی چیرہ دستی کی ہمت افزائی کر کے مسلمانوں کو اپنی نجات کے لیے جدوجہد کرنے سے روکتے ہیں (8)۔

☆ سید جمال الدین نے ایک دفعہ پروفیسر براؤن سے دوران ملاقات میں کہا کہ جب تک چھ سات سر کاٹ نہ دیے جائیں کسی اصلاح کی امید نہیں کی جاسکتی اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایران کے شاہ وزیر اعظم کا ذکر کیا۔ اور یہ دونوں بعد میں قتل کر دیے گئے اور پھر صفحہ ۱۰۱ پر لکھا ہے کہ ۱۸۷۹ء کے موسم بہار میں سید صاحب کے زیر اثر مصلحین کے گروہ میں اس موضوع پر اکثر گفتگو ہوا کرتی تھی کہ خدیو اسمٰعیل کو کس طریقے سے معزول کرایا جائے۔ اور اگر کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو اس کو قتل کیونکر کیا جائے۔

افغانی کے تصور انقلاب میں قضاء وقدر کی اہمیت

سید جمال الدین افغانی اپنے تصور انقلاب میں قضاء وقدر کے اعتقاد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس شخص کا یقین کامل یہ ہو کہ موت کی ایک گھڑی معین ہے، اس کے رزق اور کفالت کی ذمہ داری لی جا چکی ہے۔ اشیائے عالم کا تصرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ ان کو اپنے ارادے اور مرضی کے مطابق تبدیل کرتا رہتا ہے وہ دین حق کی حفاظت و مدافعت اور ملت کا بول بالا کرنے کے لیے موت سے کب ڈرے گا؟ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر جو فرائض عائد کیے ہیں ان کی تعمیل میں سستی اور کم ہمتی کیوں کر دکھائے گا۔ صداقت کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے اور اپنے کردار کی شاندار عمارت کو احکام خداوندی اور اجتماع انسانی کے اصول کے مطابق بلندی پر پہنچانے کے لیے اپنے مال ودولت کو خرچ کرنے میں احتیاج کے خوف میں کیسے مبتلا ہوگا(9)۔

سید افغانی نے اس ضمن میں آمدہ آیت سے استدلال کیا ہے۔ الّذین قال لھم النّاس انّ النّاس قد جمعوا الکم فاخشوھم فزادھم ایماناً وّقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل فانقلبوا بنعمۃ مّن اللہ وفضل لّم یمسسھم سوءٌ واتّبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضلٍ عظیم(10)

(وہ لوگ جن سے 'منافق' لوگوں نے کہا کہ (کافر) لوگوں نے تمہارے (مقابلہ کے) لیے (بہت کچھ) جمع کر رکھا ہے۔ اس لیے اُن سے ڈرو مگر اس (بات) سے ان کا ایمان بڑھ گیا اور کہنے لگے کہ خدا ہمارے لیے بس ہے اور اچھا ساتھی۔ تو وہ خدا کی ایک بہت بڑی نعمت اور مہربانی لے کر لوٹے۔ ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی پر چلنے لگے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑی مہربانی والے ہیں)۔

سید جمال الدین افغانی مسلمانوں کی ابتدائی دور کی فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے محرک کی نشاندہی کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

مسلمانوں اپنی نشاۃ وارتقاء کے ابتدائی دور میں اپنے پہلے مرکز سے اٹھ کر مختلف ممالک کی طرف روانہ ہوئے اور ان پر فتح پاتے اور قبضہ کرتے چلے گئے۔ انہوں نے بڑی بڑی حکومتوں کو زیروزبر کر ڈالا اور بڑی بڑی قوموں کو مغلوب کر کے اپنا محکوم بنا لیا۔ یہ کام انہوں نے اس تیزی اور خوبی سے کیا کہ عقلیں دنگ رہ گئیں۔ بیرنی کے پہاڑوں سے لے کر جو ہسپانیہ اور فرانس کے حد فاصل پر واقع ہیں دیوار چین تک ان کا تسلط قائم ہوگیا اگرچہ وہ تعداد میں تھوڑے تھے ان کے پاس ساز وسامان کی کثرت نہ تھی اور مختلف آب وہواؤں میں زندگی بسر کرنے اور مختلف ممالک کے حالات سے جلیل القدر بادشاہوں کی نیندیں حرام کر دیں اور اپنے وقت کے کئی قیصروں اور کسراؤں کو تخت سے اتار دیا اور یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ اسی سال کی قلیل ترین مدت میں ہوا۔ یقیناً یہ ایک عظیم الشان معجزہ تھا، ان مجاہدوں نے بڑے بڑے شہروں کو زیروزبر کر ڈالا۔ عظیم الشان پہاڑوں کو عبور کیا۔ زمین کے اوپر گرد وغبار کی ایک دوسری زمین پیدا کی۔ ان کے گھوڑوں کے سموں نے کئی سربفلک پہاڑوں کی چوٹیوں کو زمین میں ملا دیا اور ان کے ہاتھوں نے ان پہاڑوں کے بدلے ان سرکشوں کی کھوپڑیوں سے نئے نئے پہاڑ اور ٹیلے کھڑے کیے جنہوں نے ان کی

قوت وسلطنت کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کیا تھا۔ ان کے خوف سے ہر دل پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اوران کی دھاک ہر طرف بیٹھ گئی۔ شجاعت اور بہادری کے ان تمام مظاہر میں ان کی قیادت کرنے اوران کی ہمتوں کو اکسا کر آگے بڑھانے والا کون تھا؟ یہی قضا وقدر کا اعتقاد(11)۔

گویا سید جمال الدین افغانی قضاء وقدر کے اعتقاد کو جد وجہد اور عمل کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

یہی قضا وقدر کا اعتقاد جس کے بل بوتے پر کبھی مسلمانوں کی ایک بہت ہی قلیل تعداد ایسے ایسے بھاری لشکروں کے مقابلہ میں جم کر لڑی جن کی کثرت تعداد کا یہ عالم تھا کہ وہ فضا کی وسعتوں اور روئے زمین کی کشادگیوں سے بھی بڑے نظر آتے تھے اور نہ صرف جم کر لڑی بلکہ اکثر موقعوں پر ان کے پاؤں اکھاڑ دیے اور انہیں پشت دکھانے پر مجبور کردیا(12)۔

اسی اعتقاد کی وجہ سے ان کی تلواریں مشرق میں چمکیں اوران کے عزم وہمت کی بجلیاں یورپ پر جاگریں اور اہلِ یورپ کی لڑائی کے میدانوں میں حیران وپریشان دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ اسی اعتقاد نے ان کو اپنے کلمہ اور اصول کی بلندی کے لیے اپنے تمام اموال واملاک کو خرچ کرنے پر آمادہ کیا نہ انہیں فقیری کا خوف تھا اور نہ محتاجی کا ڈر۔ اسی اعتقاد کی بدولت انہیں اس بات میں کوئی دشواری پیش نہ آتی کہ اپنی اولاد، عورتوں اور زیر تربیت بچوں کو لے کر ممالک عالم کی انتہائی سرحدات پر جنگ کے میدانوں کی طرف اس طرح روانہ ہو جائیں گویا وہ باغیچوں اور گلزاروں کی سیر کو جارہے ہیں: ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خدا پر توکل کر کے ان کو ہر حادثہ اور سازش کے خلاف امان مل گیا ہے یا ان کی جانوں کے گرد ایک فصیل کھڑی ہوگئی جو انہیں ہر حملہ اور مصیبت سے محفوظ رکھے گی۔ ان کی عورتوں اور بچوں میں بھی ہمت اور بہادری کا یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ عین میدانِ کارزار میں لشکروں کو پانی پلانے اوران کی ضروریات کو مہیا کرنے کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ پختہ سن اور نوجوان مردوں اور عورتوں اور بچوں میں اگر کوئی فرق تھا تو یہ کہ مرد ہتھیار اٹھانے کا کام سرانجام دیتے تھے۔ اور عورتیں اور بچے دوسرے فرائض میں حصہ لیتے تھے۔ خوف نہ عورتوں کے پاس پھٹکتا تھا نہ بچوں کے۔ اسی اعتقاد نے ان کو اس درجہ پر پہنچایا کہ ان کے نام زبان پر لانے سے بڑے بڑے سورماؤں کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔ مخالفین کے خلاف ان کا رعب ہی بڑے امدادی لشکر کا کام دیتا تھا۔ ان کی تلواروں کی چمک اور نیزوں کی بجلیاں دیکھنے سے پہلے ہی مخالفین کے عظیم الشان لشکر گھبرا کر بھاگ جاتے تھے بلکہ اپنی سرحدوں پر اسلامی لشکر کی ابتدائی ٹکڑیوں کے قدم پڑنے سے قبل ہی ان کی فوج میں بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ ہائے ان گزرے ہوؤں کی یاد میں مجھے رونا آتا ہے۔ ان پیش روؤں کا تصور کر کے میری آہیں نکلتی ہیں(13)۔

سید جمال الدین افغانی نہ صرف مسلمانوں میں قضاء وقدر کے عقیدہ کی کارفرمائی دیکھتے ہیں بلکہ وہ اس دنیا کی تمام فتوحات کا محرک سمجھتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں:

میں کہتا ہوں اور پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اجتماع بشری تاریخ کا جب سے آغاز ہوا ہے۔ اس وقت سے آج تک جتنے ایسے بڑے بڑے فاتح اور نامور گزرے ہیں جو اوسط طبقوں میں پیدا ہو کر محض اپنی ہمت اور جدوجہد کے بل بوتے پر

درجات عالیہ تک پہنچے۔ جنہوں نے دشوار گزار گھاٹیوں کو آسانی سے طے کر کے بڑے بڑے سرکشوں کو اپنا تابع فرمان بنایا جن کی حدود سلطنت حیرت انگیز حد تک وسیع ہو چکی تھیں اور جن کی شان و شوکت کے قصے اب بھی اصحاب فکر کو تلاش عمل کی دعوت دیتے ہیں، وہ سب کی سب قضا و قدر کے معتقد تھے۔ سبحان اللہ، یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہو چکی ہے کہ وہ زندگی اور اس کے علائق کے بارے میں بے حد حریص اور بخیل واقع ہوا ہے۔ پھر اس میں خطرات میں گھس جانے، ہلاکت کی پروانہ کرتے ہوئے کڑی سے کڑی مہم میں کود پڑنے اور دست و گریبان ہو جانے کی ہمت اور جرات کہاں سے آتی ہے؟ قضا و قدر کے اعتقاد سے! اور اس اطمینان سے کہ تقدیر کے سامنے ظاہری حوادث کے ڈر اور خوف کی کوئی حیثیت نہیں جو کچھ تقدیر میں لکھا ہے، وہی ہو کر رہے گا(14)۔

تاریخ کے اوراق بتا رہے ہیں کہ کورش ایرانی (کیخسرو) جو قدما کی تاریخ میں سب سے پہلا فاتح ہے اور جس کے حالات مشہور ہیں صرف اسی لئے کامیابی سے ہمکنار ہوا کہ وہ عملاً قضا و قدر کا معتقد تھا۔ اسی عقیدے کی وجہ سے کسی سخت سے سخت مہم میں بھی اس پر نہ کبھی کوئی گھبراہٹ مسلط ہوتی تھی اور نہ اس کے پختہ عزائم میں کمزوری آتی تھی۔ یونان کا سکندر اعظم بھی ان لوگوں میں تھا جن کے نفوس میں قضا و قدر کا عظیم الشان عقیدہ جاگزین تھا۔ مشہور فاتح چنگیز خاں تاتاری بھی اسی اعتقاد کے ماننے والوں میں تھا۔ اسی عقیدہ کی بدولت وہ جب چاہتا اپنا مٹھی بھر لشکر لے کر لاتعداد افواج سے آراستہ ملکوں پر حملہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ کامیابی اس کی منتظر رہتی تھی اور جہاں وہ جاتا تھا فتح و نصرت کی محبوب دیوی اس کے قدم چومتی تھی۔

ا۔ اسلام کے مذہبی اصول کا تقاضا ہے کہ فرزندان ملت اسلامیہ اس کمینہ خصلت (بزدلی) سے دنیا کے دوسرے رہنے والوں کی بہ نسبت زیادہ دور رہیں کیونکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی چاہتے ہیں اور اس کو راضی رکھنے والے اعمال کے بجا لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی بزدلی کی خصلت ہے قرآن کی تلاوت کرنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موت کی محبت کو ایمان کی علامت قرار دے دیا ہے اور اسی کے ذریعہ بغض و عناد رکھنے والوں کے دلوں کا امتحان لیا ہے جو لوگ مومن نہیں ان کی مذمت میں ارشاد ہے:

الم تـر الـى الـذين قيل لهم كفوا ايديكم واقيموا الصلوة واتوا الزكوة. فلما كتب عليهم القتال اذا فـريـق مـنـهـم يـخـشـون الـنـاس كخشية الله او اشد خشية وقالوا ربنا لم كتبت علينا القتال لو لا اخرتنا الى اجل قريب(15)

(کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ پہلے ان کو یہ حکم دیا گیا کہ (جنگ و جدال سے) اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نمازوں کو قائم کر کے زکوۃ دو پھر جب ان پر لڑنا فرض کر لیا گیا تو اچانک ان کا ایک گروہ لوگوں سے اسی طرح ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہنے لگے کہ اے ہمارے رب ہم پر لڑائی کیوں فرض کی؟ کیوں ہمیں ایک مقررہ وقت تک کیلئے مؤخر نہ رکھا)۔

حق کے راستے میں قدم بڑھانا اور حق کے بول کو بالا کرنے کیلئے مال و جان و قربان کرنا مومن بننے کی پہلی علامت

ہے۔ کتاب الٰہی کو بول بالا کرنے کیلئے مال و جان کو قربان کرنا مومن بننے کی پہلی علامت ہے۔ کتاب الٰہی نے صرف نمازوں کو قائم رکھنے، زکوٰۃ دینے اور قتل وقتال سے رکنے کو کافی نہیں سمجھا اور بتلا کر ان اعمال میں مومن، کافر اور منافق سب شریک ہوسکتے ہیں۔ ایمان کی واحد علامت عدل الٰہی کو پھیلانے اور کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے جانثاری بیان کی گئی ہے اور جاں نثاری کو وہ بنیادی رکن قرار دیا گیا ہے جس کے اکھڑ جانے کے بعد باقی ارکان کسی شمار وقطار میں نہیں۔ خبردار کبھی یہ خیال مت کرنا کہ مذہب اسلام اور بزدلی کا ایک ہی دل میں جمع ہونا ممکن ہے یہ کبھی ہوسکتا ہے؟ دین کا ہر جز تو ہمارے سامنے بہادری اور اقدام کا تصور پیش کرتا ہے۔ مذہب اسلام کی بنیادی تو اسی پر کھڑی ہے کہ اللہ کی خالص عبادت اختیار کر کے اس کی رضامندی کو حاصل کرنے کے لیے باقی ساری کائنات کی محبت سے دل کے گوشہ کو خالی کر دو(16)۔

مومن وہی ہے جس کو اس بات کا پختہ یقین ہو کہ موت کا وقت اور تقدیر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ انہیں جس طرح چاہے کام میں لاتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ادائے فرض سے پہلوتہی کرنا موت کے وقت کو بڑھا نہیں سکتا اور نہ پیش قدمی کرنا اس میں سے ایک منٹ کو گھٹا سکتا ہے۔ ہر صورت میں موت ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر وقت مقررہ آ پہنچتی ہے۔ مومن اپنے نفس کے لیے دو نیکیوں میں سے کسی ایک کا متوقع رہتا ہے۔ یا یہ کہ سرداری اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کرے اور یا پھر شہادت کی وہ موت حاصل کرے جس کے ذریعہ رضائے الٰہی کا قرب نصیب ہو۔ سعادت اخروی کی دولت ملے اور روح اعلیٰ علیین میں پہنچ کر ملائکہ مقربین سے جا ملے۔ جو شخص اس وہم میں پڑا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے قرآن پر ایمان لا کر بھی وہ اپنے دل میں بزدلی کو جگہ دے سکتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو دھوکے میں ڈال رہا ہے۔ عقل کو فریب میں مبتلا کر رہا ہے۔ اس کی ہوس اس کو بہلا رہی ہے اور درحقیقت اس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی موجود نہیں۔ قرآن کریم کی ہر آیت گواہی دے رہی ہے کہ بزدل آدمی ایمان کے دعویٰ میں جھوٹا ہے(17)۔

ان حقائق کے پیش نظر ہم انبیاء کے وارث (علمائے کرام) سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ حق کا کھلم کھلا اعلان کریں اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ذریعہ لوگوں کو نصیحت کریں اور وہ احکام سنائیں جو خداوند تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے قدم بڑھانے اور فرائض و واجبات کو بجالانے میں سستی و تاخیر نہ کرنے کے بارے میں قرآن کریم میں نازل فرمائے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ اگر علماء نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس فرض کو تھوڑی مدت تک بھی سرانجام دیا اور قرآن کریم کے معانی کو اچھی طرح واضح کر کے عام لوگوں کو نصیحت کی اور قرآن کریم کی عظمت دلوں میں زندہ کر دی۔ تو ہم اس کا اثر اس ملت اسلامیہ میں اتنا پائیدار دیکھیں گے جو ابد الاباد تک یادگار رہیگا اور ہماری زندگی میں ایک دن وہ آئیگا جس دن امت اسلامیہ اس دنیا میں عطیہ الٰہی کی بہت بڑی فضیلت، مجد اور بزرگی کی دولت سے سرفراز ہوگی۔ مومنوں کو اپنے اسلاف سے جو اوصاف بطور ورثہ ملی ہیں اور ان کے دلوں میں عقائد کے جو اثرات گھر کر چکے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے ان کی بیداری کے لیے صرف تھوڑی سی تنبیہہ اور ذرا سے اشارے کی ضرورت ہے پھر وہ شیر کی طرح بپھریں گے۔ اپنی ذلت و سعادت کا کھویا ہوا حصہ دوبارہ حاصل کریں گے اور موجودہ حصہ کی حفاظت کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں مقام محمود کے درجہ پر فائز ہونگے۔

قضاء وقدر کے عقیدے میں جبر کے نظریے کی آمیزش:

عام طور پر قضاء وقدر کے عقیدہ کے انسان کے مجبور ہونے کا تصور بھی ابھرتا ہے، مگر سید جمال الدین افغانی ان دونوں میں باہمی تعلق کے قائل نہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں:

عقیدہ قضا وقدر بڑا ہی اچھا عقیدہ ہے جو دلوں کو بزدلی کی رذیل خصلت سے پاک کرتا ہے اور بزدلی ہی وہ اولین خصلت ہے جو انسان کو اس کے کمال تک پہنچنے میں حارج ہوتی ہے جس کو وہ روگ لگ جاتا ہے وہ چاہے کسی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو کمال تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ بعض مسلمانوں میں سے بعض عوام نے اس عقیدے کے ساتھ عقیدہ جبر کے اجزا ملا لئے ہیں۔ یا یہ اجزاء خود بخود ان کے عقیدے میں شامل ہو گئے ہیں اور آخری ادوار میں مصائب کے جو واقعات ان پر گزرتے ہیں بہت ممکن ہے کہ ان کا سبب بھی یہی غلط اعتقاد (جبر) ہو (18)۔

توکل اور بے عملی:

سید جمال الدین افغانی عقیدہ وقدر کے ساتھ بے عملی کے تصور کی نفی کرتے ہوئے علماء پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اس شریف اور مبارک عقیدہ کو بعد کی لاحق شدہ بدعات کے عوارض سے مبرّا کرنے کے لئے جدو جہد کریں گے اور عوام کو سلف صالح کے طریقے اور اعمال یاد دلائیں گے اور امام غزالی اور ان جیسے دیگر ائمہ دین کے خیالات سے روشناس کرائیں گے اور انہیں بتلائیں گے کہ شریعت کی طرف سے توکل اور قضا پر اعتقاد رکھنے کا مطالبہ عمل اور جدو جہد کے لیے ہے۔ بیکاری اور سستی کے لیے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم نہیں دیا کہ اس پر توکل کرنے کی حجت پکڑ کر ہم اپنے فرائض کو چھوڑ دیں اور ہم پر جو واجبات مقرر کیے گئے ہیں۔ ان کی بجا آوری میں کوتاہی کریں۔ توکل کی حجت کو اس طرح اپنی بے عملی کا بہانہ بنا لینا بے دینوں اور زندیقوں اور لوگوں کا کام ہے جو صراط مستقیم سے دور جا پڑے ہیں کسی مسلمان کو اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ ان اوقات میں ملت کی طرف سے مدافعت کرنا ہر مکلف مسلمان کا فرض بن گیا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے سچے اعتقادات کی طرف متوجہ کرنا جو ان کے اختلافات کو مٹا کر ان کے عزائم کو دوبارہ بلند کر دیں۔ اور کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنے کے لیے ان کی غیرت کو جوش میں لائیں اس وقت کا سب سے بڑا کام ہے اور یہ کام علماء کی تبلیغ اور دعوتِ خیر سے ہی سرانجام پا سکتا ہے (19)۔

عقائد حقہ اور ان کی عقلی اہمیت:

سید جمال الدین افغانی، اسلامی عقائد کو نفسیاتی امراض اور ذہنی پستیوں کا علاج قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جب تک اسلام کے سچے اصول ان کے دلوں میں صحیح معنوں میں جاگزیں ہیں جب تک اسلامی عقائد کے نقش و نگار ان کے ذہن کی لوح پر چمک رہے ہیں اور جب تک علمائے کاملین کے مابین ان عقائد کے درس و تکرار کا سلسلہ جاری ہے اس وقت تک ملّت اسلامیہ کی موت ناممکن ہے جو نفسانی بیماریاں اور ذہنی فتورات ان کو لاحق ہو چکے ہیں وہ سب عقائد حقہ کی طاقت سے ختم ہو جائیں گے اسلام کی ارتقائی رفتار اس کے اوّلین دور کی طرح پھر سے شروع ہو جائے گی۔ اپنے اوطان کو اجنبی

طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ کرنے کے لیے وہ از سر نو دانش و بصیرت کے مسلک اختیار کر لیں گے جو اقوام ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں ان کو دور ہی سے ڈرا کر اپنی جگہ ٹھہر جانے پر مجبور کر دیں گے۔ یہ بات خدا کی حکمت سے کوئی بعید نہیں اور بہت سے تاریخی واقعات اس کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ خود عثمانیوں کو دیکھو کہ تاتاری اور صلیبی لڑائیوں کے بعد پھر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور روئے زمین پر ہر طرف اپنے لشکر پہنچا دیئے۔ ان کی فتوحات کے میدان وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے۔ وہ کئی ملکوں کو زیر و زبر کر گئے اور کئی بادشاہوں نے ان کے سامنے سپر ڈال دیے۔ یورپین حکومتیں ان کی شوکت کا لوہا ماننے لگیں یہاں تک کہ ان سلطنتوں میں عثمانی سلطان ہی سلطان اکبر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

ذرا اپنی نظر دوبارہ دوڑاؤ تمہیں ان میں ایک نیا جوش اور ترقی کی نئی امنگ نظر آئے گی۔ تازہ حوادث نے عاقبت کی خرابی کے متعلق جو خطرے ان کے دلوں میں پیدا کر دیئے ہیں، وہی ان کے اس نئے جوش اور امنگ کو بروئے کار لانے کا سبب ہیں۔ یہ امنگ اکثر مشرقی و مغربی ممالک کے صاحب بصیرت مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ اور انہوں نے حق کی حمایت کے لیے ایسی جماعتیں قائم کر لی ہیں جنہوں نے انصاف اور شریعت کی امداد کرنا اور اپنے افکار کی تبلیغ و اشاعت کرنا اور اختلافات کو مٹا کر مسلمانوں کو ایک مرکز پر مجتمع کرنا اپنا نصب العین قرار دیا ہے ان کی عملی جدوجہد کا ایک ادنیٰ نمونہ اس عربی جریدہ کا اجراء ہے جو اپنے بیش بہا مضامین کے ذریعے دور دراز علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان روابط پیدا کرے گا اور ان کو اجنبی طاقتوں کی سازش سے باخبر رکھے گا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ نیک جماعت کے اراکین کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کے اعمال کو بارآور کرے اور اس کے سچے مقاصد کی تائید فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ اس جماعت کے مساعی حسنہ سے شرقیوں کے حق میں خصوصاً مفید نتائج مرتب ہوں گے (20)۔

اسلام کی عقلی بنیادیں:

قوم کے مذہبی عقائد پہلی چیز ہیں۔ جو لوگوں کو سکھانے چاہئیں لیکن یہ عقائد محض تقلید پر مبنی نہ ہونے چاہئیں۔ بلکہ ان عقائد کی تائید میں ضروری دلائل و براہین کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ Guizot نے اپنی کتاب ''تہذیب'' میں لکھا ہے کہ یورپ نے زمانہ حاضر میں ترقی و تہذیب کے جو مراحل طے کئے ہیں ان کا ایک نہایت قوی عنصر یہ ہے کہ اس کے اپنے اندر ایک مذہبی جماعت پیدا ہو گئی۔ جس نے دعویٰ کیا کہ اسے اپنے مذہبی عقائد کے ماخذوں کی تحقیقات اور ان کے دلائل و براہین کی دریافت کا حق حاصل ہے۔

اسلام اس اعتبار سے دنیا بھر کے مذاہب میں یکہ و تنہا ہے کہ وہ انسان کی عقل کو مخاطب کرتا ہے۔ اور اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ مذہبی عقائد کو محض دعوے اور مفروضے کی بنا پر نہیں بلکہ عقلی دلائل کی بنا پر تسلیم کرے اس کے برعکس دوسرے مذاہب ہیں۔ مثلاً ایک مذہب اس عقیدے کا متقاضی ہے کہ واحد ایک سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور متعدد واحد بھی ہو سکتے ہیں۔ اس عقیدے کے ماننے والے اس کو اس بنا پر حق سمجھتے ہیں کہ یا مافوق الادراک ہے اور عقل سے سمجھ میں نہیں آ سکتا (21)۔

۲۔ ذہنی آزادی کا تصور:

سید صاحب کی تعلیمات کے تعمیری پہلو کی ایک مثال ان کی کتاب ''الرّدّ علی الدہریین'' کے آخر میں نظر آتی ہے۔ جہاں انہوں نے ایک فصل اس عنوان سے لکھی ہے کہ وہ کونسے ذرائع ہیں جن سے قوموں کو مسرت حاصل ہو سکتی ہے''۔ اس مختصر بیان میں سید صاحب کے بہت سے اساسی تصورات موجود ہیں۔ جن کا پرتو محمد عبدہ کی تعلیمات میں بوجہ اتم نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ موضوع اس اعتبار سے دوگونہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے اس کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ قوموں کی مسرت وخوشحالی کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ عوام کے قلوب واذہان کو ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی سے پاک کیا جائے۔

اسلام کا تقاضا یہی ہے خصوصاً اس لیے کہ توحید الٰہی کے عقیدے کا لازمہ یہ ہے کہ دماغوں کا تزکیہ کیا جائے اور بُت پرستی، حلول اور کنارو جیسے احمقانہ خیالات یک قلم ترک کر دیئے جائیں۔

۲۔ عوام محسوس کریں کہ وہ حسنِ کردار کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اس کے خواہشمند بھی ہیں۔ صرف ایک ہی چیز ہے۔ جو خواہش سے حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ نبوت ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے کسی کو عطا کرتا ہے۔ اگر سب لوگوں کو یقین ہو جائے کہ ان کے لیے تکمیلِ کردار کا حصول ممکن ہے تو وہ اس کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں گے (22)۔

اسلام نے تکمیل تقویٰ کو سب کے لیے ممکن بنا دیا ہے۔ یہ برہمنیت کی طرح نہیں جس میں انسان ذاتوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں اور ان کے حدود سے تجاوز ناممکن ہے۔ نہ یہودیت کی مانند ہے جو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے نفرت کرتی ہے اور اپنے دائرہ کے اندر احبار و رہبان کی ایک ذات معین کر دیتی ہے۔ جو خدا سے قریب تر ہے اور جس کے توسل کے سوا کوئی شخص قُربِ خداوندی حاصل نہیں کر سکتا۔

۳۔ عالم اسلام کا تصور اور اس کی اہمیت:

سید جمال الدین افغانی نے اتحاد کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

"الوفاق تواصل وتقارب يحدثه إحساس كل فرد من أفراد الأمة بمنافعها ومضارها، وشعور جميع الآحاد في جميع الطبقات بما تكسبه من مجد وسلطان"(23)

(اتفاق ایسا باہمی تعلق اور قُرب ہے جسے امت کے افراد کے ہر فرد کا احساس اپنے مفادات ونقصانات سمیت پیدا کرتا ہے اور تمام طبقات کے افراد کے اس شعور کا نام ہے جس کے ذریعے وہ عزت واقتدار حاصل کرتے ہیں)۔

سید جمال الدین کی درج بالا تعریف کے تحت جب اتحاد آ جاتا ہے تو قوم کی ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں۔قوم کے ارادوں میں یکجہتی آ جاتی ہے اور قوم دوسری اقوام پر غلبہ حاصل کرتی ہے۔سید جمال الدین افغانی لکھتے ہیں:

"إذا بلغ الإحساس من مشاعر أفراد الأمة إلى الحد الذي بيناه، رأيت في الدهماء منهم والخاصة هـمما تعلو، وشيما تسمو، وإقدام يقود، وعزما يسوق، كل يطلب السيادة والغلب، فتتلاقى هممهم، وتتلاحق عزائمهم، في سبيل الطلب فيندفعون للتغلب على الذين يلونهم، كما تندفع السيول على الوهاد"(24)

(جب امت کے افراد کے شعور میں ان کا احساس ہمارے بیان کردہ حد تک پہنچ جائے تو ہم ان کے قائدین اور خاص لوگوں میں ایک آگے بڑھتا ہوا عزم، ابھارتی ہوئی اچھی عادات اور قیادت کرتا ہوا اقدام۔آگے بڑھاتا ہوا عزم دیکھو گے۔ان میں ہر ایک قیادت اور غلبہ چاہتا ہوگا۔چنانچہ ان کے ارادے آپس میں مل جاتے ہیں اور طلب کی راہ میں ان کے عظائم آپس میں جڑ جاتے ہیں چنانچہ وہ اپنے قریبی لوگوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ایسے امڈ پڑتے ہیں جیسے نشیب پر سیلاب آ جاتا ہے)۔

سید جمال الدین افغانی نے امت مسلمہ کے اندر اتحاد پر بہت زور دیا ہے۔وہ اگر مسلم ممالک ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے تو زوال کی طرف جانا لازمی نتیجہ ہے۔افغانی لکھتے ہیں:

> "كل هذا الرزايا التي حطت باقطارنا، ووضعت من أقدارنا، ما كان قاذفنا ببلائها، ورامينا بسهامها، إلا افتراقنا وتدابرنا والتقاطع الذي نهانا الله ونبيه عنه"(25)

(یہ تمام آفات جو ہمارے ارد گرد نازل ہو چکی ہیں اور جنہوں نے ہماری قدر میں کمی کر دی ہے ہم کسی ایسی مصیبت میں نہیں پڑے تھے)۔

اتحاد کی اہمیت:

سید جمال الدین افغانی اس حوالے سے روسیوں کی حکمت عملی سے استدلال کرتے ہیں کہ علوم وفنون اور صنعت و

حرفت کے لحاظ سے وہ یورپ کی کئی اقوام سے بہت پیچھے ہیں۔ان کی مملکت میں دولت وثروت کے وسیع ذرائع بھی موجود نہیں۔ دولت وثروت کے ذرائع موجود بھی ہوں تو صنعت وحرفت کی وہ تگ ودو اور سرگرمی نہیں جوان دولتوں کو کام میں لا کر قومی ترقی کا معیار بلند کرنے کے لیے ضروری ہے۔اسی وجہ سے روسی تنگدستی اور افلاس کے بڑے صبر آزما دور سے گزر رہا ہے۔لیکن ان ساری کمزوریوں کے باوجود قومی دفاع کی تدابیر سے عوام کی آگاہی ان تدابیر کی بجا آوری میں ان کا باہمی اتفاق واتحاد ان کی زندگی کا نصب العین ہے اور یہی درحقیقت وہ زرین اصول ہے جس کی وجہ سے روسی شہنشاہیت کی دھاک تمام روئے زمین پر بیٹھی ہوئی ہے۔چٹانوں کی طرح مضبوط یورپین حکومتیں روسی خطرہ کے تصور سے کانپتی ہیں۔بے شک روسیوں کے پاس اسلحہ تیار کرنے کے لیے زیادہ وسائل اور کارخانے موجود نہ تھے۔لیکن انہیں آلاتِ حرب کے مہیا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ان کی فوجی تنظیم بھی اپنی ہمسایہ حکومتوں جتنی مکمل نہ تھی۔لیکن انہوں نے اپنے عساکر کو منظم اور تربیت یافتہ بنانے کے لئے دوسری قوموں سے باہر سے فوجی افسر مانگنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔اور آج ان کی فوجیں اتنی مضبوط ہیں کہ ان کی شوکت وصولت کا خوف اقوامِ یورپ پر ہر دم سوار رہتا ہے(26)۔

ناامیدی اور پستی سے اجتناب:

یہ اتحاد واتفاق موجودہ اوقات میں اور بھی زیادہ اہم ہو گیا۔ضرورت اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ باہم ایک ہو جاؤ یاد رکھو یہی اتفاق کا وقت ہے یاد رکھو زمانہ مہلت دے دے کر تمہیں ممنون کر رہا ہے۔ان مہلتوں اور فرصتوں کو غنیمت سمجھو ان سے فائدہ اٹھانے میں ذرا سستی نہ دکھاؤ۔رونے پیٹنے سے مردے زندہ نہیں ہوتے۔افسوس کرنے سے گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔رنج وملال میں پڑے رہنے سے مصیبت نہیں ٹلتی۔کامیابی کی کنجی حرکت اور عمل میں ہے۔صداقت اور راست بازی کامیابی کا زینہ ہے۔ڈر اور خوف ناامیدی اور پست ہمتی کو قریب تر لاتے ہیں اور ناامیدی اور پست ہمتی موت کا سبب بنتی ہے(27)۔

وقل اعملوا فسیری اللّٰه عملکم ورسوله والمؤمنون ثمّ تردّون الی عالم الغیب والشّهادة فینبّئکم بما کنتم تعلمون (28)۔

(اور ان سے کہہ دو کہ تم (جو چاہو) کرو۔بہت جلد خدا اور اس کا رسول اور مومنین تمہارے اعمال کا جائزہ لیں گے۔پھر تم خدا کے سامنے جو ہر ظاہر و پوشیدہ کا عالم ہے، پیش کئے جاؤ گے جو تمہیں ان اعمال کی خبر دے گا جو تم نے کیے تھے)۔

سید جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کے زوال میں ناامیدی، پستی اور بے حسی کے کردار کو بیان کیا ہے۔انہوں نے ایران، مصر وغیرہ ممالک کی مثالیں دے کر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کا درس بھی دیا ہے۔افغانی لکھتے ہیں:

"المسلمون یحث کل واحد منهم بهاتف یهتف من بین جنبیه یذکره بما تطالبه به الشریعة، وما یفرض علیه الایمان، وهو هاتف الحق الذی بقی له من إلهامات دینه، ومع کل هذا نری اهل هذا الدین فی هذه الایام بعضهم فی غفلة عما یلم بالبعض الآخر، ولا یألمون لمایألم له بعضهم(29)

(مسلمانوں میں سے ہر شخص ایک مُنادی کے ذریعے برانگیختہ کرتا ہے جو اس کے سامنے ندا دیتا ہے اور اسے شریعت

کے مطالبات اور ایمان کی ذمہ داریوں کی یاددہانی کراتا ہے۔ وہ حق تعالیٰ کا ایسا عنادی ہے جو اس کے لیے اس کے دینی الہامات میں سے باقی ہے۔ اس سب کے باوجود ہم اس دین کے حاملین کو آج کل اپنے بھائیوں کی تکالیف سے غافل پاتے ہیں۔ وہ اُن کی تکالیف کی بنا پر خود تکلیف میں نہیں پڑتے)۔

مزید لکھتے ہیں:

"هذا التدابر والتقاطع وإرسال الحبال على الغوارب عم المسلمين حتى صح أن يقال لا علاقة بين قوم منهم وقوم ولا بلد وبلد إلا طفيف من الإحساس بأن بعض الشعوب على دينهم ويعتقدون مثل اعتقادهم، وربما يتعرفون مواقع أقطارهم بالصدفة إذا التقى بعضهم ببعض في موسم الحجيج العام، وهذا النوع من الإحساس هو الداعي إلى الأسف وانقباض الصدر إذا شعر مسلم بضياع حق مسلم على يد أجنبي عن ملته، لكنه لضعفه لا يبعث على النهوض لمعاضدته"(30)

(یہ تدابر و تقاطع اور غیر موجود لوگوں پر رسیاں ڈالنا (سازشیں کرنا) مسلمانوں میں عام تھا۔ یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ان میں سے ایک قوم اور دوسری قوم اور ایک شہر اور دوسرے شہر کے درمیان صرف ایک نازک احساس کا تعلق ہے کہ بعض اقوام اُن کے دین پر ہیں اور ان جیسا عقیدہ رکھتے ہیں اور بسا اوقات اچانک اپنی جائے نظر پہنچانتے ہیں جب وہ ایک دوسرے سے حج کے عام موقع پر ملتے ہیں۔

احساس کی یہ رقم ہی افسوس اور دل کی گھٹن کا سبب بنتی ہے جب ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی حق تلفی کسی غیر مسلم کے ہاتھوں دیکھتا ہے لیکن وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کی مدد کے لیے کھڑا نہیں ہوسکتا)۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"مضى زمان فرط الهنديون عند تداخل الإنجليز في شؤنهم فتدابروا، وحول كل وجهه عن الآخر، ولم يصغوا لدعوة الله في طلب الاعتصام بحبله، فذاقوا وبال أمرهم، وسقطوا جميعاً تحت سلطة الدولة الانجليزية، وسادت عليهم واتخذت السادات من خدما لرجالها وخولا بعد أن كانت تدعى أنها خادمة لهم أمينة في الخدمة، ولم يهن لها أن تكون سيدة عادلة، بل تجاوزت فيهم حد العدل، واستبدت عليهم ظالمة جائرة، فلما لفحتهم نيران القسوة، أقبل بعضهم على بعض ونهضوا جميعاً للتملص من أغلال ظالميهم، من نحو أربع وعشرين سنة"(31)

(عرصہ گزرا جب انگریزوں نے ہندوؤں کے معاملات میں دخل اندازی کی۔ تو اس وقت ہندو افراط کا شکار ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے پیٹھ پھیر لی اور ہر ایک نے ایک دوسرے سے منہ موڑ لیا۔ اور انہوں نے اللہ کی اس پکار پر کان نہ دھرا۔ جو اس نے اپنی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا کہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے عمل کا انجام چکھ لیا اور سب کے سب انگریز حکومت کے اقتدار کے سامنے شکست کھا گئے اور وہ ان پر چھا گئے۔ اور ان کے قائدین نے انہی کے بندوں میں سے اور بہت نوکر بنا لیے۔ حالانکہ

اس سے پہلے ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ان کے خادم اور انتہائی سچے خادم۔ پھران کے لیے ایک انصاف پسند قیادت بننا آسان نہ رہا بلکہ وہ ان کے بارے میں عدل وانصاف کی حدود سے تجاوز کر گئے اور ان پر ظالم و جابر بن کر ظلم کیا۔ چنانچہ جب شدت کی آگ نے ان کو جھلسایا تو وہ ایک دوسرے کی طرف پھیل گئے اور سب کے سب ظالموں کی بیڑیوں سے چھٹکارا پانے کیلئے تقریباً چودہ سال تک کھڑے رہے)۔

سید افغانی مزید لکھتے ہیں:

"هـذه دول أوروبا جميعاً ودولة فرنسا خصوصاً شاخصة الابصار إليها أصاب مصالحها وأضاع حقوقها في القطر المصرى وأضربت جارتها فيه، ولا تبدى حركة ولا يسمع لها صوت، إلا همس خفي في الجرائد، والدولة العثمانية وهي شديدة الازرقوية العضد بما لها من المكانة في قلوب الهنديين، وكل انجليزى قلبه بين أصابع الدولة العثمانية، وأحشاه مستقرة على أناملها، وفي نظرها أن سلطتها أشرفت على الزوال في الاقطار المصرية، وسيادتها عليها كادت تكون اسماً، ومع ذلك لا تأتى عملا ولا تخطو خطوة، سوى انها اكتفت باقامة الحجج ورفع الصور بالاستغاثة لدى الدول"(32)

(یہ یورپ کے تمام ممالک اور خاص طور پر فرانس کی سلطنت سب نے اپنی نظریں ان چیزوں کی طرف گاڑھی ہوئی ہیں جو ان کے مفادات کے لیے خطرناک ہوں اور مصر کے خطے میں ان کے حقوق ضائع کر دیں۔ اس سلسلہ میں اس نے پڑوسی ملک کو بھی ساتھ شامل کر لیا۔ چنانچہ کوئی بھی تحریک نظر نہیں آتی اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دیتی ہے مگر صرف اخبارات میں ہلکی سی ایک سرگوشی اور دولت عثمانیہ جو کہ ایک انتہائی مضبوط اور طاقتور سلطنت تھی کیونکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں اس کا بہت بڑا مقام تھا اور ہر انگریز کا دل دولت عثمانیہ کی انگلیوں کے درمیان تھا۔ اور اس کا مکمل انحصار اس پر تھا (دولت عثمانیہ) اس کی نظر میں یہ تھا کہ اس کا اقتدار مصری علاقوں میں زائل ہونے کے قریب ہے اور اس پر اس کی قیادت صرف برائے نام ہے۔ اس کے باوجود نہ تو وہ کوئی عملی اقدام اٹھاتی ہے اور نہ کوئی قدم آگے بڑھاتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اس نے دلائل پیش کرنے اور دوسرے ممالک کے سامنے استغاثہ کی تحریریں پیش کرنے پر اکتفا کیا)۔

منافقت سے پرہیز:

سید جمال الدین افغانی اس حوالے سے منافقت کو سم قاتل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔ خبردار! تم اس مخلوق میں شمار کیے جانے کی کوشش نہ کرو جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے فتح کا علم دینا پسند نہیں فرمایا اور جنہیں الٹے پیروں پیچھے ہٹا کر یہ آواز دی گئی کہ جہاد سے جی چرانے والوں میں شامل ہو کر بیٹھے رہو۔ اللہ تعالیٰ منافقوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

رضوا بان يكون مع الخوالف وطبع الله على قلوبهم فهم لا يفقهون(33)

(وہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ ناپسند کرتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے سو وہ سمجھتے ہیں)۔

یاد رکھو! قرآن زندہ کتاب ہے کبھی نہیں مٹے گی۔ جسے قرآنی محامد کا کچھ حصہ ملے گا وہ محمود اور قابلِ تعریف ہے اور جو

قرآنی حقائق کی روشنی میں کسی درجہ میں بھی مستحق غضب ہوگا۔ وہی دراصل مغضوب اور گمراہ ہے۔ خدا کی کتاب ابھی منسوخ نہیں ہوئی۔ اس کی طرف لوٹ آؤ! اور اپنے حالات اور طبیعت کو اسی کی گرفت میں دے دو۔ وما اللّٰہ بغافل عما تعملون(34)۔

ہمارے خیال میں مسلمان والیانِ ملک، اپنے ''اعمالِ صالحہ'' کا انجام دیکھ کر کچھ عبرت حاصل کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان سے پیشتر واجبات عمل میں کوتاہی کرنے والے بزرگوں پر جو مصائب آئے تھے ان کا اعادہ ہونے سے پہلے وہ اپنی کمزور حالت کو سنوار لیں اور قومی ترقی کے لیے زمین ہموار کریں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ اتحاد کی طرف بلانے والی اور خوابِ غفلت سے یکایک بیدار کرنے والی پہلی پکار اس شخص کے قلم اور زبان سے نکلے گی جو مرتبے میں ان سب سے بلند اور شوکت و سطوت میں سب سے قوی ہے اور ہمیں اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ باعلم علمائے دین اس شریف اور نیک کام کو سرانجام دینے میں بیش از بیش حصہ لیں گے۔

واللہ یھدی من یّشاء (35)۔

اختلاف وانتشار کی مضرت:

خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اختلاف وانتشار سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے اور انہیں اپنی یہ نعمت یاد دلائی ہے کہ باہمی دشمنی اور عداوت رکھنے کے بعد انہیں بھائی بھائی بنایا ہے۔ قرآن کریم انہی کو حکم دیتا ہے کہ آپس میں مخالفت اور نزاع پیدا ہوتے ہی صلح ومصالحت کی کوشش بروئے کار لانے کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور ان کوششوں کو کامیاب بنانے میں اگر زیادتی کرنے والے کے خلاف لڑنے کی نوبت آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔

وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدھما علی الاخری فقاتلوا الّتی تبغی حتّی تفیئی الی امر اللّٰہ(36)

(اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں آمادہ پیکار ہو جائیں تو ان دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرو۔ پھر بھی اگر ایک جماعت دوسری کے خلاف بغاوت پر تُلی ہوئی ہو تو بغاوت کرنے والی جماعت کے خلاف مل کر لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کی طرف آ جائے)۔

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ اتحاد واتفاق کے ایک جھنڈے کے نیچے زندگی بسر کرو اور ان قوموں کے نقشِ قدم پر مت چلو جو اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی باہمی تفرقہ اور اختلاف میں پڑی رہیں۔ جو لوگ اسلام کی شاہراہ کو چھوڑ کر دوسری پگڈنڈیوں کی طرف بڑھتے ہیں انہیں قرآن کریم نے بدترین نتائج سے ڈرایا ہے۔

ومن یّشاقق الرّسول من بعدِ ما تبیّن لہ الھدٰی ویتّبع غیر سبیل المؤمنین نولّہ ما تولّیٰ ونصلہ جھنم وسائت مصیرًا(37)

(اور جو کوئی ہدایت کے صاف اور واضح ہو جانے کے بعد بھی رسول ﷺ کی مخالفت کر کے مومنوں کا راستہ چھوڑ دے گا

ہم اس کو (دنیا میں) اپنے اعمال کے سپرد کریں گے اور (آخرت میں) جہنم کی آگ میں جھونکیں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے)۔

یہ جمال الدین افغانی امت مسلمہ کے زوال میں اختلاف و انتشار کو ایک وجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی اختلاف کو اجنبی اقوام کے قبضہ اور فتوحات کا باعث بھی قرار دیتے ہیں۔ سید جمال الدین افغانی کے نزدیک کوئی قوم اس وقت تک ہلاک نہیں ہوتی جب تک اس قوم میں اختلاف و انتشار نہ آ جائے وہ لکھتے ہیں:

"وما انحرف شأن قوم وما هبطوا عن مكانتهم، إلا عند لقوهم بما في أيديهم، وقناعتهم بما تسني لهم، ووقوفهم على أبواب ديارهم ينظرون طارقهم بالسوء، وما أهلك الله قبيلا إلا بعد ما رزئوا بالافتراق، وابتلوا بالشقاق، فأورقهم ذلا طويلا وعذابا وبيلا، ثم فناء سرمديا"(38)

(کسی بھی قوم کی حالت اس وقت تک تبدیل نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اپنے مقام سے گزرے مگر اس وقت جب انہوں نے اپنے پاس موجود چیزوں پر اکتفا کیا اور انہوں نے اپنی قسمت پر قناعت کر لی اور وہ صرف اپنے گھروں کے دروازوں پر ٹھہر گئے۔ وہ اپنے دروازہ کھٹکھٹانے والے کو بری نظر سے دیکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے کسی بھی قوم کو اس وقت تک ہلاک نہیں کیا مگر جب وہ تفرقہ میں مبتلا ہو گئے اور اختلاف میں پڑ گئے۔ چنانچہ اس نے انہیں طویل ذلت، مسلسل عذاب اور ہمیشہ کی فنا میں مبتلا کر دیا)۔

افغانی مسلم ممالک کے باہمی رابطوں کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ سلطنت عثمانیہ نے مراکش، افغانستان اور دوسرے مشرقی اسلامی ممالک سے کوئی سفارتی تعلق نہیں رکھا۔

"أليس بعجيب أن لا تكون سفارة للعثمانيين في مراكش ولا لمراكش عند العثمانيين؟ أليس بغريب أن لا تكون للدولة العثمانية صلات صحيحة مع الافغانيين وغيرهم من طوائف المسلمين في المشرق"(39)

(کیا یہ بات عجیب نہیں کہ مراکش میں عثمانیوں کا کوئی سفارتخانہ نہیں اور نہ ہی عثمانیوں کے ہاں کوئی سفارتخانہ ہے۔ کیا یہ بات عجیب وغریب نہیں کہ دولت عثمانیہ کے افغانیوں اور ان کے علاوہ مشرق کے دیگر مسلمان جماعتوں سے کوئی صحیح تعلقات نہیں ہیں)۔

باہمی تعاون کی اہمیت:

اسی طرح تعاونوا على البرّ والتقوى(40) کہہ کر نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی اعانت فرض قرار دی ہے۔ سو کلمہ حق کو بلند و بالا کرنے اور قوم کی عمارت کے مینار کو اونچا کرنے سے بڑھ کر اور کونسی نیکی ہوگی جو باہمی تعاون کی زیادہ مستحق ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ کا دستِ اعانت جماعت کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ جب اجتماع صحیح مقصد کے لیے ہو اور باہمی الفت سچی ہو تو قدرتِ الٰہیہ کی اعانت کافی اعانت ہے۔ شریعتِ اسلامیہ میں اتفاق کو اتنا اہم مقام حاصل ہے کہ کسی خاص حکم کے بارے میں قوم کا اجماع یعنی متفقہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے لیے کاشف قرار دیا گیا ہے اور اس پر

عمل کرنا عام مسلمانوں پر لازم ہے اور اس سے انکار دین سے خارج ہونے کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ اتفاق کا کتنا اہتمام فرماتے تھے؟ وہ آپ کے اس قول سے ظاہر ہے:

لو دعیت الی حلف الفضول فلبیك (اگر مجھے حلف الفضول کی طرف بلایا جاتا تو میں لبیک کہتا) (41)۔

حلف الفضول☆ جاہلیت کی ایک چیز تھی مگر اتفاق کی وجہ سے وہ بھی قبول تھی۔ یہ ہے ان دلائل کا مجمل بیان جن سے اتفاق کے واجب ہونے ایک دوسرے کی مخالفت چھوڑنے اور آپس کی ایذا رسانی سے بچتے رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ شریعت کی رُو سے مسلمانوں کے ساتھ بلکہ ان کی امان میں آتے والے اور پڑوس میں رہنے والے دیگر اہل مذاہب کے ساتھ بھی اتفاق واتحاد کے ساتھ پیش آنا ضروری ہے مسلمانوں کی شریعت تنگ نظری پر مبنی نہیں اور اس میں رواداری کے لیے کافی گنجائش موجود ہے۔

قنوط اور یاس کے نقصانات:

قنوط اور یاس نے ان مدہوشوں کی امیدوں پر پانی پھیر کر انہیں ختم کر دیا ہے۔ اور ان میں گھٹیا قسم کی قناعت اور ذلت و خواری پر رضامندی پیدا ہو گئی۔ اب اگر کسی ایک کے خیال میں حق کی ایک جھلک پیدا ہو بھی جاتی ہے یا اس کے دل کی اندرونی آواز اس کو ایسے اسباب کے اختیار کرنے پر ابھار بھی دیتی ہے جس سے قوم شرف رفتہ کو حاصل بھی کر سکے اور کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ لوٹا سکے تو وہ خود ہی سمجھنے لگتا ہے کہ شاید میرے دماغی ضعف یا جسمانی کمزوری کی وجہ سے میرے دماغ میں ایسے ایسے ہوس پیدا ہوتے اور میرے دل و زبان سے ایسے ایسے ہذیان آمیز جذبات اٹھتے ہیں اور کبھی اپنے خیالات پر اس نے صحت کا یقین بھی کر لیا تو پھر اس کو یہ خدشات لاحق ہو گئے (42)۔

ہر حیوان میں مادہ غذا کے ذریعہ جہاز زندگی کو کامیابی سے چلانے کا فطری جذبہ موجود ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم کے ہر فرد کو بھی اس جذبہ کا احساس ہونے لگا ہو۔ مگر یہ پتہ کسی کو بھی نہیں کہ یہ مادہ کہاں سے حاصل کیا جائیگا۔ اور پھر کسی طرح سے ان کو حریفوں کے دستبرد سے محفوظ رکھا جائے گا۔ مگر مردہ ہمتوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ان کی مردنی آئی ہی اس وجہ سے ہے کہ وہ لمبے اور طویل عرصہ تک کے لیے اپنے معالی اور معارج کو بھلا کر پست اعمال میں آرام جان محسوس کرنے لگے۔ کیا بھٹکے ہوئے حیران و پریشان مسافر کو اس وقت سیدھی راہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب وہ کعبہ کی بجائے ترکستان کی راہ جا رہا ہو اپنے مقصد کی طرف بالکل پست کر چکا ہو۔ اور ہر قدم اٹھانے کے بعد اپنے آپ کو منزل سعادت کی طرف قریب سے قریب تر خیال کرتا ہو (43)۔ خواب خرگوش میں پڑے ہوئے خوش آئند خیالی مناظر اور خوابوں کی دنیا میں زندگی بسر کرنیوالے کو اس وقت کیسے جگایا جا سکتا ہے۔ جب اس کے کان بہرے ہوں اور بدن کا ہر ایک عضو سُن ہو چکا ہو۔ جس قوم کے اطراف دور دور تک پھیلے ہوئے ہوں۔

۱۴۔ اخوت کا پیغام:

اذا اراد الله بقوم خیرا جمع کلمتہم (اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کے کلمہ کو ایک مرکز پر جمع

کردیتا ہے)۔

فارسی جرائد کی یہ بات ہمیں بہت پسند آئی کہ وہ معتدل پالیسی کے ساتھ اپنے وطن کی سچی خدمت میں مصروف ہیں۔ اور اس بات سے ہمیں اور بھی مسرّت ہوئی کہ وہ ہمارے جریدہ کے بعض ایسے اہم حصّوں کا بڑے اہتمام سے ترجمہ فارسی میں شائع کرتے ہیں جو ان کے خیال میں مسلمانوں کے افکار ہیں۔ بیداری پیدا کرتے اور ان کی عقلوں کو اپنی بھلائی کی طرف متوجہ ہیں کرتے ہیں۔ ہم اپنی اور ہر مخلص محب قوم کی طرف سے ان جرائد کا عموماً اور تہران کے جریدہ اطلاع کا خصوصاً بہت شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ممالک اسلامیہ کو فائدہ پہنچانے کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے۔ سارے ممالک کے باشندے اگرچہ مختلف قوموں اور مختلف زبانوں میں منقسم ہیں مگر فارسی بولنے اور سمجھنے میں سب شریک ہیں۔ فارسی کو مشرق میں وہی اہمیت حاصل ہے جو فرانسیسی کو مغرب میں ہے۔ ہماری دلی آرزو تھی کہ فارسی جرائد اپنے بلند پایہ اور پُر خلوص شذرات و مقالات کے ذریعے ہمارے افکار کی تائید کریں۔ خصوصاً ان افکار کی جو اتحادِ اسلامی اور مسلمانوں کے درمیان قومی روابط قائم کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان جرائد کو یوں تو یہ دعوت اتحاد تمام دنیا کے مسلمانوں کو دینی چاہیئے مگر ایرانیوں اور افغانیوں کے باہمی اتحاد کی ضرورت و اہمیت خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیئے کیونکہ یہ دونوں گروہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں اور ایک ہی جڑ کے دو تنے ہیں اور وہ ہے پرانی فارسی نسل اسلام کے مضبوط رشتے نے انہیں ایک دوسرے سے اور بھی قریب کر دیا ہے۔ اب ان کے درمیان معمولی جزوی اختلافات کے سوا کوئی اہم اختلاف موجود نہیں وہ جزئی نوعیت کا اختلاف بھی ایسا نہیں کہ اس کی وجہ سے باہم دست و گریباں ہوکر پھٹول کی جائے اور اتحاد کی ریشمی خلعت کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ کوئی سلیم الطبع انسان یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اس قسم کے معمولی اختلافات کو شدید ترین معاندت کا بہانہ بنالیا جائے۔

سید جمال الدین افغانی نے اسلامی اخوت کے نظریہ کو پھیلانے پر بہت زور دیا۔ انہوں نے نشاۃ ثانیہ کے لیے اختلاف و انتشار کے خاتمہ اور اخوت اسلامی کی ترغیب دی وہ لکھتے ہیں:

"أليس لهم أن يتفقوا على الذب والاقدام كما اتفق عليه سائر الأمم، ولو اتفقوا فليس ذلك ببدع (ببعيد) منهم، فالاتفاق من أصول دينهم، هل أصاب الخدر مشاعرهم فلا يحسون بحاجات بعضهم البعض، أليس لكل واحد أن ينظر إلى أخيه بما حكم الله في قوله (إنما المؤمنون أخوة (إخوة) فيقيمون بالوحدة سداً يحول عنهم هذه السيول المتدفعة عليهم من جميع الجوانب"(44)

(کیا ان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح دفاع اور اقدام پر اکتفا کر لیں۔ اگر وہ اس بات پر اکتفا کر لیں۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں کیونکہ اتفاق ان کے دین کی بنیاد ہے۔ کیا ان کے دماغ پر نشہ چڑھ گیا ہے کہ انہیں ایک دوسرے کی ضروریات کا احساس نہیں ہوتا۔ کیا ان میں ہر ایک کیلئے یہ حکم نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو اسی نظر سے دیکھے جس کا اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں فیصلہ فرما دیا ہے کہ تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں کہ وہ اتحاد کے ذریعے ایک ایسا بند باندھیں جو ان سے یہ

سارے سیلاب موڑ دیں۔ جو تمام اطراف سے ان کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں)۔

سید جمال الدین افغانی نے جہاں بھائی چارے کی ترغیب دی وہاں انہوں نے امت مسلمہ کی وحدت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: بیرونی حملوں کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قوم ایک ہو جاتی ہے اور نفع و نقصان کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ان مجاوزة الحد فی تعمیم الاعتداء تنسی الامم ما بینھا من الاختلاف فی الجنسیة والمشرب، فتی الاتحاد لدفع ما یعمھا من الخطر الزم من التحزب للجنس والمذھب وفی ھذہ الحالة تکون دعوة الطبیعة البشریة إلی الاتفاق أشد من دعوتھا الیه للاشتراک فیطلب المنفعة"(45)

(عمومی زیادتی میں حد سے تجاوز قوموں کے نسلی اور رہن سہن کے اختلافات بھلا دیتی ہے۔ چنانچہ اتحاد کیوجہ سے امت کو درپیش خطرات ختم کرنے کیلئے نسل اور مذہب کا تعصب لازمی ہو گیا اور اس حالت میں انسانی فطرت کی اتفاق کی طرف دعوت اس کی اشتراکیت کی طرف دعوت سے زیادہ شدید ہو جاتی ہے چنانچہ وہ اپنا مفاد حاصل کر لیتی ہے)۔

سید جمال الدین افغانی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب تک اس امت میں اسلام کی روح دلوں میں زندہ ہے ختم نہیں ہو سکتی۔ افغانی امت مسلمہ کی ممکنات میں شامل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان ھذہ الملة لن تموت ما دامت ھذہ العقائد الشریفة آخذة ماخذھا من قلوبھم، ورسومھا تلوح فی أذھانھم، وحقائقھا متداولة بین العلماء الراسخین منھم، وکل ما عرض علیھم من الأمراض النفسیة والاعتلال العقلی، فلا بدأن تدفعه قوة العقائد الحقة، ویعود الأمر کما بدا وینشطوا من عقالھم، ویذھبون مذاھب الحکمة والتبصر فی انقاذ بلادھم، وارھاب الأمم الطامعة فیھم، وإیقافھا عند حدھا، وما ذلک ببعید"(46)

(یہ قوم ہرگز اس وقت تک ختم نہیں ہو گی جب تک یہ عقائد شریفہ ان کے دلوں میں اپنا صحیح مقام حاصل کرتے رہیں گے اور ان کے نشانات ان کے ذہنوں میں چمکتے رہیں گے اور ان کے حقائق ان کے راسخ علماء میں مروج رہیں گے اور وہ سب کچھ ان میں موجود رہے گا جو نفسانی امراض اور عقلی بیماریوں میں سے ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ چنانچہ صحیح عقائد کی قوت مدد اس کیلئے ضروری ہے اور معاملہ ویسے ہی لوٹ آئے جیسا کہ سامنے ہے۔ وہ اپنی پابندیوں کو توڑ کر باہر آئیں اور اپنے ملک کو بچانے کیلئے اور ان کے بارے میں طمع رکھنے والی قوموں سے لڑنے اور انہیں ان کی حدود پر رکھنے میں حکمت اور بصیرت کے راستوں پر چلیں اور یہ راہ کوئی مشکل نہیں ہے)۔

شیعہ سنی مفاہمت:

انہوں نے سنیوں اور شیعوں کو باہم رعایتوں اور مفاہمتوں کی بنا پر متحد کرنے کی کوشش کی جس کی اہمیت ابتداء سیاسی تھی لیکن اس سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ مذہبی رواداری کو دنیائے اسلام کے قدیم اختلافات کے ازالے کے لیے اشد ضروری سمجھتے

تھے۔علوم اسلامی کے تمام دوائر میں انہیں جو فضیلت تامہ حاصل تھی۔اس کی وجہ سے وہ جتنے مسلمان ملکوں میں گئے۔ان کے اہلِ علم نے ان کا انتہائی احترام کیا اور ان کے گرد صدہا پرشوق شاگردوں کے حلقے جمع ہو گئے۔جن کو وہ اپنے ان طریقوں کی تلقین کرتے تھے۔جن سے کام لے کر اسلام کے تاریخی، دینیاتی اور فلسفیانہ مواقف کو زمانہ حاضر کے سائنسی فکر کے کارناموں سے مطابق بنایا جا سکتا تھا(47)۔چونکہ مصر کے طبقہ شیوخ (یعنی علماء) کا رویہ معاندانہ تھا۔اس لیے محمد رشید رضا کے قول کے مطابق ان لوگوں نے مذہبی علوم کی تحصیل کے لیے سید جمال الدین سے وابستگی اختیار کی۔ان کی تعداد کم تھی۔لہذا ادبی احیاء زیادہ تر ''افندی'' یا متفرنج طبقے کے ہاتھوں ہوا۔اور یہی وجہ ہے کہ گو سید صاحب تعلیمی اور مذہبی اصلاحات پر بہت زیادہ توجہ کرتے تھے لیکن جو لوگ ان کی تلقین سے متاثر ہو کر ایسی اصلاحات کی ترویج میں کوشاں ہوتے تھے۔وہ صرف چند ہی تھے۔یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ سید صاحب کی سیاست کی طرف نوجوان محبانِ وطن جوق در جوق کھچے چلے آتے تھے کیونکہ انہیں سیاسی شورش قومی آزادی کے حصول کا سریع اور آسان ذریعہ معلوم ہوتی تھی۔اور اس سے انہیں اس بات کا موقع بھی ملتا تھا۔کہ قوم پرورانہ جذبات کا پُر شور اظہار کر سکیں۔لیکن اس کے مقابلے میں سید صاحب جن سنجیدہ اور بنیادی اصلاحات کی حمایت کرتے تھے۔ان میں مخلصانہ کام کرنے والے کم ملتے تھے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی تعلیمات میں تعمیری تصورات بھی بنیادی حیثیت رکھتے تھے جس کا ثبوت محمد عبدہ کی زندگی اور ان کے کام میں ملتا ہے۔جو سید صاحب کے شاگردوں میں اپنے استاد کے خیالات کی پیروی میں ممتاز درجہ رکھتے تھے(48)۔

۴۔ بالادست طبقوں کی خامی:

سید جمال الدین افغانی، مسلمانوں کے انحطاط اور پسماندگی کی نسبت کسی بھی اسلامی عقیدہ کی طرف کرنے کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اس کا سرچشمہ نہ یہ قضا و قدر کا عقیدہ ہے اور نہ کوئی دوسرا اسلامی عقیدہ۔اس انحطاط کو عقیدہ قضا و قدر کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک نقیض کو دوسری کی طرف منسوب کرنا۔ان کی نظر میں امت مسلمہ کے انحطاط کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں جو فتوحات حاصل کی تھیں ان کی وجہ سے ان پر ایک قسم کا نشہ طاری ہو گیا اور انہیں شوکت وغلبہ کا خمار چڑھ گیا اور اسی خمار کی حالت میں ان پر دو عظیم الشان مصیبتیں آئیں۔پہلی مصیبت مشرق سے اٹھی یعنی چنگیز خان تاتاری اور ان کی اولاد نے حملہ کیا۔اور دوسری مصیبت مغرب کی طرف سے نازل ہوئی یعنی ممالک اسلامیہ پر یورپین اقوام نے ایک اجتماعی یورش کی۔نشے کی حالت میں آنے والے مصائب رائے اور فیصلے کی قوتیں سلب کر لیتے ہیں اور انسان پر دہشت اور غفلت طاری کر دیتے ہیں(49)۔چنانچہ اس کے بعد پے در پے کئی حکومتوں نے ان پر تسلط حاصل کر لیا اور ان کے سیاسی امور کے کرتا دھرتا وہ افراد بن گئے جنہیں اسلامی سیاست سے صحیح واقفیت نہ تھی۔چنانچہ مسلمانوں کے اخلاق اور رجحانات کو بگاڑنے والے جراثیم میں یہ حکام اور نواب بھی شامل ہیں۔انہی نے مسلمانوں کی بدبختی، شقاوت اور مصیبتوں میں اضافہ کیا اور ان کے نفوس میں ضعف اور کمزوری کو جاگزین کرنے کے ذمہ دار ہیں۔اکثر مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ان کی نظر صرف ان جزئیات پر پڑتی ہیں جن کا

فائدہ ان کی ذاتی لذت اور عیش وعشرت کے حصول تک محدود ہوتا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ہی بھائی کا گلا پکڑا ہوا ہے اور کسی وجہ اور قومی سبب کے بغیر اسے ضرر پہنچانے میں مصروف ہے۔ اور اب یہی ان کی زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔ دراں حالیکہ اسی چیز نے انہیں کمزوری اور ناامیدی میں مبتلا کر رکھا ہے اور یہی ان کو اس بدترین درجے تک پہنچانے کی ذمہ دار ہے، جس میں آج نظر آتے ہیں۔

ہوس کی تباہ کاریاں:

سید جمال الدین افغانی، امت مسلمہ کے زوال کا سبب بدعنوان حکمرانوں کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

احمقوں اور بیوقوفوں نے اپنے نفسانی اغراض اور ناپاک آرزوؤں کے منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لیے بلادِ اسلامیہ کو ضعف وانحطاط کے عمیق غاروں کی طرف دھکیل دیا۔ قابلِ مذمت ہیں۔ ان کے افعال اور پست ترین ہیں۔ ان کے اعمال یہی وہ لذتوں میں منہمک ہونے اور خواہشات کی دنیا میں بےخبر سونے والے لوگ تھے۔ جنہوں نے ملت کے اتفاق واتحاد کو تباہ و برباد کیا۔ اس کی شوکت وعظمت کو پامال کر ڈالا اور علوم وفنون کی ترقی روک دی۔ صناعوں کی تاجروں اور کاشتکاروں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر صنعت، تجارت اور زراعت جیسے مفید شعبوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ دنیا کے بڑھتے ہوئے لالچ اور اشیائے حسیہ کی بے پناہ خواہش کا بُرا ہو کہ ان کی بدولت مسلمانوں کو شدید ترین مضرتوں اور بدترین نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو پسِ پشت ڈال کر اس کے ایک عظیم المرتبت حکم سے سرتابی کی۔ دشمن ان کے دروازوں پر اپنا لاؤ لشکر لئے کھڑا تھا اور وہ آپس کی لڑائی میں مصروف تھے۔ حالانکہ اس وقت ان کا فرض یہ تھا کہ ایک اسلام کے رشتے میں باہم متحد ہو جاتے اور دشمن کے حملوں کی مدافعت کرتے اپنے روزمرّہ جھگڑوں میں تو وہ اس کے بعد بھی دوبارہ مشغول ہو سکتے تھے۔ طمع کی انتہا تک پہنچنے اور دنیوی خرافات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے سے دائمی حسرت وارمان، موت کے بعد نہ مٹنے والی بدنامی اور ابدی بدبختی وحرماں کے سوا انہیں کیا ملا؟ (50)

نااہل حکمرانوں کا وبال:

سید جمال الدین افغانی نے مسلم ممالک کے نااہل حکمرانوں کو زوال کا سبب بتایا ہے جو ہر وقت اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے ہر قسم کی کارروائی خاص طور پر دوسرے مسلمان حکمرانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں جناب سید جمال الدین افغانی لکھتے ہیں:

"وولی علی أمورهم من لا یحسن سیاستها، فکان حکامهم وأمراؤهم من جراثیم الفساد فی أخلاقهم وطباعهم، وکانوا مجلبة لشقائهم وبلائهم فتمکن الضعف من نفوسهم، وقصرت أنظار الکثیر منهم علی ملاحظة الجزئیات التی لا تتجاوز لذته الآنیة، وأخذ کل منهم بناصیة الآخر، یطلب له الضرر ویلتمس له السوء من کل باب، لا لعلة صحیحة ولا داع قوی، وجعلو هذا ثمرة الحیاة، قال الامر بهم

إلى الضعف والقنوط وأدى إلى ما صار إليه"(51)

(اوراُن کے معاملات ایسے لوگوں نے سنبھال لیے جو اچھی سیاست نہیں کر سکتے تھے چنانچہ اُن کے حکام و اُمراء اپنے اخلاق وفطرت میں فساد کے جراثیم تھے، اور وہی اُن کی بدبختی اور مصیبت کا منبع تھے چنانچہ اُن کے دلوں میں کمزوری نے گھر کرلیا اور ان میں سے اکثر کی نظر میں اُن جزئیات کے مشاہدے سے قاصر ہو گئیں جو اس کی ذاتی لذت سے متجاوز نہیں تھیں اور ان میں سے ہر دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اس کے لیے نقصان چاہنے لگا اور ہر جانب سے اس کی برائی کا متلاشی ہوا کسی صحیح سبب اور کسی مضبوط دلیل کے بغیر۔ انہوں نے ان سب کو اپنی زندگی کا حاصل بنالیا چنانچہ یہ معاملہ انہیں کمزوری اور مایوسی تک لے گیا اور وہ اپنے انجام تک پہنچے)۔

سید جمال الدین افغانی مسلم حکمرانوں کی ان نادانیوں کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"لهذا يحق لنا أن نأسف غاية الأسف على أمراء الشرق وأخص من بينهم أمراء المسلمين، حيث سلموا أمورهم ووكلوا أعمالهم من كتابة وإدارة وحماية للأجانب عنهم، بل زادوا في موالاة الغرباء والثقة بهم حتى ولوهم خدمتهم الخاصة بهم في بطون بيوتهم، بل كادوا يتنازلون لهم عن ملكتهم في ممالكهم، بعد ما رؤا كثرة المطالع فيهم لهذا الزمان، وأحسوا بالضغائن والأحقاد الموروثة من أجيال بعيدة"(52)

(اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مشرق کے امراء پر انتہائی افسوس کا اظہار کریں خاص طور پر ان میں سے مسلمان امراء کیونکہ انہوں نے کتابت، ادارت اور حمایت جیسے تمام امور اور اعمال اپنوں کے چھوڑ کر غیروں کے حوالے کر دیے بلکہ اجنبیوں سے دوستی کی حد تک بڑھ گئے اور ان پر اعتماد کرنے لگے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے گھروں کی خصوصی خدمات بھی سپرد کر دیں بلکہ وہ ان کے لیے اپنے ممالک میں اپنی ملکیت سے بھی دستبردار ہونے لگے بلکہ اس دور کے بہت سے امراء کو دیکھ لیا تھا اور انہوں نے اپنے آباؤاجداد سے وراثت میں لیے ہوئے کینے اور بغض کو محسوس کر لیا)۔

جاگیرداروں اور نوابوں کی غداری و کج عملی:

سید جمال الدین افغانی مسلم ممالک کے انحطاط کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ایک بنیادی سبب کا تعین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہاں، حق کی عزت کی قسم! عدل وانصاف کے راز کی قسم! اگر مسلمانوں کو علمائے باعمل کی نگرانی میں اپنے راسخ عقائد اور اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ان کی روحیں متحد اور افراد ایک دوسرے کی الفت سے سرشار ہو جاتے۔ لیکن ہائے افسوس ان کے متاع امن کو ان مفسدوں نے برباد کیا۔ جن کی نظر میں سعادت کا بلند معیار یہیں تک تھا کہ انہیں جاگیردار یا نواب کے خطاب سے نواز دیا جائے خواہ یہ جاگیر ایسی ہی کیوں نہ ہو۔ جس میں تغیر و تبدل اور بست وکشاد کا کوئی اختیار انہیں حاصل نہ ہو۔ انہی لوگوں نے مسلمانوں کو ان ممالک سے محروم کیا جو خدائے تعالیٰ نے ان کے قبضہ اقتدار میں دے رکھے تھے ان ہی نے ان میں رد

زہر پھیلایا کہ وہ اپنے ہی بادشاہوں اور اپنے ہی خلفاء کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے لگے اور ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے (53)۔

حکومت اسلامیہ کے قیام واستحکام کے لیے اتفاق پر ایمان رکھنے کی ضرورت اتنی بدیہی ہے کہ اسے سیکھنے سکھانے کے لئے نہ کسی معلم کی ضرورت ہے اور نہ کسی تفصیل وتوضیح کرنے والی کتاب یا کثیر الاشاعت رسالے کی حاجت لکھے پڑھے افراد کو جانے دیجیے۔ معمولی سمجھ بوجھ کے مسلمان بھی جب مسلمانوں کے اختلافات اور اغراض ومفادات کے تصادم کی خبریں سنتے اور ان کے ملی مصائب کا مطالعہ کرتے ہیں تو شدتِ غم میں سرد آہیں بھرتے اور آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں۔ اے کاش! یہ گمراہ جاگیردار نواب، سیدقار اور عزت کے لالچ میں ڈوبے ہوئے انسان مسلمانوں میں پیدا ہی نہ ہوتے۔ اس وقت مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک مسلمان آپس میں متحد ہو جاتے اور سب کے سب ایک اسلامی آواز اور متحدہ اعلان پر لبیک کہتے ہوئے ایک مرکز پر آ جاتے۔

۵۔ عالمی اسلامی حکومت کا تصور:

سید جمال الدین کی تمام انتھک کوششوں اور مسلسل شورشوں کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلم اقوام ایک حکومتِ اسلامی کے ماتحت متحد ہو جائیں۔ اور ان سب پر ایک خلیفۃ المسلمین کا قطعی اور کلی اقتدار ہو جس طرح اسلام کے پُر افتخار دور میں ہوتا تھا۔ بعد میں اسلام کی متحدہ طاقت متواتر اختلافات اور نزاعات سے منتشر ہو گئی اور مسلمان ملک جہالت اور بے بسی میں غرق ہو کر مغربیوں کی چیرہ دستی کا شکار ہو گئے (54)۔

نشاۃ ثانیہ:

سید جمال الدین افغانی امتِ مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے پُر امید ہیں۔ اس بارے میں افغانی لکھتے ہیں:

"الديانة الاسلامية وضع أساسها على طلب الغلب والشوكة والافتتاح والعزة ورفض كل قانون يخالف شريعتها، ونبذ كل سلطة لا يكون القائم بها صاحب الولاية على تنفيذ أحكامها" (55)

(اسلامی دین نے اپنی بنیاد غلبہ، شان وشوکت، فتح اور عزت کی طلب پر اپنی بنیاد رکھی اور ہر اس قانون کا انکار کیا جو اس کی شریعت کے خلاف ہے اور ہر اس اقتدار کو پھینک دیا جس کو قائم کرنے والا اس کے احکام نافذ کرنے میں صاحبِ اقتدار نہ ہو)۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

"وقد تكون نشأة الأمة قائمة بدعوة الملك وافتتاح الاقطار وطلب السيادة على الامصار، وتلك الدعوة لما تستدعيه من عظم الهمم وارتفاع النفوس عن الدنايا وبعد الغايات وعلوا المقاصد" (56)

(کبھی کبھار امت کی نشعت بادشاہ کی دعوت، علاقوں کی فتح اور شہروں پر قیادت کی طلب پر قائم ہوتی ہے۔ اس دعوت کا تقاضا عظیم ارادے، دلوں کا بہت برے حرکات سے پاک ہونا، بلند مقاصد اور عظیم غایات ہیں)۔

سید جمال الدین افغانی مزید لکھتے ہیں:

"لهذا نقول أن المسلمين لا يسمح لهم يقينهم بالله وبما جاء به محمد عليه الصلوة والسلام أن يقنطوا من رحمة ربهم فياعادة مجدهم مع كثرة عددهم، ولا يسوغ لهم أيمانهم أن يرضخوا للذل، ويرضوا بالضيم ويتقاعدوا عن إعلاء كلمتهم وهم إلى الآن محفوظون مما ابتلي به كثير من الأمم فان لهم ملوكا عظاماً، ولا يزال في أيديهم ملك عظيم على بسيط الأرض، وأن من الحق أن نقول: أن أبواب رحمة الله مفتحة لديهم وما عليهم سوى أن يلجوها، وأن روح الله نافحة عليهم وما يلزمهم سوى أن يستنشقوها والفرص دائماً تمد أيديها إليهم تطلب إنها ضهم وتنبه غافلهم وتوقظ نائمهم" (57)

(اس لیے ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اُن کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین اور آنحضور ؐ پر اس بات کا یقین اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی کثیر تعداد کے ساتھ اپنی شان وشوکت لوٹانے میں اپنے رب کی رحمت سے مایوس ہوں۔ نہ ہی ان کا ایمان ذلت کا مطیع ہونا، ظلم پر راضی ہونا اور اپنا کلمہ بلند کرنے سے رُک جانے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ اب تک ان چیزوں سے محفوظ ہیں جن میں اکثر امتیں مبتلا ہیں کیونکہ ان میں بہت بڑے بڑے بادشاہ ہیں اور سطح زمین پر ان کے ہاتھوں میں بہت بڑی سلطنت رہے گی اور یہ بات بالکل سچ ہے کہ اللہ کی رحمت کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں اور ان کی ذمہ داری صرف ان میں داخل ہونا ہے اور اللہ کی رحمت ان پر سایہ گر ہے۔ ان کے ذمے صرف اس کو طلب کرنا ہے اور مواقع ان کی طرف ہمیشہ ہاتھ پھیلائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ غافل اور سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کر دیں اور متنبہ کر دیں)۔

شرعی حکومت کا قیام:

اب رہا دوسرا امر یعنی کلمہ حق بلند کرنے کے لیے حکومت اور سیادت کی توسیع تو اس کے لیے قرآن کریم کا مطالعہ فرما لیجئے۔ ہر آیت اس کے لیے تندہی سے سرگرم کار رہنے کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کے فرائض وواجبات کی ادائیگی میں سستی دکھانے سے روکتی ہے۔ شریعت کا ایک مہتم بالشان حکم یہ بھی ہے کہ جب تک فتنہ وفساد کا مکمل استیصال نہ ہو جائے اور جب تک اطاعت و فرمانبرداری خالص اللہ کے لیے مسلم نہ ہو جائے اس وقت تک مسلمانوں کے لیے شجر ملت کی شاخیں بڑھانے اور پھیلانے میں توقف کرنا جائز نہیں۔ سیرت وسنت محمدی میں بھی ان آیات کی تائید میں بے شمار نصوص وروایات موجود ہیں اور کسی سچے مسلمان کو ان کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

کیا ان اختلافات کے ہوتے ہوئے جو آج ہم میں موجود ہیں اور ان مظالم کو آسانی سے برداشت کرتے ہوئے جو ہم پر توڑے جا رہے ہیں ہمارے لیے فرائض دین کے پابند ہونے کا دعوٰی زیب دے سکتا ہے؟۔ کبھی نہیں اکثر احکام دینیہ کا اجراء ایک مضبوط شرعی حکومت کے وجود پر موقوف ہے۔ اگر اقتدار وسیادت اور باہمی اتحاد براہ راست فرائض مذہب میں شامل نہ بھی

ہوتے تب بھی ان کا حاصل کرنا ضروری ہوتا کیونکہ اُن کے بغیر دیگر فرائض کا سرانجام دینا ناممکن ہے لیکن اب جب کہ مذکورہ دلائل سے ان کا رکنِ شریعت ہونا اور مقاصدِ دین میں شمار کیا جانا بھی ثابت ہو چکا تو ان کی ادائیگی کے لیے جدو جہد نہایت ضروری ہے۔ جب بارگاہِ خداوندی میں بندوں کے اعمال پیش ہوں گے اور ان کے نیک و بد کا حساب لیا جائے گا اور جب ساری دوستیاں اور سفارشیں بیکار ہو جائیں گی۔ اُس وقت خدا کے سامنے ان دو عظیم رکنوں کے متعلق اپنی کوتاہیوں کو مٹانے کے لیے آپ کیا عذر پیش کریں گے۔ ہماری تعداد ۲۰ کروڑ یا اس سے کچھ زیادہ ہے کیا ہم ان دونوں ارکان کو قائم کر کے اپنی سفارش کا بہترین سامان نہیں کر سکتے؟ ذرا خلوت میں اپنے دلوں کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ کیا آپ کا ضمیر آپ کو اپنی موجودہ حالت پر ملامت کرتا ہے؟ اور کیا آپ سمجھانے اور عذر پیش کرنے سے مطمئن ہو کر وہ ملامت چھوڑ سکتا ہے؟ (58)۔

محض صحافت کو قومی امراض کا علاج سمجھنا:

جن کے حقوق ادا کرنے کی اہلیت سے وہ یکسر خالی ہیں۔ اس زمانے میں بعض لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ قومی امراض کا علاج اخبارات و رسائل کی اشاعت سے کیا جا سکتا ہے اور وہ صحافت کو ہی قوموں کے عروج دینے، ان کے افکار کو بیدار کرنے اور ان کے اخلاق کو استوار کرنے کی متکفل اور ضامن سمجھتی ہے۔ پہلے تو یہی فرض کرنا مشکل ہے کہ جرائد نگار اور مدیران صحائف کا مقصدِ نگارش خود غرضی سے بالکل خالی اور صرف فلاح امت ہی ہوتا ہے اور یہ فرض بھی کر لیا جائے تو موجودہ وقت میں جبکہ غفلت اور لاپراوئی کا دور دورہ ہے۔ عقول و افکار، دہشت اور اجبر کے لیے پناہ جنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور پڑھنے اور لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جرائد کو پڑھنے والا کہاں ملتا ہے۔ پڑھنے والا مل بھی جاتا ہے تو سمجھنے والے کا وجود عنقا ہے۔ سمجھنے والوں کا یہ حال ہے کہ یا تو اس کے تصورات کی دنیا بہت محدود ہوتی ہے یا وہ خود اپنے افکار و آراء کے تنگ عالم میں رہتا ہے اور لکھنے والے کے مقصد کو ایک طرف چھوڑ کر اس کے الفاظ کو اپنے قائم کردہ خیال کا تابع اور مؤید بنانے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اسی طرح جرائد اور اخبار اچھے اثرات کی بجائے اور برا اثر پیدا کر لیتے ہیں اور طبیعت سے موافقت نہ کرنے والی غذا کی طرح ضرر اور نقصانات چند در چند طریقوں سے اور بڑھا لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب افرادِ قوم کی ہمتیں تنزل کے گڑھے میں گرتی چلی جا رہی ہوں تو ان کو اخبار کے فوائد سمجھانا اور اخبار کے مندرجات پر واقف ہونے کی طرف ان کی رغبتیں پیدا کرنا اس قصیر مہلت اور کثیر الازدحام حوادث کے ماحول میں کس کے بس کا روگ ہے۔ تمہارے حقوق کی قسم یہ کام سرانجام دینا مشکل اور بہت ہی نادر ہے (59)۔

سید جمال الدین افغانی کے نزدیک مسلمانوں کو اپنے زوال کی وجوہات جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب وجہ معلوم ہو جائے گی تو اس کا علاج بھی ہو جائے گا۔ افغانی لکھتے ہیں:

"نعم رایت کثیراً من الأمم لم تکن ثم کانت وارتفعت ثم انحطت وقویت ثم ضعفت وعزت ثم ذلت وصحت ثم مرضت ولکن ألیس لکل علة دواء بلی" (60)

(جی ہاں میں نے بہت سی قومیں دیکھی ہیں جن کا وجود نہیں تھا پھر وجود میں آ گئیں اور انہیں عروج ملا پھر انہیں انحطاط ملا

اور پھر مضبوط ہوئیں پھر کمزور ہو گئیں۔ دوبارہ انہیں عزت ملی پھر وہ ذلیل ہو گئیں۔ دوبارہ صحت مند ہوئیں پھر بیمار ہو گئیں لیکن کیا ہر بیماری کی دوا نہیں کیوں نہیں)؟

افغانی مزید لکھتے ہیں:

"هـل يمكن تعيين الدواء الا بعد الوقوف على أصل الداء وأسبابه الأولىٰ والعوارض التى طرأت عليـه. إن كـان المرض فى أمة فكيف يمكن الوصول الى علله وأسبابه الا بعد معرفة عمرها وما اعتراها فيـه مـن تنقل الاحوال وتنوع الاطوار. ايمكن لطبيب يعالج شخصاً بعينه أن يختار له نوعا من العلاج قبل أن يـعـرف مـا عـرض له من قبل فى حياته ليكون على بينه من حقيقة المرض والافان كثيرا من الامراض تتولد جراثيمها فى طور من أطوار العمر ثم لا تظهر إلا فى طور آخرلتغلب قوة الطبيعة على مادة المرض فـلا يـبدو أثـرهـا. كـلا أنه ليصعب على الطيب الماهر تشخيص علة لشخص واحد سنو عمره محدودة وعـوارض حـيـاتـه مـحصورة فكيف بمن يريد مداواة ملة طويلة الأجل وافرة العدد، لهذا يندر فى أجيال وجـود بـعـض رجال يقومون باحياء أمة أو إرجاع شرفها ومجدها إليها وإن كان المتشبهون بهم كثيرين وكـمـا أن الـمـتطـبـب القاصر فى الامراض البدنية لا يزيد علاجه المرضالا شدة لو لا مـساعدة الاتفاق والصدفة بل ربما يفضى بالمريض إلى الموت"(61).

(اصل بیماری اس کے اسباب و وجوہات کے معلوم ہو جانے کے بعد ہی دوائی تجویز کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اگر مرض "امت" کو لاحق ہو تو اس کے اسباب وعلل تک پہنچنا کیسے ممکن ہے۔ الا یہ کہ اس کی عمر اس کے اندر سرایت کر جانے والے احوال اور مختلف طور طریقے معلوم ہوں۔ کیا کسی ڈاکٹر کے لیے یہ ممکن ہے کہ ایک متعین مریض کا علاج کرے اور اس کے لیے کوئی دوائی تجویز کرے بغیر یہ جانے کہ اس کو یہ عارضہ پہلے بھی زندگی میں لاحق ہوا تھا تاکہ وہ مرض کی حقیقت سے خوب واقف ہو۔ ورنہ بہت سارے امراض کے جراثیم عمر کے کسی نہ کسی حصے میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن دوبارہ کسی اور شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تاکہ طبیعت کی قوت مرض پر غالب آ جائے اور اس کا اثر ظاہر نہ ہو۔ ہر گز نہیں ماہر ڈاکٹر کے لیے بھی بہت مشکل ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی بیماری کی تشخیص کرے کہ جس کی عمر تھوڑی ہو اور اس کی زندگی کے عوارض محدود ہوں تو پھر وہ کیسے کرے گا جو ایک کثیر تعداد اور بہت لمبی عمر والی ملت کا مداوا کرنا چاہتا ہے لہذا نسل میں ایسے افراد کی کمی ہے جو امت کے احیاء، اس کے شرف اور شان و شوکت کے لیے تگ و دو کریں۔ اگر چہ ان کی مشابہت کرنے والے بہت تھے جیسا کہ جسمانی بیماریوں کے علاج سے قاصر ڈاکٹر اپنے مریض کی بیماری کو اور بڑھائے گا اگر اتفاق اور قسمت ساتھ نہ دیں بلکہ بسا اوقات وہ اپنے مریض کو موت تک پہنچا دیتا ہے)۔

۶۔ بیرونی تسلط سے آزادی:

مسلمان ملکوں کی موجودہ حالتِ انحطاط (خلافت عثمانیہ) ☆ سید جمال الدین کو ہمیشہ غمگین رکھتی تھی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اگر یہ ممالک ایک دفعہ بیرونی تسلط اور مداخلت کے بوجھ سے آزاد ہو جائیں اور اپنے ممالک میں ایسی اصلاحات کرلیں۔

جن سے یہ زمانہ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کر سکے۔ تو مسلمان قومیں یورپی قوموں کے سہارے یا ان کی نقالی کے بغیر اپنے لیے ایک جدید اور شان دار زندگی کا نظام تیار کر سکتی ہیں (62)۔

ان کے نزدیک دینِ اسلام اپنے تمام لوازم میں ایک آفاقی مذہب ہے جو اپنی داخلی روحانی قوت کی وجہ سے یقینی طور پر ایسی اہلیت رکھتا ہے کہ تمام بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کر سکے۔ سیّد جمال الدین خلافتِ عثمانی سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی مسلم طاقت کو اٹھائیں جو تمام مسلمان قوموں کے لیے ایک نقطہ ماسکہ بن جائے۔ انہوں نے مصر سے آغاز کیا۔ لیکن جب وہاں ان کے منصوبے ناکام ہو گئے۔ تو انہوں نے اپنی توقعات سوڈان میں مہدی کی بغاوت سے وابستہ کر دیں (63)۔

مسلمانوں میں احساس آزادی:

آج بھی مسلمان وہی ہیں۔ یہ ممالک اور اوطان جو ان کو اپنے متقدمین سے وراثت میں ملے ہیں۔ ان کے وجود سے معمور ہیں۔ ان کا شمار ۲۰ کروڑ سے کسی حالت میں کم نہیں۔ ان کے دلوں میں دینی عقائد کا بے پناہ جوش وخروش موجود ہے۔ اس لئے ہر خطے کے مسلمان اپنے ہمسایہ ممالک کے باشندوں کی بہ نسبت زیادہ دلیر، نڈر اور جاں نثار ہیں۔ انہی عقائد کی بنا پر وہ دنیوی زندگی اور اس کے دلفریب شان وشکوہ کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ قرآن کریم نے ان کے سامنے اپنی محکم آیات پیش کیں اور ان سے مطالبہ کیا کہ اپنے عقائد کو حجت اور برہان کی روشنی میں پرکھ لیں۔ اور ظنون واوہام کے گورکھ دھندوں سے نجات حاصل کریں۔ قرآن کریم ہی نے انہیں انسانی فضائل اور بہترین حکیمانہ اوصاف سے متصف ہونے کی تعلیم دے کر ان میں فضیلت و شرف کا احساس پیدا کیا۔ اسی وجہ سے ان کی عقلیں روشن اور اذہان سب سے زیادہ بیدار ہیں۔ کسب کمالات کے لیے ان کی استعداد بہت قوی اور توانا ہے ان کی طبیعتیں اخلاقی اقدار اور سلامت روی کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ بلکہ بسا اوقات وہ شرافت کو اپنی اور صرف اپنی واحد ملکیت سمجھتے ہیں۔ ان کی سچی کتاب ان سے وعدہ کرتی ہے کہ باطل کی ساری معرکہ آرائیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کی شان کو بلند و بالا ہی رکھے گا اور اسی وجہ سے وہ اپنے اوپر کسی غیر کی سطوت وسلطنت برداشت نہیں کر سکتے۔ کسی غیر مسلم طاقت کو نبرد آزمائی اور زر افشانی کے کتنے ہی کرتب کیوں نہ یاد ہوں کسی مسلمان کے تصور میں بھی یہ نہیں آ سکتا کہ وہ کبھی اس کے سامنے سپر انداز ہو گا۔ عقائد کے مضبوط رشتے نے ان کے درمیان وہ پائیدار اتحاد اور اخوت پیدا کر رکھی ہے کہ پنجہ اغیار میں کسی مسلمان کے گرفتار ہونے کو باقی تمام مسلمان اپنی قید اور اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ یہ احساس ان کے وجدان میں شامل ہے، اور کوئی پہلو، کوئی فریب اسے ان کے دلوں سے نہیں مٹا سکتا (64)۔

۷۔ ماضی کے شاندار ورثے سے واقفیت:

سید جمال الدین افغانی نے جریدہ العروۃ الوثقیٰ میں جو مضامین لکھے۔ ان میں تمام دنیائے اسلام کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے اتحاد اسلامی پر بہت زور دیا۔ ان کے خیال میں کسی زمانہ میں یہاں اس قوم کو ناقابل تسخیر شوکت حاصل تھی۔ ان

کے جلیل القدر بادشاہوں نے حکومت ہاتھ میں لے کر تقریباً سارے کرۂ ارض کو اپنی ہیبت اور دبدبے کے محور پر گردش تھی۔ ان کے لشکر کو کبھی شکست نہ ہوتی تھی۔ ان کا علم کبھی سرنگوں نہیں ہوتا تھا۔ ان کی باتوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کے قلعے، برج اور چھاؤنیاں ہر جگہ قائم تھیں۔ وادیوں، میدانوں اور پہاڑوں میں ان کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے وسیع اور شاداب کھیت جا بجا لہلہاتے تھے۔ ان کے شہر فنِ تعمیر کے بہترین اور مستحکم ترین قواعد کے مطابق بنائے گئے تھے۔ اور اپنی پیش کردہ عمدہ عمدہ دستکاریوں اور نئی نئی ایجادات پر نازاں تھے (65)۔

اسلامی ممالک کی کسمپرسی اور ناتوانی جتنی آج نمایاں ہے۔ آج سے ۱۰۰ سال پہلے اتنی نہ تھی۔ مسلمان اپنے شاندار ماضی کی ان یادگاروں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ جمال الدین افغانی نے اپنے مضمون میں اسلامی اتحاد کے حوالے سے لکھا ہے۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں گھر گھر علوم شرعیہ کا چرچا تھا۔ مسلمانوں کے شوکت اور دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ عباسی خلیفہ کی زبان پر ایک تہذیب آمیز کلمہ کے آتے ہی فغفور چین تک کا سر جھک جاتا تھا۔ یورپ کا عظیم ترین بادشاہ بھی لرزہ براندام ہو جاتا۔ انہی میں محمود غزنوی ☆، ملک شاہ سلجوقی اور صلاح الدین ایوبی ☆☆ جیسے فاتح بھی گزرے۔ قرون متوسطہ کی کتاب تاریخ میں عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشرق میں امیر تیمور ☆☆☆ گورگان اور مغرب میں سلطان محمود فاتح، سلطان مسلم اور سلطان سلیمان عثمانی ☆☆☆☆ جیسے بارعب شہنشاہوں کے طنطنے اب تک گونج رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی زندگیاں ختم کر چکے مگر زمانہ انہیں بھلا نہیں سکا۔ اور نہ صفحۂ ہستی سے ان کو مٹا سکا ہے۔

مسلمانوں کے ناقابل تسخیر بیڑے، بحر ابیض، بحر احمر اور بحر ہند میں اقتدار کے واحد مالک رہے ہیں (66)۔

☆ ۱۰۹۷ء تا ۱۱۳۰ء غزنی کا بادشاہ جو اپنے والد سبکتگین کی موت کے بعد ۲۷ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

☆☆ ۱۱۳۸ء تا ۱۱۹۳ء اصل نام یوسف تھا۔ شام کا سلطان اور خاندانِ ایوبی کا بانی تھا نسلاً کرد تھا۔ صلیبی جنگوں میں شرکت کی۔ فروری ۱۱۹۳ء میں ٹھنڈ لگ جانے کی وجہ سے بیمار ہوا اور دمشق میں انتقال کیا۔

☆☆☆ امیر تیمور: ۱۳۳۵ء تا ۱۴۰۵ء: یہ منگولوں کے سردار خان اعظم چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔ ۱۳۶۹ء میں سمرقند کے تخت و تاج کا مالک بنا۔ ۱۳۹۸ء میں دہلی کا ناقد فتح کیا۔ اس نے چین کو بھی فتح کرنے کے لیے حملہ کیا لیکن مہم کے دوران ہی بخار میں مبتلا ہو کر وفات پا گیا۔ سمرقند میں دفن ہوا اور ان کا مقبرہ بھی سمرقند میں ہی ہے۔

☆☆☆☆ سلطنت عثمانیہ کا بیسواں سلطان ۱۶۸۷ء تا ۱۶۹۱ء کئی بغاوتوں کا مقابلہ کیا۔ ۱۲ جون ۱۶۹۱ء کو وفات پائی اور قسطنطنیہ کی جامع مسجد سلیمانیہ میں مدفون ہیں۔

۴۔ تعمیری تصور:

لیکن سیّد صاحب کے تمام آزادانہ مقاصد اور طریقوں کے باوجود ان کی سرگرمیوں کا ایک تعمیری پہلو بھی ہے۔ جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ انہیں اسلام کے احیاء کی مخلصانہ خواہش نے متحرک کر رکھا تھا۔ انہیں اس کے احیاء کے امکان پر پورا وثوق تھا۔ اور ان کا یہ جذبہ بے حد متعدی واقع ہوا تھا۔

علامہ افغانی کا ایک بنیادی مقصد اسلامی اخوت و اتحاد کا فروغ اور ایک عالمگیر اسلامی رابطہ کا قیام تھا جس کے لیے انہوں نے ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ میں مکہ معظمہ میں قیام کے زمانے میں عملی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ یہ مقصد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا اور اپنی زندگی کے آخری چند سال اسی تحریک کے لیے وقف کر دیے۔ ہندوستان میں قیام کے زمانے میں بھی وہ اپنی علمی صحبتوں میں اتحادِ اسلامی کی ضرورت و اہمیت پر بہت زور دیتے اور اس کی اہمیت ذہن نشین کراتے تھے اور اپنے مضامین میں بھی اسی بات پر زور دیا کہ مسلمان اخوت و اتحادِ اسلامی کو صرف زبانی طور پر ایک ذہنی عقیدہ نہ سمجھیں بلکہ اس عقیدے پر عمل بھی کریں اور عالمگیر اسلامی اتحاد کو عملی حقیقت بنا کر اپنا دینی فرض ادا کریں۔

فصل دوم:

سید جمال الدین افغانی کا نظریہ تعلیم

علم اور علماء:

سید جمال الدین افغانی نے علم حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

"هذا ولا تجعلوا عصبيتكم قاصرة على مجرد ميل بعضكم لبعض، بل تضافروا بها على مباراة الأمم في القوة والمنعة والشوكة والسلطان ومنافستهم في اكتساب العلوم النافعة والفضائل (67)

(اس کے بعد یہ کہ تم اپنی عصبیت کو صرف ایک دوسرے کے جھکاؤ پر محدود نہ کرو بلکہ اسے قوت، دفاع، عظمت، اقتدار اور نفع بخش علوم اور فضائل کے حصول میں قوموں کے ایک دوسرے سے مقابلے تک بڑھاؤ)۔

سید جمال الدین افغانی نے علماء کے فرائض بتانے کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوری کو زوال کا سبب بتایا ہے۔ افغانی لکھتے ہیں:

"وأن ما يلصق منها بالعقول يوجب ضعفاً في الهمم وفتوراً في العزائم وتحقيق أهل الحق...... بعد حصول النقص في التعليم والقصير في إرشاد الكافة الى أصول دينهم الحقة ومبادئه الثابتة التي دعا إليها النبي وأصحابه فلم تكن دراسة الدين على طريقها القويم إلا منحصرة في دوائر مخصوصة وبين فئة ضعيفة لعل هذا هو العلة في وقوفهم. بل الموجب لتقهقرهم. وهو الذي نعاني من عنائه اليوم ما نسأل الله السلامة منه"(68)

(جو چیز عقول کو لاحق ہو جاتی ہے اور ارادوں میں کمزوری، عزائم میں نقص اور تعلیم میں نقص پیدا ہو جانے کے اہل حق کے اسے ثابت کرنے میں کمی اور تمام لوگوں کو ان کے برحق دین کے بنیادوں کیطرف اور ان ثابت شدہ اصولوں کیطرف رہنمائی کرنے میں قاصر ہوتی ہے جن کی طرف نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے رہنمائی فرمائی۔ ان میں کمزوری کا سبب بنتی ہیں۔ چنانچہ دین کی تعلیم اس کے سیدھے راستے پر صرف مخصوص حلقوں میں اور ایک کمزور جماعت تک محدود نہیں تھی۔ شاید ان کے ٹھہر جانے کا سبب یہی ہو۔ بلکہ یہ بات ان کے پیچھے ہٹنے کا سبب بنی۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کی مشقت میں ہم آج مبتلا ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس سے سلامتی مانگتے ہیں)۔

افغانی علماء کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

"إلا إنا نأسف غاية الأسف اذا لم تتوجه خواطر العلماء والعقلاء من المسلمين إلى هذه الوسيلة وهي أقرب الوسائل وإن التفتت اليها في هذه الأيام طائفة من أرباب الغيرة، ورجاؤنا من ملوك المسلمين وعلمائهم من أهل الحمية والحق أن يؤيدوا هذه الفئة ولا يتوانوا فيما يرجى جمعهم ويجمع

شتیتهم، فقد دراستهم التجار ببیان لا مزید علیه، وما هو بالعسیر علیهم أن یبثوا الدعاة الی من یبعد عنهم،ویصافحوا بالأکف من هو علی مقربة منهم، ویتعرفوا أحوال بعضهم فیما یعود علی دینهم وملتهم بفائدة، أوما یخشی أن یمسهابضرر، ویکونون بهذا العمل الجلیل قدأدوا فریضة وطلبوا سعادة، والرمق باق والآمال مقبلة، والی الله المصیر"(69).

(مگر ہمیں انتہائی افسوس ہوتا ہے جب مسلمانوں کے جید علماء وعقلا اس وسیلے کیطرف توجہ نہ فرمائیں حالانکہ یہ سب سے قریب ترین ذریعہ ہے اگر غیرت مند لوگوں کی ایک جماعت آجکل ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوتو میری توقع مسلمان بادشاہوں اور اہل ہیبت وحق میں سے علماء ہیں۔انہیں چاہیے کہ اس جماعت کی تائید کریں اور ایسی چیز میں کوئی سستی نہ کریں جو ان کے اتفاق کو متحد رکھیں اور ان کے افتراق کو جوڑ دیں۔چنانچہ تاجر لوگوں نے ان کو ایسے انداز میں تعلیم دی کہ اس سے بڑھ کر اور نہیں ہوسکتی۔یہ بات ان کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ وہ دعوت دینے والوں اپنے سے دور لوگوں میں پھیلا دیں اور اپنے سے قریب لوگوں سے اپنے ہاتھوں سے مصافحہ کریں اور ایک دوسرے کا اس انداز میں حال پہچانیں جو ان کے دین اور قوم کے بارے میں فائدہ مند ہو یا جس کے بارے میں خطرہ ہو کہ اسے کوئی نقصان پہنچے گا وہ اس عظیم عمل کیوجہ سے ایک فریضہ ادا کر چکے ہوں گے اور ایک سعادت طلب کرلیں گے جبکہ یہ رمق باقی ہے آرزوئیں سامنے ہیں اور اللہ ہی کی طرف جانا ہے)۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

"فعلی العلماء الراسخین وهم روح الأمة، وقواد الملة المحمدیة، أن یهتموا بتنبیه الغافلین عن ما أوجب الله، وإیقاظ النائمة قلوبهم عما فرض الدین، ویعلموا الجاهل، ویزعجوا نفس الذاهل ویذکروا الجمیع بما أنعم الله به علی ابائهم، ویستلفتوهم ألی (إلی) ما أعد الله لهم لو استقاموا، ویحذروهم سوء العاقبة لو لم یتدارکوا أمرهم بالرجوع إلی ما کان علیه النبی ﷺ وأصحابه ورفض کل بدعة، والخروج عن کل عادة سیئة"(70).

(چنانچہ راسخ علماء کی ذمہ داری ہے جو کہ امت کی روح میں اور امت محمدیہ کے قائدین ہیں کہ وہ اللہ کے عائد کردہ احکام سے غافل لوگوں کو تنبیہہ کریں اور جن لوگوں کے دل دین کی ذمہ داریوں سے سوگئے ہیں۔ان کو جگائیں، جاہل کو سکھائیں اور ست کے نفس کو جھنجوڑیں اور سب لوگوں کو وہ نعمتیں یاد دلائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے آباؤاجداد پر کی تھیں اور انہیں اس چیز کی طرف متوجہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے ان کیلیئے تیار کررکھی ہے اگر وہ استقامت اختیار کریں اور انہیں برے انجام سے بچائیں اگر وہ اپنا معاملہ نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کی تعلیمات کیطرف نہ جوڑیں اور ہر بدعت کا انکار نہ کریں اور ہر بری عادت سے نہ رکیں)۔

سید جمال الدین افغانی کے نزدیک علماء کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں میں اللہ کے احکام کی تعمیل کا احساس پیدا کرتے ہوئے امت کو بھائی چارہ کا درس دیں۔افغانی لکھتے ہیں:

"ولا ریب أن الراسخین فی العلم من أهل الدین الإسلامی یعلمون أن ما أصیب به المسلمون فی

هذه الأزمان الأخيرة، انما هو مما امتحنهم الله به جزاء على بعض ما فرطوا، وليس للناس على الله حجة فالرجاء في هممهم وغيرتهم الدينية وحميتهم الملية أن يوجهوا العناية إلى رتق الفتق قبل اتساعة، ومداواة العلة قبل استحكامها فيذكروا أبناء الملة بأحكام الله، ويحكموا بينهم روابط الأخوة والألفة كما أمر الله في كتابه وعلى لسان نبيه، ويبذلوا الجهد لمحو اليأس و القنوط الذى ملك أفئدة البعض منهم، ويقنعوهم أنه لا ييأس من لطف الله إلا الذين في قلوبهم مرض وفي عقائدهم زيغ، ويسيروا بهم في سبيل يجمع كلمتهم، ويوحد وجهتهم، ويقوى فيهم إباء ة الضيم، والنفرة من الذل، ويحرك فيهم روح الأنفة، حتى لا تسمح نفس أحدهم أن يأتي الدنية في دينه، ويكشفوا لهم حقيقة وعد الله ووعده الحق في قوله(وكان حقا علينا نصر المؤمنين)"(71).

(اس میں کوئی شک نہیں کہ دین اسلام والوں میں جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان آخری ادوار میں مسلمانوں پر جو بھی آفات نازل ہوتی ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے امتحانات میں سے ہیں اور ان کی حد سے تجاوز کرنے کا بدلہ ہو۔ لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت نہیں۔ ان کے ارادوں سے ان کی دینی غیرت اور ان کی ملی حمیت سے توقع یہ ہے کہ وہ زخم کو اس بڑھنے سے پہلے ہی مندمل کرنے کی طرف توجہ دیں اور بیماری کو جڑ پکڑنے سے پہلے علاج کریں۔ چنانچہ قوم کے جوانوں کو اللہ کے احکام یاد دلائیں اور ان کے درمیان اخوت، محبت کے روابط مضبوط بنائیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے نبی اکرم ﷺ نے زبانی حکم فرمایا اور نا امیدی ختم کرنے کیلئے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں جس نے ان میں بعض کے دلوں کو جکڑ لیا ہے اور انہیں اس بات پر قائل کریں کہ اللہ کی مہربانی سے صرف وہ لوگ مایوس ہوتے ہیں جن کے دلوں میں بیماری ہو اور جن کے عقائد میں ٹیڑھا پن ہو اور انہیں لیکر ایسے راستے پر چلیں جو ان کی آواز کو متحد کریں اور ان کے رُخ کو ایک بنائیں اور جو ان کے اندر ظلم سے انکار، ذلت سے نفرت کے جذبے کو مضبوط بنائیں۔ اور ان کے اندر غیرت کی روح کو متحرک کریں۔ یہاں تک کہ کسی کا دل اسے اپنے دین میں کوئی ذلیل حرکت کرنے کی اجازت نہ دے اور وہ ان کے سامنے اللہ کے وعدہ کی حقیقت کھول دیں، جبکہ اس کا وعدہ سچا ہے اس کے اس فرمان میں مومنوں کی مدد کرنا ہم پر حق ہے)۔

ا۔ مروجہ دینی تعلیم کی اصلاح:

تعلیمی اصلاح کے سلسلے میں علامہ افغانی دینی تعلیم کے طریقے میں اصلاح کو انتہائی ضروری خیال کرتے تھے اور اس بارے میں اپنے خیالات کو بغیر کسی جھجک کے صاف صاف ظاہر کر دیتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک مقالے میں جو "معلم" (حیدر آباد) میں شائع ہوا تھا، تعلیم کی خرابیوں اور خامیوں اور علمائے دین کی بے علمی و بے خبری کا حال بیان کرتے ہوئے بہت ہی واضح طور پر لکھا کہ "فی زمانہ مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ شروع سے آخر تک بگڑا ہوا ہے۔ مثلاً عربی کو لیجئے۔ عربی کی تعلیم کا مفہوم علم نحو کو حاصل کرنا سمجھا جاتا ہے۔ علم نحو کے حاصل کرنے کا اصل منشا اور مقصد یہ ہے کہ صحیح طور پر زبان کا بولنا اور لکھنا پڑھنا آ جائے اور بس۔ لیکن مسلمان طلباء کا تمام وقت اس کی لایعنی بحثوں میں اور فلسفیانہ موشگافیوں میں صرف ہو جاتا ہے اور عمر بھر عربی پڑھنے کا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عربی میں دو جملے صحیح بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔حتیٰ ایں کہ دو سطر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

علم معانی و بیان جس کو ادبیات کہتے ہیں اور جس کی تحصیل سے انسان منشی، خطیب اور شاعر ہوسکتا ہے۔ اس کا یہ حال ہے کہ تمام عمر پڑھنے کے بعد روز مرہ کی گفتگو پر بھی طالب علم قادر نہیں ہوتا۔ علم منطق جو میزان افکار کہا جاسکتا ہے اور انسان کو حق و باطل اور صحیح و فاسد کا امتیاز کرنے پر قادر کرتا ہے اس کا اثر مسلمان سلطنتوں پر یہ ہوا کہ ان کے دماغ ممکنہ خرافات اور واہیات سے مملو پائے جاتے ہیں۔ اور ان کے اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔ علم حکمت جس کا تعلق موجودات خارجیہ کی اصول کے بحث سے ہے اس میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ ''صدرا'' اور ''شمس بازغہ'' پڑھ لیا اور خود کو حکیم سمجھنے لگے حالانکہ دائیں بائیں کا فرق نہ معلوم ہوا اور اتنی بھی صلاحیت پیدا نہ ہوئی کہ معلوم کریں کہ خود کیا ہیں، کون ہیں اور ان کو دنیا میں کیا کرنا چاہیے کبھی بھولے سے نہ پوچھا کہ یہ تار برقی کیا ہے۔ یہ بخاری کشتی کیا چیز ہے۔ ریل کیسے بنتی ہے اور چلتی ہے۔

صاحبو! میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ان لوگوں کا خیال کرتا ہوں جو چراغ لیے شام سے صبح تک ''شمس بازغہ'' کا مطالعہ کرتے ہیں اور کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ چراغ کی چمنی نکال دی جائے تو کیوں چراغ دھواں دینے لگتا ہے اور چمنی لگا دینے سے کیوں دھواں موقوف ہو جاتا ہے۔ تُف ہے ایسے حکما پر اور تف ہے ایسی حکمت پر، حکیم وہ ہے جو حوادث اجزائے عالم پر غور کرے نہ کہ اندھوں کی طرح راستہ چلے جن کو منزل مقصود سجھائی نہیں دیتی۔

مسلمانوں کا علم فقہ حاوی ہے تمام حقوق بلدیہ اور دولیہ پر۔ پس چاہیے کہ مرد فقیہ صدر اعظم یا سفیر کبیر ہو سکے۔ حالانکہ ہم اپنے فقہاء کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کا انتظام کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اور اپنی نا اہلیت کو قابل فخر سمجھتے ہیں۔

علم شریعت درحقیقت حکمت و قوانین سے واقف کرتا ہے اور مختلف احکام کے علل منفعت و مضرت کو ظاہر کرتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ہمارے شارعین و طلباء قوانین مذہبیت کے سمجھنے سے محض عاری ہیں۔ بہر حال ہمارے علماء کی حالت ایک باریک فتیلہ کی سی ہے جس پر ایک کمزور شعلہ ٹمٹمارہا ہو جو نہ تو اپنے اطراف روشنی پہنچا سکتا ہے اور نہ دوسروں تک اس کی روشنی پہنچ سکتی ہے۔ عالم اگر حقیقی عالم ہو تو اس کی مثال ایک نور کی سی ہو سکتی ہے کہ جس کی روشنی تمام عالم پر پھیلتی ہے۔ اگر تمام عالم کو منور نہ کرے تو عقلاً اپنے گھر، یا اپنے قریہ یا اپنے شہر کو وہ روشن کر سکتا ہے۔ یہ ہمارے علماء کیسے ہیں کہ چراغ تلے اندھیرے کی مثال ان پر صادق آتی ہے۔

ہر قوم میں ایک مخصوص طبقہ ہونا چاہیے جس کا وظیفہ تعلیم عوام ہے۔ اور ایک اور طبقہ ایسا ہونا چاہیے جس کا طبقہ تعلیم عوام ہو اور ایک اور طبقہ ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کی اخلاقی تربیت کا ذمہ لے۔ ایک طبقہ فطری جہالت کا مقابلہ کرکے تعلیم پھیلائے۔ اور دوسرا طبقہ فطری جذبات سے جنگ کرکے ضبط و نظم کا ذوق پیدا کرے۔ یہ دونوں کارکن یعنی تعلیم پھیلانے والا معلم اور ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کرنے والا ضابطہ اسلام کے اہم ترین تقاضوں میں سے ہے(72)

۲۔ جدید مفید تعلیم کی اہمیت:

عجب تو یہ ہے کہ ہمارے زعماء نے علم کی دو قسمیں قرار دے رکھی ہیں۔ایک کو علم مسلمانان اور دوسرے کو علم فرنگ کہتے ہیں، اور اس طرح بعض مفید علوم کے حاصل کرنے سے لوگوں کو منع کرتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ علم وہ شریف شے ہے جو کسی طریقہ سے مخصوص نہیں۔۔۔۔۔کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مسلمان ان علوم کو جو ارسطو☆ اور افلاطون☆☆ سے منسوب ہیں غایت رغبت کے ساتھ سیکھتے ہیں لیکن اگر غالیہ (گلیلو)☆☆☆ اور کیلر☆☆☆☆ کے علوم کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی جائے تو اس کو کفر سمجھتے ہیں! حق وہ ہے جو دلیل اور برہان رکھے۔جو علماء علوم اور معارف کے حاصل کرنے سے منع کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں۔ وہی مسلمان اسلام کے محافظ ہو سکتے ہیں جو علوم و معارف مختلفہ سے آشنا اور واقف ہوں۔۔۔۔الحاصل مسلمانوں کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ ہمارے علمائے دین خود اپنی اصلاح نہ کریں اور علوم و معارف سے خود بہرہ ور نہ ہوں۔اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے خرابی دنیا ہی ہمارے علمائے دین میں واقع ہوئی اور ان سے یہ عام امت میں سرایت کر گئی(73)۔

۳۔ قومی زبان اور ذریعہ تعلیم:

علامہ افغانی نے سیاسی اتحاد کے علاوہ ہندوستان کے لیے لسانی اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر بھی بہت زور دیا ہے۔اپنے ایک مقالہ میں جو"فلسفہ وحدتِ جنسیت واتحاد لغت" کے عنوان سے "المعلم" حیدرآباد میں شائع ہوا تھا اور اپنی تقریروں میں جو انہوں نے حیدرآباد اور کلکتہ میں کی تھیں اجتماعی زندگی کے بعض اہم مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لسانی اتحاد کی اہمیت بھی واضح کی۔حیدرآباد میں اساتذہ، طلباء، علماء، امراء اور دوسرے سربرآوردہ لوگوں کے اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ قوم کی تعمیر و ترقی اور قومی اتحاد کے لیے قومی زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔جن قوموں کی کوئی قومی زبان نہیں ہوتی وہ ایک قومی زبان نہیں ہے لیکن خوش قسمتی سے ایک ایسی زبان موجود ہے جو کم و بیش ہندوستان کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور کوشش کرنے سے پورے ملک کی مشترک قومی زبان بن سکتی ہے۔

☆ یونان کی ریاست مقدونیہ قصبہ ستاگیر میں پیدا ہوا (۳۸۴ق م تا ۳۲۲ق م)۔یہ ماہر ریاضی دان، فلسفی اور ماہر فلکیات تھا۔اٹھارہ سال کی عمر میں افلاطون کی شاگردی اختیار کی۔

☆☆ افلاطون: (۴۲۷ق م-۳۴۷ق م) ایتھنز کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوا۔اس نے مصر، افریقہ، اٹلی اور سسلی کا دورہ کیا۔

☆☆☆ گلیلو: ۱۵۶۴ء تا ۱۶۴۲ء جدید سائنس کا بانی، ماہر علوم فلکیات، فلسفہ پیدائش اٹلی کے شہر پیسا میں ہوئی۔اس نے علم طب، علم ریاضی، فلسفہ اور طبیعات میں گراں قدر اضافہ اپنی تحقیقات سے کیا اور نام پیدا کیا۔

☆☆☆☆ کیلر:

قومی زبان اور لسانی اتحاد کے سلسلے میں علامہ افغانی نے ۸۲-۱۸۸۱ء میں ہندوستان کے جن تعلیمی مسائل پر اظہار خیال کیا ان کی اہمیت کو خود ہندوستانی بھی عملی طور پر نصف صدی کے بعد سمجھ سکے۔ اپنے مضمون ''وحدتِ جنسیت و اتحادِ لغت'' میں انہوں نے جدید علوم کی تعلیم وطنی زبان میں دینے پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''ہندوستان کے حالات پر نظر کر کے کیوں کہ اہلِ ہند میں سے وہ لوگ جو نورِ بصیرت کی چوٹی پر آ گئے اور جنسیت کے معنی سمجھنے لگے ہیں اور اس کے فائدوں سے واقف ہو گئے ہیں اور مستقبل پر نظر رکھتے ہیں اور تدبر کی خوردبین سے قوموں اور قبائل کے حالات کا راز دیکھتے ہیں، کیوں اس مسئلے پر غور نہیں کرتے اور کیوں اس ضروری کام کو انجام نہیں دیتے اور کیوں اس کا اہتمام نہیں کرتے۔

کیا وہ نہیں جانتے کہ جنسیت کی بقا کا انحصار اس پر ہے کہ مدارس میں تعلیم وطنی زبان میں ہو۔ کیا یہ امر باعث تعجب نہیں کہ علوم جدیدہ نے سارے عالم پر قبضہ کر لیا ہے اور فنون نے کرہ ارض کا احاطہ کر لیا ہے لیکن حال یہ ہے کہ اس میں سے کسی اچھی چیز کا زبان ہندی میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ اہلِ ہند اس نکتہ سے غافل ہو گئے کہ اگر ان کی قومی زبان میں علوم نافعہ ان کی قومی مدنیت کا جزو نہ بنیں گے تو ان کی قومیت کو پائیداری حاصل نہ ہوگی۔ کیا یہ خبر نہیں کہ عقلا کے ذمہ پہلا فرض یہ ہے کہ وطن کی زبان کی توسیع کریں۔ پھر کیوں علوم جدیدہ کو قومی زبان میں اور خصوصاً اردو میں جو بمنزلہ عام ملکی زبان کے ہے ترجمہ کر کے کیوں دوسری زبانوں جیسی کہ سنسکرت، مرہٹی اور بنگالی ہیں مدد نہیں لیتے اور کیوں وقت ضرورت اپنی زبان کی کمی پوری کرنے کے لیے لغتِ انگریزی سے مدد نہیں لیتے ہیں۔

بہت زمانہ ہو گیا قوم انگریز جو علومِ نافعہ اور فنونِ مفیدہ کی استاد ہے، ملک ہندوستان میں حکمرانی کر رہی ہے۔ پس کس وجہ سے دانش مندانِ ہندوستان اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتے اور اس کے علوم سے اپنے وطن کے لیے ایک ذخیرہ حاصل نہیں کرتے۔ اور کیونکر ممکن ہے کہ ان علوم جدیدہ سے اپنے وطن کے لیے ذخیرہ حاصل کریں جب تک کہ ان علوم کو زبان وطنی میں ترجمہ نہ کر لیں، اور کیونکر ممکن ہے کہ علوم ملک میں عام ہو جائیں، جب تک کہ وہ اس ملک کی زبان میں رائج نہ ہوں اور وہ علوم میں بیگانہ زبانوں میں ہوں کیونکر پائیدار ہو سکتے ہیں اور کسی کو فخر کرنے کا کیا موقع ہے اگر اس کے کتب خانے میں غیر زبان کی ہزار کتابیں ہیں، حالاں کہ قوم کے فائدہ کی ایک کتاب بھی ملکی زبان میں موجود نہ ہو۔ کیا کوئی عاقل دوسروں کے فخر کو اپنا فخر سمجھ سکتا ہے اور کیا سوائے اپنی جنس کے دوسرے کی جنس پر کوئی عقلمند فخر کیا کرتا ہے۔ اگر کوئی (بیاجوہا) یعنی پہلوان پنبہ یہ کہے کہ جدید علوم کا مقصود ایک ہی ہے خواہ وہ وطنی زبان میں ہوں یا غیر زبان میں موجود ہیں اور انگریزی قوم عرصے سے تمام ہندوستان پر حکمران ہے، اور غالب کی متابعت اور مماثلت ہر حال میں لازم ہے اس لیے ہم ہندوستانیوں کو چاہیے کہ غالب قوم سے منافع حاصل کرتے اور فوائد حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستی کا لباس اتار ڈالیں اور تعین قومیت کی قید کو اٹھا دیں اور یکبارگی غالب قوم کے وجود میں فنا ہو جائیں اور علوم معارف کو فاتح قوم کی زبان میں حاصل کریں اور ان کی زبان کو ہر چیز پر ترجیح دے کر وطنی زبان کے بجائے استعمال کریں بلکہ تمام امور میں ایسا ہی کریں۔ پس ایسے شخص سے کہنا چاہیے کہ اولاً کہ یہ خواہش غالب کی طرف سے ہو تو

اس کو غالب کے تعلّی اور نخوت کے حدِّ اعتدال سے گزرنے پر محمول کیا جاسکتا ہے لیکن اگر مغلوب اس بات کو اپنی زبان پر لائے تو بلاشک اس کا منشا سوائے خوشامد اور تملّق کے کچھ نہیں۔۔۔۔یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زبانِ انگریزی کی تعلیم کو بالکل بند کر دیا جائے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ زبانِ انگریزی کا حاصل کرنا چند وجوہ سے ہندوستانیوں پر لازم ہے۔

۴۔ اسلامی اردو یونیورسٹی کی تجویز

اردو زبان کے فروغ اور تعلیمی اصلاح و ترقی کیلئے علامہ افغانی نے ۱۸۸۴ء میں ایک انقلابی تجویز پیش کی۔ جس پر حیدر آباد کی حکومت نے چالیس سال کے بعد (۱۹۲۴ء) عمل کیا وہ تجویز یہ تھی کہ حیدر آباد میں مسلمانوں کیلئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں پوری تعلیم اردو زبان میں دی جایا کرے۔ حیدر آباد میں جامع عثمانیہ کا قیام ایک بہت بڑا علمی کارنامہ تسلیم کیا گیا۔ اور اہل نظر ہندوستان کے دوسرے علاقوں کو اس کی تقلید کرنے کا مشورہ دیتے رہے۔ لیکن افغانی کی دور اندیشی اور دور بینی نے اس اہم قومی ضرورت کو عملی شکل دینے کی کوشش جاری رکھی۔ چنانچہ ہندوستان کے جانے کے بعد جب وہ پیرس میں قیام پذیر ہوئے اور بلنٹ ہندوستان آتے ہوئے۔ جب ان سے ملنے گئے۔ تو انہوں نے بلنٹ سے یہ خواہش کی کہ وہ مجوزہ یونیورسٹی کے قیام پر وائسرائے ہند لارڈ رپن کو متوجہ کریں۔ بلنٹ نے ہندوستان آنے کے بعد رپن کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ اور جب بلنٹ نظام وائسرائے سے ملنے کلکتہ گئے تو بلنٹ نے سالار جنگ اور دوسرے امراء سے اس یونیورسٹی کے بارے میں گفتگو کی۔ ان لوگوں نے افغانی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ یہ تجویز نظام کے سامنے باقاعدہ طور پر پیش کی جائے۔ چنانچہ جنوری ۱۸۸۴ء میں بلنٹ نے نظام کے نام ایک خط کے ساتھ یہ تجویز سالار جنگ کے پاس بھجوادی۔ اس خط کے جواب میں سالار جنگ نے ۱۳ فروری ۱۸۸۴ء کو بلنٹ کے نام ایک خط میں لکھا کہ ہز ہائی نس نظام نے لارڈ رپن سے جب وہ حیدر آباد تشریف لائے تھے۔ اس معاملے کے متعلق گفتگو کی۔ ہز ایکسی لنسی نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس کی حمایت کرنے کیلئے تیار تھے۔ ہز ہائی نس اس تجویز کو مسلمانوں کی ترقی کیلئے ضروری سمجھتے تھے۔ اور ان کو خوشی ہوگی اگر دوسرے مقامات کے مقابلے میں حیدر آباد کو اس یونیورسٹی کا مرکز بنا دیا جائے۔ ہز ہائی نس کو حیرت ہے کہ ہز ایکسی لنسی وائسرائے نے بھی ان سے اس کام میں امداد کرنے کا وعدہ کیا ہے"۔ اس خط میں سالار جنگ نے نظام کی اس خواہش کا اظہار کیا تھا، کہ بلنٹ اس تجویز کو مکمل کرنے کے لیے چند روز اور اس ملک میں ٹھہر جائیں اور حیدر آباد آ کر اس معاملے میں نظام کی مدد کریں۔ لیکن بلنٹ کی مصروفیات نے اس کی اجازت نہ دی۔ اور جلد ہی ہندوستان سے چلے گئے۔ بلنٹ کے جانے کے بعد یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی۔ اور اس اہم اور مفید تجویز کو جو افغانی کے زرخیز ذہن کی قابل قدر پیداوار تھی۔ عملی شکل اختیار کرنے کیلئے چالیس برس انتظار کرنا پڑا۔ آخر چالیس سال کے بعد حیدر آباد میں جامع عثمانیہ کے نام مسلمانوں کیلئے اردو یونیورسٹی قائم ہوگئی (74)۔

فصل سوم:

سید جمال الدین افغانی اوران کی انقلابی تحریک

سید جمال الدین افغانی کی سرگرمیاں عملاً پوری دنیائے اسلام اوران یورپی ممالک پر بھی حاوی رہیں۔جن کی حکومتیں مسلمان قوموں کے معاملات سے سیاسی واسطہ رکھتی تھیں۔افغانستان، ایران، ترکی، مصر، ہندوستان سب سے وقتاً فوقتاً سید صاحب کا قوت آموز ربط پیدا ہوا اور یہ سب اس ربط سے متاثر ہوئے اور آخر ۵ اگست ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ کو قیام مشروطہ پر منتج ہوا☆۔اپنے ابتدائی مراحل میں سید صاحب ہی کے مشورے اور حوصلہ افزائی سے فیضیاب ہوا تھا(75)۔

۱۹۰۸ء/۱۳۲۶ھ میں نوجوان ترکوں کی کامیاب تحریک ☆☆سید صاحب ہی کی شورش کے ماتحت تیار ہوئی تھی۔جس کو انہوں نے قیام قسطنطنیہ کے دوران میں پروان چڑھایا تھا۔مصری قوم پروروں کی وہ تحریک جو اپنے ابتدائی مرحلے میں ''عرابی بغاوت'' کے ناکام ہونے کی وجہ سے خاک میں مل گئی تھی۔اس کے ابتدائی محرک سیّد صاحب ہی تھے۔اور مصر میں جس ذہنی اور مذہبی بیداری کے علم بردار محمد عبدہ تھے۔وہ بھی بہت بڑی حد تک سیّد صاحب ہی کی ممنونِ احسان تھی۔جس کا مفصل ذکر بعد میں آئے گا۔مائیکل نے شیخ محمد عبدہ کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ''وہ جہاں کہیں جاتے تھے۔

اپنے پیچھے بحث ونزاع کا ایک میدان چھوڑ جاتے تھے۔اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ قومی آزادی کی تمام تحریکیں اور یورپی مہم پروری کے خلاف ہنگامے جو ہم بیس برس سے مشرق کے ملکوں میں دیکھ رہے ہیں۔ان سب کا ماخذ محمد عبدہ ہی کے پروپیگنڈے میں مضمر ہے(76)۔

اسلامی کانگریس کا اہتمام:

سید جمال الدین افغانی نے سلطان عبدالحمید والئ ترکی کی دعوت اس لیے قبول کی تھی کہ خلیفۃ المسلمین کے اشتراک و تعاون سے وہ ملت اسلامیہ میں اتحاد واخوتِ اسلامی کے رشتے کو جو کمزور پڑ گیا تھا نہایت مستحکم بنادیں گے اور خلافت اسلامیہ کو جو عظمت و وقار سے محروم ہوگئی تھی،تمام اسلامی دنیا کی طاقت کا مظہر بنا کر اس کی عظمت وشوکت اور عزت وقوت کو بحال کردیں

☆ سید جمال الدین ہی کا ایک مکتوب تھا۔جس سے مجتہد العصر ایران حاجی میرا حسن شیرازی متاثر ہوئے اور انہوں نے ایک فتویٰ صادر کر دیا کہ جب تک اجارہ تمباکو قائم ہے تمباکو کا استعمال اور اس کی کاشت شرعاً حرام ہے۔عوام نے اس ہدایت کے ماتحت تمباکو سے مقاطعہ کر دیا اور اس قدر نفرت وناراضی پھیلی کہ حکومت نے اس اجارے کو منسوخ کر دیا۔علماء وعوام کے اس اتحاد کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ اور وزیر اعظم قتل کر دیے گئے۔اور بالآخر ایران کو ایک آئین عطا کر دیا گیا(انقلاب ایران،صفحہ ۱۵ میں دیکھو عربی رسالہ ''ضیاء الخافقین'' سے مجتہد العصر کے نام سیّد صاحب کے مکتوب اور ایران کی حالت پر ان کے دو مقالوں کا ترجمہ پوری کتاب میں انقلاب کے ابتدائی مرحلوں سے آخر تک مکمل اور قابل تعریف تفصیلات درج کی گئی ہیں۔

☆☆ ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے ملک کو سلطان عبدالحمید کے استبداد سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کی تھی۔

گئے۔ علامہ افغانی جب استنبول پہنچے تو سلطان نے ان سے اتحادِ اسلامی کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور مرکزِ خلافت کو مستحکم و با اقتدار بنانے کے متعلق ان کی تجاویز سے بہت خوش ہوئے کیونکہ سلطان کا یہ خیال تھا کہ خلافت کی قوت و وقار میں اضافہ خود اس کے حق میں بہت مفید ہوگا۔ چنانچہ سلطان نے علامہ افغانی کی اس مہم کو کامیاب بنانے میں ہر طرح مدد دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن علامہ کو پتا چل گیا کہ سلطان کا نظریہ اتحادِ اسلامی خود ان کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ تاہم انہوں نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور سلطان کی تائید وتعاون سے فائدہ اٹھا کر خود اپنے نظریہ اتحادِ اسلامی کو عملی شکل دینے کی کوشش کرنے لگے (77)۔

علماء و زعماء کو دعوت:

علامہ افغانی نے ترکی، ایران، افغانستان، ہندوستان، عراق، شام، حجاز، یمن، مصر، طرابلس، تیونس، الجزائر، مراکش اور دوسرے اسلامی ممالک کے پانچ سو ممتاز علماء اور زعماء کی ایک فہرست بنائی اور ان کو عربی، فارسی، اردو اور ترکی زبانوں میں خطوط لکھے اور مرکزِ خلافت کے لیے شیعوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے کربلا، نجف اور ایران کے ممتاز مجتہدین سے خط و کتابت کی۔ علامہ افغانی نے اپنے خطوط میں ملتِ اسلامیہ اور ممالکِ اسلامیہ کو درپیش خطرات اور فرنگی اقوام کے جارحانہ مقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے نہایت مؤثر اور مدلل طریقے سے اس حقیقت کو واضح کیا کہ اگر مسلمان سلطنتیں متحد ہو جائیں گی تو یورپ کی تمام قومیں مل کر بھی ان کے خلاف کامیاب نہ ہو سکیں گی۔ اور اگر ساری دنیا کے مسلمان اسلامی اتحاد و اخوت کے رشتے کو پھر زندہ کر لیں اور اس کو فروغ دیں تو ملتِ اسلامیہ ایک ناقابلِ تسخیر عالم گیر قوت بن جائے گی اور مسلمانوں کو ان مصائب و مشکلات سے نجات مل جائے گی جن میں وہ افتراق و انتشار کی بدولت مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس وقت اسلامی دنیا کو انتہائی نازک حالات اور نہایت اہم مسائل کا سامنا ہے اور ان کا دینی و ملی فرض یہ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے ملتِ اسلامیہ کے اتحاد اور خلافتِ اسلامیہ کے استحکام کے لیے مؤثر عملی تدابیر اختیار کریں (78)۔

حوصلہ افزا جواب:

علامہ افغانی کے خطوط کے جواب بہت حوصلہ افزا ملے۔ علماء مجتہدین اور زعما سب نے علامہ کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کیا اور اپنی مکمل تائید وتعاون کا یقین دلایا۔ چنانچہ علامہ نے اپنی جدوجہد کو آگے بڑھانے اور ایک عالم گیر اسلامی تنظیم قائم کرنے کے لیے تمام ممالک کے مسلمان نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک جلسہ کیا گیا جس میں رضا پاشا شیعی، سید برہان الدین بلخی، ابوالحسن مرزا، عبدالکریم بک، نواب حسین ہندی، شیخ احمد روحی، مرزا آقا خان کرمانی، مرزا خان خبیر الملک، حمدی بک، جواہر زادہ اصفہانی، شیخ محمود، افضل الملک روحی اور دوسرے اکابر کافی تعداد میں شریک ہوئے، اور علامہ افغانی نے اتحادِ اسلامی کے منصوبے پر اظہارِ خیال کیا۔

مختلف ممالک کے سربرآوردہ مسلمانوں کو خطوط لکھنے کے علاوہ افغانی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کے لیے ایک وفد روانہ کیا جائے جو مجوزہ اسلامی کانگریس کے اغراض و مقاصد اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد سے

مسلمانوں کو آگاہ کرے۔علامہ کی یہ تجویز بہت پسند کی گئی۔مختلف ممالک سے خطوط کے جو جواب موصول ہوئے وہ سلطان کو پیش کر دیے گئے اور ان کو دیکھ کر سلطان بہت خوش ہوئے (79)۔

سرزمین ایران کی مردم خیزی:

ایرانیوں کی بلند ہمتوں اور عالی افکار سے یہ بعید نہیں کہ وہ اتحادِ اسلامی کی تجدید وتقویت کے لئے اسی طرح پہلا قدم اٹھائیں گے جس طرح انہوں نے ابتدائے اسلام میں علوم کی نشر واشاعت احکام اسلامی کی حفاظت اور اسرارِ دینی کی وضاحت کے سلسلے میں اٹھایا تھا۔ چنانچہ انہوں نے شریعتِ مقدسہ کی خدمت ہر ممکن طریقہ سے کی اور اس میں کسی قسم کی تقصیر روا نہ رکھی۔

ہاں بخاری (i)، مسلم نیشاپوری (ii) نسائی (iii)، ترمذی (iv)، ابن ماجہ (v)، ابوداود (٦)، ابوجعفر کلینی (٧) اور دیگر علماء ایران کی خاک سے اٹھے۔امام فخر الدین رازی (٨) نے تہران میں تربیت حاصل کی۔مشہور فلسفی ابوعلی سینا (٩)، اور ان جیسے کئی اور نامور افراد ایران کی سرزمین میں وہیں کی مٹی سے پیدا ہوئے۔ایرانیوں ہی نے سب سے پہلے عربی زبان کے اصول و قواعد منضبط کئے۔اور اس فن میں رضی اور سیبویہ نے لازوال شہرت حاصل کی۔ایرانیوں ہی نے علوم بلاغت کی اساس رکھی۔جس کے ذریعہ قرآنی اعجاز کی وضاحت ہوئی اور انسانی دسترس کی حد تک قرآنی دقائق کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔اس علم کے

۱۔ محمد بن اسماعیل: (۲۰ جولائی ۸۱۰ء تا ۳۱ اگست ۸۷۰ء) محدث: محمد بن اسماعیل ابوعبداللہ۔ابھی بچے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ابتدائی تعلیم بخارا سے حاصل کی اور یہیں آپ کا انتقال ہوا۔

۲۔ مسلم نیشاپوری: ۸۱۷ء تا ۸۷۵ء محدث: پورا نام مسلم بن حجاج ابوالحسن قشیری نیشاپوری تھا۔امام الحدیث صحیح مسلم کی وجہ سے مشہور ہوئے۔آپ نے مصر، عراق، شام اور عرب کے سفر کیے۔

۳۔ نسائی: ابوعبدالرحمٰن بن احمد شعیب مشہور محدث۔خراسان میں پیدا ہوئے۔مصر میں سکونت اختیار کی۔۹۱۵ء میں وفات پائی۔

۴۔ ترمذی: ۸۹۲ء مشہور محدث پورا نام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ہے۔

۵۔ ابن ماجہ: ان کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی تھا۔ان کا عہد ۸۲۴ء سے ۸۸۶ء تک کا ہے۔ان کو احادیث جمع کرنے کا شوق تھا۔اس سلسلہ میں عراق، عرب، شام اور مصر تک کے سفر کیے۔

۶۔ ابوداود: سلیمان بن الاشعث السجستانی پورا نام ہے۔ابوداود کنیت ہے۔آپ کا زمانہ ۸۱۷ء تا ۸۸۸ء تک کا ہے۔

۷۔ ابوجعفر کلینی: علامہ ابوجعفر بن محمد ۸۶۴ء تا ۹۴۱ء، تہران کے قصبہ کلین میں آپ کی ولادت ہوئی۔انہوں نے بیس سال کی محنت سے الکافی لکھی۔

۸۔ امام فخر الدین رازی: ۲۵ رمضان ۵۴۳ھ میں رے شہر میں پیدا ہوئے۔

۹۔ بوعلی سینا: پورا نام ابوعلی الحسینی بن سینا تھا۔بخارا کے قریب بمقام افشنا پیدائش ہوئی۔نامور طبیب، ریاضی دان، عظیم فلسفی اور مشہور مفکر تھے۔ان کا زمانہ ۹۸۰ء تا ۱۰۳۷ء تک کا ہے۔ہمدان میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

موجد عبدالقادر جیلانی (۱۰) ایران ہی کے باشندے تھے۔ زمخشری (۱۱)، سکاکی (۱۲) جیسے اساطین علم وادب جنہوں نے قرآنی دقائق کی تشریح اور ارکانِ دین کے استحکام میں نمایاں حصہ لیا۔ سب اسی سرزمین سے اٹھے۔

آگے چلئے۔ مورخین کے قافلہ سالار طبری (۱۳) اور جغرافیین کے قائد قزوینی (۱۴) بلاد فارس ہی کے رہنے والے تھے۔ اسی طرح شبلی نہاوند کا بایزید بسطامی (۱۵) بسطام کا۔ اور ابن عربی کا حقیقی استاذ ہروی ہرات کا رہنے والا تھا اور یہ سارے شہر ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر کیا صدر الشریعہ۔ فخر الاسلام بزدوی، آمدی، برہان الدین مرغینانی، سرخسی (۱۶)، سعد تفتازانی، میر سید شریف اور ابی ورد جیسے فرزندانِ ایران کو اسلامی تاریخ سے لگاؤ رکھنے والے بھلا سکتے ہیں؟ اور کیا صدر الدین شیرازی، قطب الدین شیرازی (۱۷) میر فندرسکی اور متاخرین میں فلاسفہ کا سرتاج میر باقر داماد ایران کے رہنے والے نہیں تھے؟ وہ کونسا

۱۰۔ عبدالقادر جیلانی: ۱۰۷۷ء/۱۱۶۶ء پیدائش گیلان میں ہوئی۔ ۱۸ سال کی عمر میں والدہ سے اجازت لے کر علم حاصل کرنے کی غرض سے بغداد تشریف لے گئے۔

۱۱۔ زمخشری: (۱۰۵۷ء تا ۱۱۴۴ء) نام ابوالقاسم محمود بن عمر تھا۔ فقہ، کلام اور لسانیات کے ایرانی عالم تھے۔ پیدائش خوارزم میں ہوئی۔ اس نے اپنی اہم ترین تصنیف تفسیر قرآن مجید الکشاف میں شہرت حاصل کی۔

۱۲۔ سکاکی: سراج دین یوسف بن ابوبکر بن محمد ۵۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک صنعت کار تھا۔ وہ تالے بنانے کے فن میں ماہر تھا۔ اس نے ایک خوبصورت قلمدان بنا کر اس میں چھوٹا سا تالا بھی لگایا۔ جس کا وزن ایک قیراط تھا۔ اور اسے حاکم وقت کو تحفہ کے طور پر پیش کیا۔ انعام حاصل کیا۔ حاکم نے اس کی قدر و منزلت کی لیکن چند دن بعد ہی اس کی موجودگی میں ایک عالم حاکم کے پاس آیا جس کی قدر و منزلت حاکم نے سکاکی سے کہیں زیادہ کی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ عالم کی قدر صنعت کار سے زیادہ ہے تو نے علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ ابتداء میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن بعد ازاں اس نے فقہ حنفی کے بارے میں ایک کتاب ''الکنیہ'' کے نام سے لکھ کر شہرت حاصل کی۔ لیکن اس کی زیادہ شہرت کا سبب اس کی کتاب ''مفتاح العلوم'' کے باعث ہوئی۔ سکاکی کا انتقال فرغانہ (ایران) کے شہر المالغ کے قریب قریہ الکندی میں ۶۲۶ھ کو ہوا۔

۱۳۔ طبری: ۸۳۹ء-۹۲۳ء اصل نام ابوجعفر ابن جریر تھا۔ مورخ اور مفسر تھے۔ پیدائش طبرستان کے علاقے آمل میں ہوئی۔ زندگی کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت اور درس و تدریس میں گزارا۔ آپ کی تصنیف شدہ ''تاریخ الامم والملوک'' دنیا کی مستند ترین شمار ہوتی ہے۔ ان کی تفسیر قرآن جامع البیان فی تفسیر القرآن کے نام سے مشہور ہے۔ وفات بغداد میں ہوئی۔

۱۴۔ قزوینی: محمد بن عبدالوھاب پورا نام تھا: آپ کی پیدائش تہران میں ہوئی۔ صرف و نحو، فقہ و اصول فقہ وغیرہ بھی تہران کے اساتذہ سے سیکھے۔ ۱۳۲۲ھ میں اپنے بھائی کی دعوت پر لندن گئے اور وہاں دو سال میں مختلف کتب خانوں سے مستفیض ہوئے۔ تہران میں آپ کا مزار ہے۔

۱۵۔ بایزید بسطامی: صوفی بزرگ نام ابویزید بایزید بسطامی تھا چونکہ بسطام میں پیدائش ہوئی (۷۴۵ء) اس لیے بسطامی کہلوائے۔ ۸۷۵ء میں بسطام میں انتقال کیا۔

۱۶۔ سرخسی:

۱۷۔ قطب الدین شیرازی: ۱۲۳۶ء-۱۳۱۱ء مشہور طبیب و مصنف۔ اصل نام محمود بن مسعود تھا۔ طبیبوں کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ طب کے علاوہ ہیئت اور فلسفہ میں بھی شہرت حاصل کی۔ آخر عمر میں قطب الدین نے تبریز جا کر گوشہ نشینی اختیار کی اور تبریز میں ہی انتقال ہوا۔

فن ہے جو فضیلت میں شمار ہونے کے بعد ایرانیوں کی دسترس سے باہر ہو۔ اور کونسا امتیاز ہے جس کے ذریعے اللہ تعالی نے مسلمانوں کو سرفراز کیا ہو اور ایرانی اس کے حصول کے لیے سارے مسلمانوں سے پیش پیش نہ رہے ہوں اور ہاں نبی کریم ﷺ کا فرمان لو کان العلم فی الثریا لنا له رجال من ابناء فارس بھی تو انہی کے بارے میں صادر ہوا ہے(80)۔

ایرانی، افغانی اتحاد کی اہمیت اور بداعتمادی کے نقصانات:

تو اے فرزندانِ فارس! علم پر آپ نے جو احسانات کئے ہیں انہیں یاد کیجئے۔ اور اسلام میں آپ کے جو نقش قدم باقی ہیں ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھئے اور اب مذہبی اتحاد کے لیے اسی طرح ستون بن جائیے جس طرح آپ اسلام کے دورِ عروج کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ جس بہادری اور جاں نثاری سے آپ نے اسلام کی خدمات انجام دی ہیں۔ اسے دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کو عروج سے دوبارہ ہمکنار کرنا بھی آپ ہی کا کام ہے۔ اتحاد اسلامی کی بنیاد رکھنے کی توقع بھی دنیا بھر کے مسلمانوں کی بہ نسبت آپ ہی سے زیادہ کی جاسکتی ہے۔ یہ کام آپ کے عزائم کی بلندی و پائیداری اور خاندانی فضائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے لیے مشکل نہیں۔ میرے خیال میں آپ کے لیے اب یہ امر کوئی پوشیدہ راز نہیں رہا کہ آپ کی افغانیوں کے ساتھ ملنے کی دعوت دینے کا یہی بہترین وقت ہے۔ اسی وقت آپ ان کے ساتھ ظلم اور سرکشی کرنے والوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر سکتے ہیں اور اتحاد و اتفاق کا ایسا مضبوط اور ناقابلِ تسخیر حصار بنا سکتے ہیں کہ لالچی دشمن قدم اٹھانے کی جرات نہ کر سکیں۔ میرے خیال میں یہ بات آپ کو بھولی نہ ہوگی کہ انگریزوں کے قدم ہندوستان میں اسی لئے جم گئے کہ ایرانی اور افغانی آپس کے جھگڑوں میں مشغول تھے۔

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہندوستان کا ہر مسلمان پنجاب کی طرف ٹکٹکی لگائے انتظار کر رہا ہے کہ آپ افغانیوں کیساتھ اتحاد کر کے کب پنجاب کی طرف کوچ کرتے ہیں؟ آپ نے کافی تجربے حاصل کئے اور آپ کی چشم بصیرت نے حوادث اور واقعات کے بے شمار مظاہر سے سرمہ عبرت حاصل کیا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے قومی اتحاد کی شاندار عمارت منہدم ہو گئی ہے کیا اس کے بعد ایک دوسرے سے جفا کاری اور بے رخی کا برتاؤ جاری رکھنے کے لیے آپ کوئی وجہ جواز پیش کر سکتے ہیں۔

یہ آپس میں بھائی بندی اور اتفاق کا وقت ہے۔ یہ ایک دوسرے سے ملنے اور باہمی اعتماد کا زمانہ ہے۔ دشمنوں نے آپ کے ممالک کا احاطہ مشرق اور مغرب دونوں طرف سے کر لیا ہے۔ ان کا ہر فرد اپنی تلوار کو سان پر چڑھانے اور اپنے تیروں کو سیدھا کرنے میں مصروف ہے۔ اور آپ کے ممالک اور مقبوضات پر حملہ کرنے اور لوٹ مار مچانے کے لیے موقع تلاش کر رہا ہے۔ اگر اس وقت آپ نے فرصت کو غنیمت نہ سمجھا اور یہ وقت یوں ہی ضائع کر دیا تو عمر بھر پچھتانا پڑے گا(81)۔

ولا تکونوا کالّذین تفرّقوا اختلفوا من بعد ما جاء ھُم البیّنات واولئك لھم عذاب عظیم (اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جو کھلی ہدایتوں کے آ جانے کے بعد بٹ گئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے اور یہ لوگ، ان کے لیے عذاب ہے)۔

اب افغانیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ آنکھیں کھولیں، کمر ہمت باندھیں غور و فکر اور حزم و تدبر سے کام لیں اور آنے والے

دور میں ان کی قیمت کا جو فیصلہ ہونے والا ہے، اسے اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے ایرانی بھائیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ عمومی مسائل کے بارے میں مختلف سیاسی پالیسی رکھنے کے لیے افغانیوں اور ایرانیوں میں کوئی مابہ النزاع موجود نہیں۔ کیونکہ دونوں ایک ہی اصل سے تعلق رکھتے ہیں اور دونوں میں دینِ اسلام جیسا قوی اور اشرف ترین رابطہ قائم ہے۔ افغانیوں اور ایرانیوں کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس نازک موقع پر ان کا باہمی اختلاف نہ صرف ان کے لیے بلکہ ان کے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کے لیے بھی بے حد مضر ہوسکتا ہے۔ اس لیے دونوں کا یہ فرض ہے کہ کلمہ اتحاد لا الـــہ الاّ اللہ اور دینی روابط کا وقار قائم رکھیں اور چھوٹے چھوٹے مذہبی اختلافات کو کلمہ اسلام کی عزت گھٹانے اور حقیقی روابط کو قطع کرنے کا بہانہ نہ بنائیں۔ ایک جزئی اختلاف کی خاطر سارے نقشِ اتحاد کو مٹا دینا کسی طرح بھی دانش مندانہ فعل نہیں (82)۔

میرے خیال میں دونوں ملکوں پر بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ ان پر جتنے بھی مصائب نازل ہو چکے ہیں۔ ان سب کا سبب آپس کے اختلاف ہی تھے۔ فروعی اختلافات کو سابقہ زمانوں میں بھی بعض اربابِ سیاست نے مخالفتوں اور ضد بازیوں کا آلہ کار بنایا تھا اور بسا اوقات انہیں ان کوششوں کا فائدہ بھی پہنچا ہے۔ لیکن آج اس کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ میرے خیال میں یہ حقائق کسی عاقل کی نظروں سے مخفی نہیں ہیں: اس وقت ان اختلافات کے دروازے پر تماشائی بن کر کھڑے رہنا غلط ہے۔ افغانیوں کو اس سے آگے بڑھ کر وحدتِ اسلامیہ کے وسیع احاطہ میں پہنچنا چاہیئے۔ انہیں ہر طرف سے خطرات نے گھیر رکھا ہے اور ان کی نجات کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے ایرانی بھائیوں کے ساتھ اتفاق و اتحاد قائم رکھیں اس کے لیے اس سے بہتر وقت کبھی نہ آئے گا۔ افغانیوں کے پاس اس مقصد کو ٹالنے کا کوئی عذر موجود نہیں۔ افغانیوں کا یہ پہلا اور آخری فرض ہے کہ ان اوقات میں اپنے ایرانی بھائیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اور فرصت کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں (83)۔

افغانیوں اور ایرانیوں کو چاہیئے کہ اپنے ممالک کے تحفظ کے لیے اتحاد و اتفاق ہی کی فصیل کھڑی کریں اور اسی کو دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بہترین وسیلہ حرب بنائیں اور اسی کے سرچشمے سے اپنے ممالک کی فلاح و بہبود اور خوشحالی و سیرابی کا سامان مہیا کریں۔ اسی طرح وہ خود بھی شرف و ترقی کے بلند مدارج طے کر سکیں گے اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی دائمی عزت و سرفرازی کی دولت و وراثت میں چھوڑیں گے۔

خلاصہ کلام

اس باب میں سید جمال الدین افغانی کا تصورِ انقلاب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں فصل اوّل میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ، دین کی اہمیت اور اسلام کے فضائل، سیاسی اتحاد، اخوت کا پیغام شامل ہیں۔

دوسری فصل میں اسلامی حکومت کا تصور اور پان اسلام ازم بیان کرتے ہوئے فصل سوم میں تعلیم کے بارے میں کچھ تجاویز سید جمال الدین افغانی نے دی ہیں مثلاً

اسلامی اردو یونیورسٹی کی تجویز۔

قومی بطور ذریعہ تعلیم۔

جدید مروجہ دینی تعلیم کی اصلاح۔

حوالہ جات

1- غلام نبی طارق، القرآن شی و عجیب، نعمانی کتب خانہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۹۔

2- ایم۔این رائے، انقلاب کی تاریخ، ترجمہ گوپال متل، مکتبہ اردو لاہور، ص ۱۴۔

3- ایضاً، ص ۱۴۔

4- ایضاً، ص ۱۷۔

5- جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقی، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۳۲۔

6- ایضاً، ص ۱۰۹۔

7- ایضاً۔

8- W.S. Blunt, Seerat History of Egypt, London, 1907,New York, 1992.

9- انقلاب ایران، ص ۲-۳۰۔

10- سورۃ آل عمران، آیت ۱۷۳۔

11- مشاہیر، جلد دوم، صفحہ ۶۱۔

12- محمد عبدالقدوس ہاشمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص ۱۲۷۔

13- ایضاً، ص ۱۲۸۔

14- ایضاً، ص ۱۲۹۔

15- النساء، ۷۷۔

16- محمد عبدالقدوس ہاشمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو لاہور، ص ۱۳۰۔

17- ایضاً، ص ۱۳۲۔

18- ایضاً، ص ۱۳۴۔

19- ایضاً۔

20- ایضاً، ص ۱۳۷۔

21- الرد علی الدھریین، جس کا فارسی سے عربی میں ترجمہ شیخ محمد عبدہ نے کیا۔ مطبع رحمانیہ قاہرہ ۱۹۲۵ء، ص ۸۲۔

22- ایضاً۔

23- جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقی، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص -

24- ایضاً، ص ۱۳۷۔

25- ایضاً۔

26- محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۲۶۔

27- ایضاً، ص۴۷۔
28- التوبہ: ۱۰۵۔
29- جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۔
30- ایضاً۔
31- ایضاً۔
32- ایضاً۔
33- التوبہ، ۸۷۔
34- البقرہ: ۸۴۔
35- البقرہ: ۲۱۳۔
36- الحجرات: ۹
37- النساء: ۱۱۵
38- جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص
39- ایضاً۔
40- المائدہ: ۲۔
41- حدیث کا حوالہ دینا ہے۔
42- عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۱۶۱۔
43- جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۱۶۳۔
44- ایضاً، ص ۴۷۔
45- ایضاً، ص ۳۔
46- ایضاً، ص ۵۷۔
47- ڈاکٹر چارلس سی ایڈمز (مترجم عبدالمجید سالک)، اسلام اور تحریک تجدد مصر میں، مجلس ترقی ادب، نرسنگھ داس لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۲۰۔
48- المنار، جلد دوم، ۱۸۹۹ء، صفحہ ۲۴۶۔
49- محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۱۳۸۔
50- ایضاً، ص ۲۵۔
51- جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۔
52- ایضاً۔

53۔ محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص۱۳۶۔
54۔ جرجی زیدان، مشاہیر الشرق، مطبوعہ قاہرہ، مصر، جلد دوم، ص ۶۱۔
55۔ جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۲۱-۲۲۔
56۔ ایضاً۔
57۔ ایضاً، ص ۸۵۔
58۔ محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۸۱۔
59۔ جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۱۶۸۔
60۔ ایضاً، ص ۱۴۔
61۔ ایضاً، ص ۱۵۔
62۔ ڈاکٹر چارلس سی ایڈمز (مترجم عبدالمجید سالک)، اسلام اور تحریک تجدد مصر میں، مجلس ترقی ادب، نرسنگھ داس لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۱۸۰۔
63۔ المنار، جلد ہشتم، ص ۴۰۰؛ رسالہ، ص ۲۳۔
64۔ محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۶۱۔
65۔ ایضاً، ص ۵۹۔
66۔ ایضاً، ص ۶۰۔
67۔ جمال الدین افغانی، سید محمد عبدہ، العروۃ الوثقیٰ، دارالعرب قاہرہ، مصر، ۱۹۵۷ء، ص ۴۸۔
68۔ ایضاً، ص ۲۸۔
69۔ ایضاً، ص ۳۵۔
70۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔
71۔ ایضاً، ص ۶۶۔
72۔ الرد علی الدھریین، جس کا فارسی سے عربی میں ترجمہ شیخ محمد عبدہ نے کیا۔ مطبع رحمانیہ قاہرہ ۱۹۲۵ء صفحات ۸۲-۹۰۔
73۔ شاہد حسین رزاقی، سید جمال الدین افغانی، حیات و افکار، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور، ص ۸۰۔
74۔ ایضاً۔
75۔ محمد عبدہ شیخ، رسالہ التوحید، مترجم فرانسیسی رسالہ مائیکل، مطبوعہ پیرس، ۱۳۱۵ھ، ص ۲۳۔
76۔ ایضاً۔
77۔ جمال الدین افغانی، حیات و افکار، شاہد حسین رزاقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور، ص ۱۸۴۔
78۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔
79۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔

80۔ محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۹۰۔

81۔ آل عمران، آیت ۱۰۵۔

82۔ محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ص ۹۰۔

83۔ ایضاً، ص ۹۹۔

باب پنجم

مولانا عبیداللہ سندھیؒ

کا تصورِ انقلاب

تعارف

اس باب میں مولانا عبیداللہ سندھی کے تصورِ انقلاب کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ باب تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں شاہ ولی اللہ کے نظریات کی جھلک اور ولی اللہی سیاسی تحریک کے بارے میں بتایا گیا ہے جبکہ دوسری فصل میں مولانا عبیداللہ سندھی کے انقلابی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں محنت کشوں کی حکومت کا قیام اور پارٹی کی تشکیل، حکمت عملی وغیرہ شامل ہیں۔ تیسری اور آخری فصل میں مولانا سندھی کے تصورِ انقلاب کا ذکر کیا گیا ہے۔

فصل اوّل:

شاہ ولی اللہ کے نظریات کی ترجمانی

الف: انقلاب کے اصول اور شاہ ولی اللہ کا اندازِ فکر

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا فکر و فلسفہ وہ جامع نظریہ ہے جس میں طبیعات کے ابتدائی عناصر سے لے کر انسانی سماج کی تشکیل اور اس کے چار ارتقائی دائروں کی صورت گری تک اور پھر انسان کے نفسی قوتوں اور ان کی چار بنیادی اخلاق سے لے کر مادراطبیعات کے مقدس مقامات تک کائنات میں موجود تمام اس کے حقائق، خواص، افعال اور احکام کو ایک مربوط نظام فکر و فلسفہ میں مرتب کر دیا گیا ہے اور پھر یہ سب کچھ قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ اور رسول اللہ کی سنت صحیحہ کے جامع اسرار و رموز اور جماعت صحابہ رضوان اللہ اجمعین کے کامل اسوہ کا بہترین نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک آنے والے تمام مجددین، مجتہدین امت علمائے ربانیین اور عادل سلاطین کے طرز فکر و عمل کا لب و لباب ہے۔ مولانا سندھی نے اسے اپنی فکر و عقل کا مرکز بنایا (1)۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر کو بڑھایا ہے اور اپنے انقلاب کے لیے انہیں کا فلسفہ فکر کی دعوت دی ہے۔

ولی اللٰہی پروگرام کا اجمالی بیان:

امام ولی اللہ کی حکمت میں سب سے پہلے ضروری ہے:

۱۔ فک کل نظام۔ ہر نظام کو پہلے توڑنا ہے خواہ نظام سرمایہ داری، ملوکیت و شہنشاہیت، شاہی ڈکٹیٹر شپ، سوشلزم جو الحاد پر مبنی ہو۔ نیشنلزم جو ایمان سے خالی ہو اور فوضویت انارکزم وغیرہ تمام نظاموں کو درہم برہم کرنا ضروری ہے اور انقلاب کی شرط اوّل ہے۔

۲۔ اس کے بعد سب سے پہلے فکر کو پاک کرنا ضروری ہے یعنی ایمان اور توحید کا پاکیزہ عقیدہ اختیار کرنا۔ رسالت اور قیامت پر یقین اور اسی عقیدہ پر مسکین نوازی کی بنیاد قائم کرنا۔

۳۔ تقشف (poverty) اور رفاہیت بالغہ Luxury کو ختم کرنا اور حالت متوسطہ کا قیام خوراک (روٹی پانی) رہائش (مکان) لباس صحت تعلیم کے لیے ایک متوسط حالت قائم کرنا۔ جس میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہو سکیں۔

۴۔ تعلیم کو جبری اور لازمی بنانا۔

۵۔ ارتکازِ دولت کو روکنا۔

۶۔ تعیش کے اسباب کو مٹانا یا کم سے کم کرنا۔

۷۔ تعیش والے پیشے اور حرام پیشوں کو ختم کرنا اور ممنوع قرار دینا اور تمام جائز اور مفید پیشوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور پیشوں

کی صحیح تقسیم کرنا۔

۸۔ مال کے جمع وخرچ کے قانون (حلال وحرام) کی پابندی کرنا۔

۹۔ اپنی جائز ضروریات زندگی سے زائد اثاثہ، جائیداد اور مال کو رفاہ عامہ (عوامی مصلحت) کے کاموں پر خرچ کرنے کے لیے جماعت کے نام منتقل کرنا(2)۔

جدید تعلیم کی اہمیت:

جدید دنیا نے جن چیزوں میں مادی لحاظ سے ترقی کی ہے۔ اپنے ماحول اور حالات کے مطابق ان سے استفادہ کرنا۔ اس بات کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر فن وہنر فلسفہ یا حکمت تمام انسانوں کی متاع مشترک ہے۔ کسی خاص قوم یا طبقہ یا ملک کی میراث نہیں کہ باقیوں کو اس سے محروم کر دیا جائے۔ خلق لکم ما فی الارض جمیعًا (البقرۃ) کے تحت تمام انسان اس میں شریک ہیں۔ البتہ استفادہ کے لیے جو اصول قرآن یا اسلام نے متعین کیے ہیں جن کی بہتر تفصیل امام ولی اللہ نے کی ہے۔ ان کو کام میں لانا چاہیے، چنانچہ حق استفادہ یا خرید وراثت، وصیت، ہبہ، وقف، صدقہ، خیرات، عطیہ اور تحصیل حق سے حاصل ہوگا اور یہی ارتکاز دولت کے روکنے کے ذرائع ہیں۔ کوئی بھی ایسا نظام فطرت کے خلاف ہوگا جو مذہب و دین کی گنجائش اپنے اندر نہ رکھتا ہو یا چھوٹے اور محدود پیمانے پر انفرادی ملکیت کو جائز نہ قرار دیتا ہو۔ اکثر و بیشتر مذہبی رہنماؤں نے پرانس ایمپیریل نظاموں یعنی سرمایہ داری اور ملوکیت یا مستبد ڈکٹیٹروں کے لیے مذہب کو آلہ کار بنایا۔ جس کی بنا پر ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھا بقول ابن خلدون ''ابعد الناس عن السیاسۃ العلماء'' علماء اکثر و بیشتر اپنی سادگی کی وجہ سے مات کھا جاتے ہیں اور دوسری جماعتوں کے دم چھلے بنے رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی سیاست ناقص ہوتی ہے، لیکن علماء میں کامل عقل وفراست رکھنے والے اور پولیٹیکل معاملات کو کما حقہ سمجھنے والے حضرات بھی بہت ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں۔ علماء کرام ذہنی شعور کے اعتبار سے تو بلاشبہ بہت آگے ہوتے ہیں لیکن جدید علوم وفنون اور رائج الوقت زبانوں سے نابلد ہونے کی وجہ سے اکثر ان کی تحقیر وتذلیل کی جاتی ہے۔ اسی لیے مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات بہت اونچے ہو گئے ہیں اور علماء بہت پستی میں چلے گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ علماء کو ذرا اونچا کیا جائے، تاکہ یہ دونوں گروہ مل کر انسانیت کی خدمت کر سکیں۔ اس لیے مولانا جدید سائنس اور انگلش زبان کی تحصیل پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ اپنے استاذ الاستاذ حضرت نانوتویؒ کی خواہش کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں۔ ہر فن کو اس کے موجودوں کی اصل زبان اور ان کی مقرر کردہ اصطلاحات میں ہی سیکھنا چاہیے۔ خواہ وہ انگریزی فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، جاپانی، روسی، چینی، ہندی اور عربی وغیرہ ہو۔ اپنی توجہ عربی ترجمہ پر مرکوز کرتے سے اس قدر فائدہ نہیں ہوگا جس قدر اس کی اصلی زبان سے حاصل ہوگا۔ بلاشبہ چار صدیوں سے جب سے کہ اقوام مغرب (یورپین اقوام) اور بعض ایشیا کی قومیں جس قدر اور جس تناسب سے ترقی کی طرف گامزن ہوئی ہیں اور انہوں نے صنعت وحرفت اور ٹیکنالوجی مین عروج حاصل کیا ہے اور غیر معمولی اکتشافات اور انکشافات کیے ہیں اور مختلف علوم وفنون بالخصوص فوجی اور عسکری علوم یا ملٹری ازم میں غیر معمولی فوقیت حاصل کی ہے اور جب سے ترکی خلافت کی ملٹری سائنس کمزور ہوئی ہے۔ مسلمان اپنے کسی ملک کا دفاع نہیں کر سکے اور ہر آنے والا دن

مسلمانوں کے لیے گزشتہ سے زیادہ ہولناک ثابت ہوا ہے۔ مسلمانوں میں بڑے بڑے اعاظم رجال اس دور میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن مسلمانوں نے ان کی قیادت کو قبول نہیں کیا۔ آج بھی مسلمان دوسری اقوام کے دستِ نگر اور محتاج ہیں۔ غلامی یا نیم غلامی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امامت و قیادت کا سلسلہ ان کے ہاتھ میں آج نہیں رہا۔ حالانکہ ہر قسم کے اسباب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں لیکن غلامی کی وجہ سے ذہن اور فکر اپنی نہیں دوسروں سے مانگی ہوئی چیزوں پر گزارہ کرتے ہیں اور اپنی فکر اور فلسفہ تقریباً کھو چکے ہیں۔ بالخصوص اجتماعیات میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ گو کہ انفرادی حالات میں آج بھی بہتر متدین، ثقہ اور متقی مسلمان موجود ہیں(3)۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے تحریک ولی اللّٰہی کو آگے بڑھایا اس لیے ضروری ہے کہ ولی اللّٰہی کی تحریک کا مطالعہ کیا جائے۔

ولی اللّٰہی سیاسی تحریک:

حضرت شاہ ولی اللہ ایک زبردست حکیم اور مفکر تھے۔ گو بظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لیے تھی۔ لیکن حقیقت میں وہ تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں۔ ان کی کتابیں اگر زیادہ غور سے پڑھی جائیں تو یہ محسوس ہوگا کہ وہ اپنی قوم کے ہر فرد کو انسانیتِ عامہ کی تعلیم دے رہے ہیں۔ جس زمانے میں وہ دہلی میں پیدا ہوئے، اسی وقت دہلی ایک بین الاقوامی سیاسی اور علمی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی کا اثر ہے کہ شاہ صاحب کے افکار اور ان کی تعلیمات میں اتنی ہمہ گیریت اور وسعت ہے اور ان کا روئے سخن ایک مخصوص گروہ یا جماعت تک محدود نہیں بلکہ وہ کل بنی نوع انسان کو اپنے دائرہ فکر میں سمیٹ لیتے ہیں۔ دہلی کے اس بین الاقوامی سیاسی اور علمی مرکز کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے عملاً وہی شاہ صاحب کے پیغام کے حامل ہو سکتے تھے لیکن شاہ صاحب کی تعلیمات کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے۔ ان کا زور مذہب کی ظاہری پر نہیں بلکہ مذہب کی حقیقی روح پر تھا۔ قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ قانون کی جان یعنی عدل و انصاف پر تھا۔ ممکن ہے مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور اس عہد کی دوسری چھوٹی چھوٹی تحریکیں اپنے محدود دائرہ میں ٹھیک ہوں۔ لیکن ان میں سے کسی تحریک میں بھی اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی۔ اور ان میں سے کوئی بھی تحریک انسانیتِ عامہ کی اتنی ترجمان نہ تھی، جتنی کہ شاہ ولی اللہ کی یہ تحریک ہے۔

ولی اللّٰہی فکر اس وقت صرف اسلامی سماج ہی میں بآور ہو سکتا تھا لیکن وقت یہ تھی کہ اس زمانے میں مرہٹے اسلامی سماج کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ چنانچہ ضرورت تھی کہ مرہٹوں کے زور کو توڑا جائے، شاہ صاحب کی برکت اور اشتراک سے پانی پت میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو زک دی۔ اور شمالی ہند کی فضا مسلمانوں کے لیے قدرے صاف ہوگئی۔

شاہ صاحب نے ۶۳ء/۱۷۷۱ھ میں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز جانشین ہوئے۔ آپ نے اپنے والد کی تعلیمات کے بلند افکار کو مروجہ علوم کے ضمن میں خاص و عام میں نشر فرمایا۔ اس طرح ولی اللّٰہی فکر سے قوم کے متوسط طبقے بھی آشنا ہو گئے۔ شاہ عبدالعزیز کا معمول یہ تھا کہ درس کے مخصوص حلقہ کے علاوہ عوام مسلمانوں کے لیے ہفتہ میں دو دن وعظ کرتے۔ ان کی تعلیم و ارشاد کا یہ سلسلہ تقریباً ۶۱ برس تک جاری رہا۔ اس طویل مدت میں خاص دہلی میں ہزارہا اشخاص ان سے فیض یاب ہوئے۔ نیز ان کے تربیت یافتہ افراد ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئے۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنی

جماعت کی باقاعدہ تنظیم بھی کی۔ چنانچہ آپ نے اپنے خاص تربیت یافتوں کی ایک جمعیت مرکز یہ بنائی۔ حسنِ اتفاق سے اس جمعیت کو سیّد احمد شہید جیسی صاحب عزم اور باا ثر شخصیت مل گئی۔ شاہ عبدالعزیز نے سیّد صاحب کی ذہنی، روحانی اور جنگی تربیت کی طرف خاص توجہ فرمائی (4)۔

شاہ ولی اللہ کو اپنے عہد میں مرہٹوں سے عہدہ برآ ہونا پڑا تھا۔ اور اس میں کابل کی طاقت نے بڑا کام دیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں سکھ پنجاب پر غالب ہو چکے تھے اور اس طرح انہوں نے دہلی اور کابل کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ چنانچہ اب اس کا کوئی امکان نہ رہا کہ دہلی کی اسلامی طاقت کو درۂ خیبر کی راہ سے کوئی مدد مل سکتی۔ عام طور پر اس وقت یہ ہوتا چلا آیا تھا کہ جب کبھی ہندوستان کی اسلامی طاقت کو زوال آتا، شمال سے مسلمانوں کی تازہ دم جماعتیں ان کی مدد کو آ پہنچتیں۔ اور ان کی وجہ سے اسلامی طاقت کو سنبھالا مل جاتا۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنی زندگی میں سید احمد شہید کی قیادت میں ایک ایسی جماعت بنائی۔ جو وقت آنے پر مسلمانوں کی جنگی سرگرمیوں کو چلا سکے۔ اس جماعت کے امیر سیّد احمد شہید تھے اور مولانا عبدالحی (شاہ عبدالعزیز کے داماد) اور شاہ اسمٰعیل (شاہ عبدالعزیز کے برادر زادہ) اس کے مشیر کار خصوصی تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے اس جماعت کو پہلی دفعہ ۱۸۱۵ء/ ۱۲۳۱ھ میں بیعتِ طریقت اور دوسری دفعہ ۱۸۲۰ء/ ۱۲۳۶ھ میں بیعتِ جہاد لینے کے لیے دورہ بھیجا۔ اس کے بعد سارے قافلہ کو حج پر جانے کا حکم دیا۔

جب یہ قافلہ حج سے واپس آیا تو شاہ عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے۔ اور مولانا محمد اسحاق ان کی جگہ ان کے جانشین مقرر ہو گئے تھے۔ اس کے چند سال بعد سید احمد شہید، مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل اپنی جماعت سمیت سرحد پہنچ گئے اور افغانی قبائل کی مدد سے انہوں نے سکھوں سے لڑائیاں شروع کر دیں۔ دہلی کے مرکز میں شاہ اسحاق رہے۔ ان کے ذریعہ مجاہدین کو روپیہ اور لشکر پہنچتا تھا۔ بدقسمتی سے جہاد کی یہ تحریک ناکام رہی۔ مولانا عبدالحی پہلے ہی انتقال فرما چکے تھے۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں سے لڑتے ہوئے ۱۸۳۱ء/ ۱۲۴۷ھ میں شہید ہوئے (5)۔

اس میں شک نہیں کہ اس حادثہ فاجعہ سے ولی اللہی تحریک کو بڑا صدمہ پہنچا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل کی شہادت اور مجاہدین کی ناکامی کا واقعہ کچھ کم المناک نہ تھا لیکن اس سلسلہ میں بڑی مصیبت یہ آ پڑی کہ سرحد اور ہندوستان کے عوام مسلمانوں کو اس تحریک سے بدظن کرنے کی بڑے زور سے کوششیں شروع ہو گئیں۔ انہیں وہابی مشہور کیا گیا اور وہابیت ہزار گمراہیوں اور برائیوں کا مرجع قرار دی گئی۔ دراصل اس سے مخالفوں کا مقصد یہ تھا کہ ولی اللہی تحریک جو عوام مسلمانوں کی تحریک تھی۔ اور شاہ عبدالعزیز کی علمی کوششوں اور سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل کے دوروں کی وجہ سے جو انہوں نے اطراف ملک میں کیے تھے، ہر دیار کے مسلمانوں کو اس تحریک سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی اور کچھ بعید نہ تھا کہ ولی اللہی تحریک عوام مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کا باعث بن جاتی۔ عوام مسلمانوں میں بدنام کر دیا جائے اور عجیب بات یہ ہے کہ بداندیشوں کی یہ کوششیں بہت حد تک کامیاب ہو گئیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا کہ شاہ ولی اللہ صاحب ایک حکیم و فلسفی تھے۔

عارف وصوفی تھے۔محدث تھے مجتہد تھے۔ایک سیاسی مفکر تھے۔ان کے حدیث کے کمال کو بعض شاگردوں نے اپنے لیے خاص کرلیا۔لیکن یہ لوگ فقہ حنفی کے خلاف نہ تھے۔اتفاق سے جب مجاہدین کی جماعت سرحد پہنچی تو ان کے ساتھ بعض ایسے افراد شریک ہو گئے جو فقہ حنفی کے قائل نہ تھے۔ان کی وجہ سے مجاہدین کی جماعت میں حنفی فقہ سے بُعد کا رجحان پیدا ہو گیا۔اس طرح سے مخالفوں کو موقع ہاتھ آ گیا کہ وہ مجاہدین کے خلاف عوام مسلمانوں کو ابھار سکیں۔آخر کار یہ ہوا کہ ولی اللٰہی تحریک جو خالص ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک تھی۔اور اسی مناسبت سے اس کے اصولوں میں بنیادی طور پر حنفی فقہ کی پابندی لازمی تھی، کیونکہ صدہا سال سے ہندوستان کے مسلمانوں میں حنفی فقہ کا رواج تھا اور یہ مسلک ان کے مزاج میں راسخ ہو چکا تھا۔نجد اور یمن کی ''وہابی'' تحریک کے اثر میں آ گئی۔آگے چل کر یہ تحریک اہل حدیث کے نام سے ہندوستان میں روشناس ہوئی۔اور یہ طبعی بات تھی کہ عوام مسلمانوں کو اس تحریک سے پہلے کی سی ہمدردی نہ ہوتی (6)۔

مجاہدین کی ناکامی کے بعد ولی اللٰہی جماعت میں عام مایوسی کی سی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ایک گروہ نے جو سید احمد شہید کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ امام اور مہدی ہیں۔اور ان کے ہاتھوں لابدی طور پر غلبۂ اسلام ہو کر رہے گا۔یہ باور کر لیا کہ وہ بالا کوٹ کے معرکہ میں شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ بدستور زندہ ہیں۔چنانچہ اس طرح یہ لوگ ایک موہوم امید پر اپنے دل کو ڈھارس دینے میں وقتی طور پر کامیاب ہو گئے۔دوسرے گروہ نے جو ولی اللٰہی تحریک کے دہلوی مرکز سے وابستہ تھا اور مولانا محمد اسحاق کی قیادت کو مانتا تھا۔اپنے لیے ایک نئی شاہراہِ عمل سوچی۔اس کو سمجھنے کے لیے اس وقت کے اسلامی ہند کی حالت کو مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے۔اس وقت ہندوستان کا اسلامی مرکز بالکل کمزور ہو چکا تھا۔افغانی قبائل کی مدد سے ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب کو دور کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی اس کے انجام کا پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔بنگال اور میسور کی اسلامی حکومتیں کبھی کی مٹ چکی تھیں۔قبیلے اپنا زور دکھا چکے تھے۔اودھ کی نوابی بھی ناپید ہو چکی تھی۔لے دے کے ایک حیدرآباد تھا اور وہ بالکل بے دست و پا تھا۔دہلی میں مغل سلطان شہنشاہ ہند کے نام سے یاد کیا جاتا تھا لیکن اس کی حکومت دہلی کے لال قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی۔اور اس گھریلو حکومت کو چلانے کے لیے بھی اسے انگریزوں کے وظیفہ کی طرف دیکھنا پڑتا تھا۔کابل سے بھی کسی امداد کی توقع نہ رہی تھی۔پٹھان آپس میں لڑ لڑ کر اتنے بے بس ہو چکے تھے کہ ان کے لیے سکھوں کو دریائے سندھ سے ادھر روکنا مشکل ہو گیا تھا۔اور سید احمد شہید کے باقی ماندہ مجاہدین ایسی بحثوں میں الجھ گئے تھے جن سے ملت کا انتشار اور بڑھ رہا تھا۔الغرض ہندوستانی مسلمانوں کے لیے امید کے سب دروازے بند ہو چکے تھے۔باہر سے کسی امداد کا امکان نہ تھا۔اور خود اس کے بل بوتے پر جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ انہوں نے کر کے دیکھ لیا تھا، ہاں ایک کونہ اور تھا جس سے شاہ محمد اسحاق کو امید کی شعاع نکلتی نظر آئی اور آخر ارادہ اس روشنی کی طرف چل دیے۔

واقعہ بالا کوٹ کے بعد گیارہ سال تک شاہ محمد اسحاق دہلی میں مقیم رہے۔۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ میں آپ نے اپنے بھائی محمد یعقوب اور دوسرے متبعین اور متوسلین سمیت ہندوستان سے ہجرت فرمائی اور حرم محترم میں آباد ہو گئے۔یہاں انہوں نے ترکی سلطنت سے اتصال پیدا کیا۔ترکی سلطنت سے ہندوستانی اسلامی تحریک کا یہ تعلق بالکل نئی بات تھی۔گو اس سے پہلے صدیوں سے

حجاز کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے تعلقات قائم تھے۔ لیکن یہ تعلقات محض حج کے مراسم تک محدود تھے۔ شاہ اسحاق نے دہلی کے مرکز کو غیر مامون پا کر اور دوسرے تمام گوشوں سے ناامید ہو کر مکہ معظمہ میں ولی اللٰہی تحریک کے لیے پناہ کی جگہ ڈھونڈی۔ کیونکہ اوّل تو یہاں کسی غیر مسلم حکومت کا اثر نہیں تھا۔ دوئم ہندوستانی مسلمان آسانی سے یہاں آ جا سکتے تھے۔ پھر مکہ معظمہ میں رہتے ہوئے ترکی سلطنت سے ربط ضبط قائم کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کی وجہ سے ولی اللٰہی تحریک پر وہابیت اور حنفی مذہب کے خلاف ہونے کے جو الزامات لگائے جاتے تھے، وہ ناکام رہیں گے کیونکہ خود ترکی سلطنت کا مذہب حنفی تھا۔

یہ ابتداء ہے اسلامی ہند کی والٰلہی تحریک اور دولتِ عثمانیہ کے تعلقات کی۔ شاہ محمد اسحاق اپنے بعد شاہ عبدالغنی اور شاہ احمد سعید کو دہلی میں اپنا نمائندہ مقرر کر گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ میں غدر کا حادثہ ہوا تو ان دونوں نے اس میں شرکت کی اور شکست کے بعد یہ بھی مدینہ منورہ چلے گئے۔ حاجی امداد اللہ، مولانا محمد قاسم مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب، یہ سب بزرگ بھی اس ہنگامہ میں شریک ہوئے۔ حاجی صاحب تو نقلِ وطن کر کے حجاز چلے گئے اور مستقل طور پر انہوں نے مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کر لی۔

ہنگامہ غدر کے فرو ہونے کے بعد ولی اللٰہی تحریک ارباب حل و عقد حجاز میں جمع ہوئے اور یہ تجویز کی گئی کہ ہندوستان میں از سرِ نو شاہ عبدالعزیز کے نمونے کا کوئی مدرسہ قائم کیا جائے جو والٰلہی تحریک کا مرکز بن سکے چنانچہ سقوطِ دہلی کے نو برس بعد ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں دہلی کے قرب میں دیوبند کے مقام پر مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس مدرسہ کا بنیادی خیال حاجی امداد اللہ نے مکہ معظمہ میں سوچا تھا۔ اور مولانا محمد قاسم سات سال مسلسل اس کوشش میں رہے کہ اپنے استاد اور مرشد کے خیال کو عمل میں لائیں۔ مدرسہ دیوبند کا نصابِ تعلیم، نظامِ عمل اور اساسی قواعد مولانا محمد قاسم نے مرتب کیے اور اس طرح انہوں نے شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ اور ولی اللٰہی تحریک کے مقاصد کو دیوبند نظام میں محفوظ کر دیا(7)۔

''دیوبندی نظام کی تشریح کرتے ہوئے مولانا عبید اللہ لکھتے ہیں جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرانا چاہتے ہیں۔ وہ اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے جو مولانا محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاذ اساتذہ الہند مولانا مملوک علی صدر مدرس دہلی کالج کے لیے مخصوص رہی۔ ان کے بعد مولانا اسحاق نے مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ اس جماعت کی مرکزی قوت (غدر کے بعد) دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور دہلی کے عوض دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سید احمد خاں نے دہلی کالج کس انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔ سر سید اور مولانا محمد قاسم دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورے اشتراک کے بغیر اپنا کام شروع ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے برٹش گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنا لیا۔ مگر دیوبندی جماعت نے جو مولانا اسحاق کے زمانہ سے دولتِ عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مان چکی تھی، اضطراری حالت کے سوا حکومت سے کامل غیر جانبداری کو اپنا مسلک بنایا۔ لیکن یہ غیر جانب داری بھی اس وقت قطعاً ختم سمجھی جائے گی، جب دولتِ عثمانیہ اور دولتِ برطانیہ میں لڑائی ٹھن جائے۔

حسن اتفاق سے دیو بندی نظام کو بڑا فروغ نصیب ہوا۔ اور ہزاروں کی تعداد میں مدرسہ دیو بند کے فارغ التحصیل علماء اطراف ہند میں پھیل گئے۔ اس کے علاوہ افغانستان، ترکستان اور حجاز و قازان تک دیو بندی سلسلہ کا فیض جا پہنچا۔ مدرسہ دیو بند کی تاریخ کا پہلا دور جو مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات مطابق ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ پر ختم ہوتا ہے، صرف علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت کے لیے مخصوص رہا۔ ان کے بعد مولانا شیخ الہند محمود حسن نے دیو بندی علماء کو ایک اجتماعی طاقت کی حیثیت سے منظم کرنا شروع کیا۔ اور اس ضمن میں آپ نے کالج پارٹی کے انقلابی عنصر کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔ مولانا شیخ الہند نے ایک طرف عربی پڑھے ہوئے دیو بندی علماء کو ایک نظام میں جمع کیا۔ تو دوسری طرف مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور انگریزی کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں سے تعلقات پیدا کیے۔ انہوں نے کوشش کی کہ دیو بند اور کالج پارٹی کے حریت پسند افراد باہم مل کر کام کریں۔ برسوں سے اسلامی ہند میں علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ گروہوں میں جو تفرقہ چلا آتا تھا وہ ختم ہو جائے۔ اور ملت اسلامیہ منظم ہو کر ایک قیادت کے ماتحت آزادی اسلام اور آزادی وطن کی طرف قدم بڑھائے۔

مولانا شیخ الہند کی یہ کوششیں جاری تھیں کہ ۱۹۱۴ء/۱۳۳۳ھ کی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اور انگریزوں کی طرف سے دولتِ عثمانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔ طبعاً شیخ الہند کی جماعت نے انگریزوں کے خلاف ترکوں کی مدد کی۔

اس سلسلے میں ان کو ان کی جماعت کو سخت مصائب کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اور دولتِ عثمانیہ کی شکست کے بعد ولی اللہی تحریک کا یہ رجحان کہ عالمِ اسلامی کی مدد کرے یا ان سے مدد لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی وجود کو تقویت دی جائے، ناقابل ہو گیا۔ چنانچہ اس جماعت کو مجبوراً اپنا مسلک بدلنا پڑا۔ اور اس کو اسی میں مصلحت نظر آئی کہ اب جبکہ کوئی بین الاقوامی اسلامی مرکز نہیں رہا۔ اس لیے ہندوستان کی آزادی خواہ غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ سیاسی تعاون کیا جائے۔ اور ان کے ساتھ مل کر ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد ہو۔ اس خیال کے تحت مولانا محمود حسن نے اپنی جماعت کو کانگریس میں شرکت کی اجازت دی۔ یہ ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ کا واقعہ ہے۔ اور یہاں سے اسلامی ہند کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے (8)۔

ولی اللہی تحریک کا آغاز کار سے اب تک جن ادوار سے گزر چکی ہے، بے محل نہ ہو گا۔ اگر مولانا عبید اللہ کے الفاظ میں ان کو یہاں دہرا دیا جائے۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۵ مئی ۱۷۳۱ء/۱۱۴۴ھ کو ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکیم الہند نے اپنے نصب العین معین کیا۔ اپنے پروگرام کی تدوین کی۔ جمعیت مرکزیہ بنائی۔ اور اس کی شاخیں ملک میں قائم کی گئیں۔

یہ تحریک ولی اللہی کا پہلا دور ہے۔ اس میں تین امام ظاہر ہوئے۔ اور ایک حکومت موقتہ Provisional Government قائم ہوئی۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ امام ولی اللہ ۱۷۳۱ء/۱۱۴۴ھ تا ۱۷۶۳ء/۱۱۷۷ھ۔

۲۔ امام عبد العزیز ۱۷۶۳ء/۱۱۷۷ھ تا ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ۔

۳۔ امام محمد اسحاق ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ تا ۱۸۴۶ء/۱۲۶۲ھ۔

موقت حکومت کے امیر شہید سید احمد ۱۸۲۴ء/۱۲۴۰ھ تا ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ۔

اس تحریک کا دوسرا دور امام محمد اسحٰق نے ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ سے شروع کیا۔ آپ ۱۸۴۱ء/۱۲۵۷ھ تک دہلی میں رہے۔ اور ۱۸۴۶ء/۱۲۶۲ھ تک مکہ معظمہ میں۔ دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی تھے۔ ان کے بعد الامیر امداد اللہ نائب بنے۔ وہ بارہ برس یعنی ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ تک دہلی میں رہے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔

ان کے پہلے نائب مولانا محمد قاسم ۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ تک پھر مولانا رشید احمد ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ تک اور شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ تک۔

اس سال تحریک مذکور کا دوسرا دور ختم ہوا۔

تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے ۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا(9)۔

فصل دوم:

مولانا عبیداللہ سندھی کے انقلاب کے بنیادی اصول

اسلام نظام فطرت ہے:

حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ "تقریباً ایک سو سال سے جب تو امیس طبعیہ کا انکشاف ہوئے ہیں اور آلات کا اختراع ہوا ہے اور وسیع پیمانے پر فیکٹریاں اور کارخانے قائم ہوئے ہیں، تو تمام ممالک میں تغیر عظیم واقع ہوا ہے۔تمام گھریلو نظام اور فیملیوں کے تمام نظام بگڑ کر رہ گئے ہیں۔اور یہ بگاڑ مردوں اور عورتوں کی فطرت کے اعتبار سے ہوا ہے اور سرمایہ دار جو کارخانوں اور فیکٹریوں اور آلات کے مالک ہیں۔ان کی نظر صرف مال کمانے میں ہوتی ہے۔وہ اس کی رعایت نہیں کرتے کہ ضعفایا اقرباء کی فطرت کا کیا تقاضا ہے اور نہ ان سرمایہ داروں میں مظلوموں پر رحمت اور شفقت ہوتی ہے، انہوں نے لوگوں کو دبا رکھا ہے اور اجتماعی نظام کلیۃً تبدیل کر دیا ہے اور یہ انقلاب جس کو تم مغرب (یورپ) میں دیکھتے ہو۔یہ وبائی بیماری کی طرح پھیل رہا ہے اور یہ تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔یہ تمام ممالک میں پھیل جائے گا اور تمام لوگ اس کی زد میں آئیں گے اور پھر اس کے بعد لوگ فطرت کی طرف لوٹیں گے اور اشتراکی نظام جو کہ سرمایہ داری کے سرکش نظام کے مظالم کے قلع قمع کے لیے قائم ہوا ہے اور یہ سرمایہ داری کے نظام کا تعاقب کرے گا۔آخر کار یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا اور لوگ اس اشتراکیت کی کامیابی اور سرمایہ داری کی پامالی کے بعد فطرت اور اس کے قانون کی طرف لوٹیں گے اور یہ ہمارا خیال ہے اور ہم مایوس نہیں اس بات سے کہ قرآن کے قانون کی طرف پلٹ کر اس کو اپنائیں گے۔یہ مردوں اور عورتوں کی فطرت وبائی مرض کی وجہ اور عارضی فساد سے دبی ہوتی ہے۔قرآن کی اجتماعیت کو توڑ نہیں سکتے، بلکہ سرمایہ داروں نے جن چیزوں کو ظاہر کیا ہے۔یہ اس کا ابطال ہے۔اگرچہ اس کا ابطال بھی آسان نہیں، بلکہ اس سے ان پر ایک قسم کی قیامت برپا ہوگی۔جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ کسریٰ وقیصر جو کہ سرمایہ داری نظام کے حامل تھے اور تمام دنیا پر چھائے ہوئے تھے (10)۔قرآن کریم نے اپنے انقلاب کے ذریعے ان پر قیامت برپا کی، ایران و روم یا عراق و شام اس انقلاب سے مغلوب ہو کر ختم ہو گئے۔اور قرآن کی برپا کردہ اجتماعیت ان تمام بلدان و ممالک میں کسی نہ کسی رنگ میں تقریباً ایک ہزار سال تک قائم رہی۔پھر انحطاط شروع ہو گیا اور نظام سرمایہ داری چھا گیا۔موجودہ دور میں سرمایہ داروں نے تمام معاملات کو خراب کر رکھا ہے۔ان کے مظالم ختم کرنے کے لیے ان پر بھی قیامت برپا ہوگی اور شہر و ممالک اس کی نجاست سے پاک کیے جائیں گے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کی ہی اجتماعیت غالب آئے گی لیکن اس تعبیر و تفسیر کے ساتھ جس کو امام ولی اللہ دہلویؒ نے پیش کیا ہے۔اور اشتراکیوں نے ہمارے سامنے اعتراض کیا کہ جس قسم کی اجتماعیت کے بارے میں تم کہتے ہو کہ قرآن کی اجتماعیت ہے۔یہ اگر کہیں قائم ہو تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے اور ہر قسم کے انقلاب سے راحت پا جائیں گے (مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں) اگر مسلمان اشتراکیوں کی تلوار کی زد سے بچنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کے ساتھ تمسک کرنا چاہیے۔اس تفسیر کے مطابق جو امام ولی اللہؒ نے کی ہے اور مسلمان اس وہم سے باہر نکل جائیں

کہ فطرت کا حکم بدل سکتا ہے"(11)۔

میرے ابتدائی مطالعہ سے یقین تھا کہ سب مسلمان ہندوستانی ہیں۔ان کو بیرونی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اور جو بزرگ فاتحانہ طور پر ہندوستان داخل ہوئے، وہ بھی یہیں کے ہو کر رہ گئے اور جو خاندان اس نئے مذہب اور اسلامی تمدن کو قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ان کی اولاد اوّل درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندو قوم کا نومسلم اور اسلامی فاتحین کی اولاد میں فرق کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں کو بہت جلد اس غلط فہمی سے پاک ہو جانا چاہیے۔میرا الیقین ہے کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لیے کوئی مذہب، کوئی فلسفہ، کوئی تمدن اور کوئی قانون میسر نہیں آ سکتا۔ اس لیے ہندوستانیوں کو اسے عزت سے مان لینا چاہیے، لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکتا، تو ہم تو مسلم کیا ایسے بھی گئے گزرے ہو گئے ہیں کہ اپنی ابادی کے تناسب سے اپنے مذہب کی عزت تا ما م ہندو بھائیوں سے نہ منوالیں۔ ایک ہندوستانی ہندو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ بہادر اور زیادہ شریف و باعزت تصور کرتا ہے"(12)۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا انقلابی طریقہ کار

وحدت: (Unity)

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تمام زندگی اسلام اور انسانیت کے کاز (Cause) کے لیے وقف کر دی۔ مولانا نے انسانی وحدت پر زور دیا۔ جبکہ ہم مغربی طرزِ زندگی کو دیکھتے ہیں۔اس کی بنیاد ترک مذہب اور بے مہار طلب آزادی پر ہے۔ایسا لگتا ہے کہ مغربی طرزِ زندگی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہو چکا ہے۔ علامہ اقبال کی فکر اس مسئلہ میں شاید سب سے بلند ہے اور واضح بھی۔ ۱۹۳۸ء میں نوروز کے موقع پر لاہور ریڈیو سے ایک تقریر میں فرمایا انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کر دیں۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے۔اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان رنگ اور مقام سے بالاتر ہے(13)۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے تاریخ کے ایک اہم عمل کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی یہ عمل بنی نوع انسان کے لیے زہر قاتل ہے۔ کیونکہ یہ انسانی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ ایک قوم، ایک مذہب اختیار کرتی ہے۔ ابتداء میں یہ خالص حالت میں ہوتا ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثقافت، روایات، زبان اور دیگر طور طریقے اور رسوم و رواج اس کی شکل تبدیل کر دیتے ہیں۔اور یہ ایک مغربی مذہب بن جاتا ہے۔اور اس آفاقیت نظر نہیں آتی۔ پھر اس قوم کا اصرار ہوتا ہے کہ اس کا یہ قومی مذہب ہی دراصل پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہے۔ باقی مذاہب درست نہیں۔لیکن یہ داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ قومی مذہب آگے جا کر گروہی اور فرقہ ورانہ مذہب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح وحدت انسانیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔قرآن کریم نے اس صورتِ حال سے لوگوں کو آگاہ کر دیا۔ توحید کو سب سے اہمیت دے کر انسانوں کو وحدت اور شیرازہ بندی کی طرف بلایا(14)۔

سندھی کا نظریہ توحید:

جس طرح خدا کا قانون (تکوینی قانون) تمام کائنات میں جاری ہے اور کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔ ایسے ہی اس کا قانون۔قرآن حکیم۔ انسانی سوسائٹی (معاشرے) میں جاری کیا جائے اور تمام مصنوعی خداؤں کی خدائی ختم کر دی جائے اور بندگی (عبادت) صرف ایک خدا کی کی جائے، یعنی انسان جو کچھ کرے اور جو کچھ سوچے اس سب میں یہ سمجھے کہ مجھے خدا کے سامنے جواب دینا ہے، اس میں لوگوں کے دکھاوے یا کسی حاکم کے فیصلے کو کوئی دخل نہیں۔ یہ فیصلہ ہر ایک انسان کو خود اپنے دل کے اندر کرنا ہوگا۔ جب تک انسان کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ میرا یہ کام خدا کے سامنے پیش ہوگا تو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس وقت تک وہ اس کام کو اچھا نہ سمجھے، یہ ہے خدا کی بندگی۔ اس طرح جوابدہ سمجھنے کا یہ فائدہ ہوگا کہ وہ اپنی ساری نوع کی یکساں خدمت کر سکے گا، کیونکہ وہ اصل میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی اس تجلی کے حوالے کر دے گا، جو انسانیت کے قلب پر پڑتی ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا، تو اسے نوع انسانی کی ہمدردی اور خدمت کرنی ہوگی (15)۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا نظریہ توحید:

سو بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی تو کیفیت یہ ہے کہ خیر سے مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے، ہوش سنبھالا تو اردگرد سب کو ایک طرح زندگی گزارتے اور ایک طرح سوچتے دیکھا، بڑے ہوئے تو دیکھا دیکھی باپ داداؤں کی روش پر چلنے لگے۔ آبائی علم پڑھا، بڑے بوڑھے کی عادتیں سیکھیں۔ خاندانی حالات سازگار ہوئے تو ساری زندگی ایک ہی ڈھرّے پر گزار دی۔ اور کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اپنے خیالات اور عقائد و اعمال پر جرح کریں۔ اتفاق سے اگر کسی میں علم اور مطالعہ نے مذہبی جستجو کا شوق پیدا کیا تو اس نے اپنے خاندانی عقائد و اعمال میں کرید شروع کر دی اس کے بعد اکثر ایسا ہوا کہ وہ بحث و تحقیق میں تھوڑی دور پیچھے جا کر کسی عالم اور بزرگ کی تاریخی عظمت سے مطمئن ہو گئے اور ان کو اپنے افکار و خیالات میں اپنے خاندان سے باہر جانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی لیکن اگر حوصلہ بلند ہوا اور ذہن کی کاوش نے زیادہ بے چین کیا تو فقہی تقلید کی جکڑ بندیوں سے نکل کر اہل حدیث میں جا ملے اور ہمت کی تو فقہ اور حدیث دونوں سے دامن چھڑا لیا اور قرآن کو اپنا مدار مان کر دل کو تسکین دے لی، بیشک ان حضرات کے علم اور مطالعہ کی ہمارے دلوں میں کچھ کم قدر نہیں، لیکن معاف فرمایا جائے اگر ہم یہ عرض کریں کہ انکی اس قبیل کی تحقیق اور تدقیق اکثر تقلیدی ہوتی ہے۔ ان کو آباؤ اجداد سے جو نظر ورثہ میں ملی تھی انہوں نے اسی نظر سے اپنے گردو پیش کی دنیا کو دیکھا۔ اسی نظر سے اپنی تاریخ کا مطالعہ کیا اور اپنے علوم و فنون کو بھی انہوں نے اسی نظر سے پڑھا۔ غرض کہ ان کی یہ ساری تگ و دو اور کاوش و جستجو اپنی محدود دنیا میں محصور رہی، یہ صحیح ہے کہ اس محدود نظر کے ساتھ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعہ سے جو نتائج برآمد ہوں گے ان کی حیثیت بالکل جدا ہوگی اس شخص کی بحث و تحقیق کے نتائج سے، جس کے ذہن میں سب سے پہلے اسلام کا تصور آیا ہو تو اس شکل میں کہ اگر اسلام کے پیش کردہ ''اللہ'' کو مانتے ہو تو سب سے پہلے ''الٰہ'' کا انکار کرو چنانچہ جب اس نے اسلام کا کلمہ شہادت پڑھا ہو تو وہ واقعتہً ''الٰہ'' کا انکار کر چکا ہو اور پھر اس کے بعد اپنی تمام زندگی میں ''لا اللہ'' کی راہ میں

جہاں بھی اس نے کسی ''الٰہ'' کو حائل پایا تو وہ ''الٰہ'' کو ترک کرنے کے بعد اللہ کی طرف بڑھا۔ظاہر ہے ''لا الٰہ الاّ اللہ'' کے یہ معنی جو مولانا سمجھے تھے ان لوگوں کے تصور توحید سے کتنے مختلف ہوں گے ۔جنہیں اپنی زندگی میں کبھی کسی ''الٰہ'' کو ترک کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔کلمہ توحید کے بارے میں مولانا فرمایا کرتے تھے کہ: ''میرے نزدیک تو اقرار باللبہ سے پہلے غیر اللہ کا انکار لازمی ہے اور اسی غیر اللہ کے انکار کی عملی جدو جہد کو میں جہاد کہتا ہوں'' (16)۔

چنانچہ مولانا مسلمان ہوئے تو اسلام کا یہ مفہوم سمجھ کر مسلمان ہوئے کہ وہ عقیدے میں توحید خالص اور عمل میں جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ توحید اور اس طرح کا جہاد مولانا کے نزدیک یہ دو اساس تھے اسلام کی تعلیمات کے ،اور اسی اسلام کی کشش تھی جس نے بچپن میں ان سے گھر بار چھڑایا تھا اور اسی اسلام کو خارج میں متمکن اور حاکم بنانے میں انہوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔ ورنہ خدانخواستہ اگر معاملہ دوسرا ہوتا اور بعض علمائے کرام جس قسم کے اسلام کو آج اپنے لیے سرمایہ افتخار بنائے ہوئے ہیں۔مولانا کو بھی اسی اسلام کی دعوت ملتی تو شاید وہ بھی بغداد کے اس یہودی کی طرح جس کو حضرت جنیدؒ کے زمانے میں اس قسم کی دعوت دینے والوں نے مسلمان ہونے کو کہا تھا۔یہی جواب دیتے کہ معاف فرمائیے۔آپ حضرات سے تو میں غیر مسلم اچھا ہوں۔

مولانا کے ان معترضین کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس اتفاق یا سوء اتفاق سے مولانا کے حالات کچھ ایسے تھے کہ موصوف نے کتاب وسنت کو اپنے مخصوص خاندانی نقطہ نظر سے نہیں دیکھا اور پھر وہ بزرگوں کی تقلید میں مسلمان نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے خود تحقیق کی اور جب اسلام کو اپنے آبائی دین سے بہتر پایا تو مسلمان ہوئے اس کے بعد واقعات ایسے پیش آئے کہ ان کا مطالعہ صرف اپنی تاریخ اور خاص اپنے علوم تک محدود نہ رہا اور مزید اتفاق یہ ہوا کہ ان کو زندگی میں ایسے حالات سے سابقہ پڑا جن کی وجہ سے انہیں کئی ملکوں ،کئی قوموں اور کئی مذاہب کی تاریخ اور ان کے ماضی وحال کے نشیب وفراز کو بامعان نظر دیکھنا پڑا۔ جب صورت یہ ہو کہ دماغ میں توحید کا عقیدہ اور دل میں جہاد کا جذبہ ہو اور نظر وفکر میں آفاق بینی اور آفاق گیری کے تجربات سمائے ہوئے ہوں اور پھر اپنی پوری زندگی سرتا پہ عمل، بےلوث اور بے ریا، مال ودولت سے بے نیاز، اور ہر رشتہ وپیوند سے آزاد رہی ہو تو جو شخص ان باطنی کیفیات کے ساتھ کتاب وسنت اور ولی اللٰہی علوم ومعارف میں غوطہ زن ہوگا تو ظاہر ہے وہ ان میں کچھ پائے گا۔اس سے ان اہل علم کا یہ طبقہ اگر مولانا پر خفا ہے اور ان کے افکار وتعلیمات کو اسلام کے خلاف قرار دیتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو اسلام واقعی اسی شکل میں نظر آتا ہو،لیکن انصاف شرط ہے کہ اس معاملہ میں مولانا کا کیا قصور ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا کتاب وسنت کے نام سے جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل اور دماغ پر کتاب وسنت کے مطالعہ سے واقعتاً یہی کیفیات گزری ہیں۔اور شاہ ولی اللہ کی انقلابی حکمت کا جب وہ نام لیتے ہیں تو سچ یہ ہے کہ انہوں نے اس حکومت کو اسی طرح سمجھا ہے (17)۔

مولانا کے نزدیک توحید کا عقیدہ زندگی کی ایک زندہ اور فعال قوت تھی۔مولانا نے توحید کو مانا تو غیر اللہ کے خلاف معرکہ آرا ہونا ضروری سمجھا۔مولانا کی نظر میں توحید فکر وعمل کے لیے انقلاب کا حکم رکھتی تھی۔اسی بناء پر مولانا اسلام کی ساری تاریخ میں عقیدہ توحید کا بہترین عملی مظہر رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہؓ کے مبارک زمانے کو سمجھتے ہیں، جس میں عمار یاسرؓ اور بلالؓ جیسے غلام

مصعبؓ وسعدؓ وسعیدؓ جیسے نوجوان اور ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ جیسے حسب نسب والے حضرت رسالتمآب علیہ الصلوۃ والسلام سے توحید کا سبق پڑھ کر اپنے سرکش اور ظالم آقاؤں کو کچلتے، اپنے مشفق ومہربان ماں باپ کو خیر باد کہتے اور اپنے عزیز واقارب کو قتل کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اسی عقیدہ توحید کا اعجاز تھا کہ انہوں نے پرانے فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی اور اپنے فکر وعمل سے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مولانا قرآن مجید کی آیات جہاد کو بدر واحد خندق کے معرکوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ آپ کے کی ومدنی دور کو سامنے رکھ کر قرآن کے احکام وقواعد کو سمجھنے کی کوشش فرماتے ہیں اور اسی مبارک عہد کا نقشہ اپنے دل ودماغ میں تازہ کر کے کتاب وسنت سے ہدایت طلب کرتے ہیں۔ جب مسلمانوں کی زندگی سرتاپا انقلاب تھی۔ ''جاء الحق وزھق الباطل'' کا نعرہ ان کی زبانوں پر تھا اور ان کے ہاتھوں سے قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں پاش پاش ہو رہی تھیں۔ یہ انقلابی زمانہ صحابہ کی یہ انقلابی سیرتیں اور ان کا یہ انقلابی کردار، مولانا کے نزدیک قرآن کی دعوت کا یہ ایک نمونہ تھا جو اسلام کے قرون اوّل میں متشکل ہوا اور ہر زمانے میں اسی انقلاب کو بار بار بروئے کار لانا قرآن کے ماننے والوں کا فرض ہے (18)۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور کے مطالعہ نے برعظیم ہند کے مسلمانوں کی اس دور کی دو بڑی شخصیتوں پر ایک ہی اثر ڈالا، علامہ اقبال مرحوم نے ''جاوید نامہ'' میں سید جمال الدین افغانی کی زبان سے ملت روسیہ کے نام جو پیغام دیا ہے اسے پڑھئے اور پھر مولانا کے ان افکار وخیالات کا مطالعہ کیجئے، یہ دونوں کے دونوں بزرگ اسی بات پر متفق ہیں کہ:

اسلام ایک عالمگیر انقلاب کا پیغام لے کر آیا تھا، اور لا قیصر وکسریٰ'' کو اس نے ابتدائی زمانے میں محقق بھی کر دیا (19)۔

قرآنی فکر کی اہمیت:

قرآن مجید کے برحق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایسی تعلیم دیتا ہے جو سب انسانوں کے فطری رجحانات کی آئینہ دار اور ساری نوع انسانی کے فائدہ کے لیے ہے۔ لیکن اگر قرآن کو ایک فرقہ یا گروہ کی کتاب بنا دیا جائے تو پھر یہ ثابت کرنا کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور اس کی تعلیمات سب کے لیے ہیں اور ہر زمانہ کے لیے ہیں، بڑا مشکل ہے۔ قرآن کی عالمگیریت محض اس بنا پر ہے کہ وہ کل انسانیت کی کتاب ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن کے بعض طالب علم جنہیں میں محض طالب علم کہوں گا، قرآن کے عالم نہ کہوں گا، قرآن کے الفاظ کے معنی کر کے سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مفہوم ہے قرآن کا۔ اور اسی مفہوم کے مطابق وہ قرآن کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوسرے مذاہب اور فلسفیانہ تصورات والوں کے سامنے جب قرآن کے اپنے اس مفہوم کو پیش کرتے ہیں تو انہیں مطلق اپنی بات سمجھا نہیں سکتے۔ اب ایک طرف تو ان کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم عالمگیر اور ہمہ گیر ہے اور دوسری طرف ان کی قرآن فہمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص گروہ کے سوا کسی غیر مذہب والے صاحب عقل اور لا مذہبی سوچنے والے معقول آدمی پر اپنا مفہوم واضح نہیں کر سکتے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں ان لوگوں سے کہوں گا کہ آپ نے قرآن کا مفہوم صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ یہ مفہوم جسے آپ قرآن کا لُب لباب کہتے ہیں، آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا اپنے خاص گروہ

توتولی کا نظریہ۔

مولانا کا ارشاد ہے کہ میں قرآن کو اس طرح نہیں سمجھتا۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی ترقی کے لیے ہر دور میں اچھے لوگ آتے رہے۔ ان حق شناس بندوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے اپنے وقت میں تعلیمات الٰہی کی تبلیغ کی اور اس طرح انسانیت کا قافلہ منزل بمنزل آگے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ عہد ماضی کے یہ روشن نقوش انسانی تاریخ کے صفحات پر کم وبیش کچھ رد و بدل کے ساتھ ثبت ہیں۔ قرآن کے عالم کو چاہیے کہ وہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم کرے کہ انسانی ترقی کے عام اور غیر متبدل قوانین کون سے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن میں تفحص کرے۔ وہ دیکھے گا کہ قرآن انہی عالمگیر اور ناقابل تغیر اصول حیات کو پیش کرتا ہے۔ یہ قرآن کا صحیح مفہوم ہے اور یہی چیز ہے جو ازل سے ابد تک قائم رہے گی۔ اور اسی کے ماننے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے۔

اسی سلسلہ میں مولانا نے ایک دفعہ قرآنی حکومت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''جو زمانہ گزر گیا۔ وہ پھر واپس نہیں آیا کرتا۔ جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کر کے خلافتِ راشدہ کے دورِ اوّل میں صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہ ویسی حکومت نہیں بن سکتی۔ جو لوگ قرآن کو اس طرح سمجھتے ہیں وہ حکمتِ قرآنی کے صحیح مفہوم کو نہیں جانتے۔ بے شک خلافتِ راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت کا ایک نمونہ ہے۔ لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس کے مبادی اور اصولوں پر قرآنی حکومتوں کے نئے نظام بن سکتے ہیں (20)۔

قرآن کا مقصود اصلی انسانیت عامہ کا تزکیہ اور اس کا ارتقاء ہے۔ وہ تمام انسانیت کو اس کے بنیادی اصول و مقاصد کی طرف لوٹانے آیا تھا۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ سب انسان ایک ہیں۔ رنگ و نسل اور قوم کا فرق حقیقی نہیں۔ دھڑے بندیوں اور گروہ بنانے کی طبقہ وارانہ ذہنیت غلط ہے۔ قرآن نے زندگی کی یہی عالمگیر اور ناقابلِ تغیر اصول پیش کیے ہیں۔ ان کو اگر غور سے سمجھ لیا جائے تو ذہن وحدتِ انسانیت کی صحیح رُوح کو پا لیتا ہے۔

اسی بنا پر قرآن نے اپنے عہد میں قیصریت اور کسرویت کو جو اس وقت استحصال بالجبر کا بدترین مظہر تھے، ختم کرنے کی دعوت دی اور اس کی جگہ ایسا نظام قائم کیا جس میں انسانی مساوات، ہر ایک سے انصاف اور اخوت بنیادی اصول تھے۔ قرآن کی تمام تعلیمات کا دارومدار مولانا کے خیال میں انہی اعمال صالحات پر ہے اور چونکہ جب تک اعلیٰ اور بلند نصب العین انسان کے سامنے متعین نہ ہو اس سے اعمال صالحات کا ظہور ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے قرآن نے بار بار ایمان باللہ پر زور دیا ہے۔ یعنی ایمان باللہ نصب العین ہے اور انسانیت عامہ کی فلاح و بہبود اس نصب العین کو عمل میں لانے کا ذریعہ اور طریق۔ اگر نظر بصیرت سے دیکھا جائے تو ایمان باللہ کا عقیدہ انسانیت کے لیے ایک بلند اور اعلیٰ نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے اور اس دنیا میں اس سے ارفع تصور ممکن نہیں۔ اللہ کے تصور میں وحدتِ انسانیت اور وحدت کائنات سب آ جاتے ہیں اور ذہن کے سامنے لامحدود آفاق اور بے کنارہ وسعتیں واشگاف ہو جاتی ہیں۔ اللہ کا صحیح تصور سب پہنائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور کوئی بلندی اور وسعت نہیں جو اس تصور سے بلند تر اور وسیع تر سوچی جا سکے (21)۔

سندھی کا نظریہ جہاد:

اکثر حق کے لیے جہاد کرنے میں اپنوں سے بھی لڑنا پڑتا ہے اور بسا اوقات تو کشت وخون تک نوبت پہنچتی ہے لیکن یہ کشت وخون انسان دوستی کے منافی نہیں ہوتا۔ سری کرشن جی نے رکشیتر کے میدان میں ارجن کو اسی بات کی تلقین کی تھی اور جنگ بدر میں رسول اکرم ﷺ کے صحابہ اسی یقین میں سرشار ہو کر اپنے باپوں، بھائیوں، بیٹوں اور عزیزوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ بہر حال اگر کشت وخون کا مقصد اپنی، اپنے گروہ اور اپنی قوم کی پچ ہے تو یہ کشت وخون مردود ہے اور اسی کو اسلام نے عصبیت کہا ہے۔ اور عصبیت کے لیے لڑنا اس نے کفر قرار دیا ہے لیکن اگر انسانیت عامہ کے مفاد کی خاطر دل میں خلوص رکھتے ہوئے کوئی لڑتا ہے تو وہ اشرف ترین فعل کرتا ہے یعنی شکست وریخت کا یہ عمل خالص حق کے لیے ہونا چاہیے اور اگر اس میں شخصی اور جماعتی اغراض کا میل ہو گیا تو پھر یہ حق، حق نہ رہے گا بلکہ ناحق ہو جائے گا۔ عملِ حق اور عملِ ناحق میں فرق بیان کرتے ہوئے مولانا رومؒ نے مثنوی میں ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ایک لڑائی میں حضرت علیؓ ایک کافر کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر چڑھ گئے۔ آپ اپنا خنجر کافر کی گردن میں پیوست کرنے کو تھے کہ اس کافر نے آپؓ کے چہرے پر تھوک دیا۔ اس کا تھوکنا تھا کہ آپؓ اس کے سینے سے اُتر آئے۔ کافر نے متعجب ہو کر وجہ پوچھی تو ارشاد فرمایا کہ جب میں تمھارے سینہ پر چڑھ کر خنجر مارنے والا تھا تو میرے دل میں تم سے کوئی ذاتی کد نہ تھی لیکن تمھارے تھوکنے پر مجھے تم پر غصہ آ گیا اور میرے خلوص میں ذاتی غرض کی ملاوٹ ہو گئی۔

یہی قرآن کا ''ایمان باللہ'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے، ایک عقیدہ ہے اور دوسرا شاہراہ عمل، ایک نصب العین ہے اور دوسرا مسلک۔ اور دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اگر ایک ناقص ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے میں بھی کچھ کمی ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ ''ایمان باللہ'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' ان معنوں میں ایک ایسی کسوٹی ہے۔ جس پر ہر فرد ہر جماعت، ہر قوم، ہر نظام اور قانون پر کھا جا سکتا ہے۔ اس میں کسی کی رو رعایت کی گنجائش ممکن نہیں۔ ایک زمانہ میں مسلمان ان دو اوصاف کے حامل تھے (22)۔

تحریک آزادی فکر

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا مکتبہ فکر:

مولانا عبید اللہ سندھیؒ جیسے مصلحین ملت کو بعض حلقوں میں احیاء پسند ماضی پرست کہا جاتا تھا۔ ان حضرات کو شاید معلوم نہیں کہ عمل کے لیے ماحول اور اس کی ضرورتوں سے مفاہمت کرنا ضروری ہوتا ہے اور جس طرح لطافت بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی طرح کوئی نصب العین جب تک کہ ماحول کے ساتھ اس کی مفاہمت نہ ہو، عملی پروگرام کی صورت اختیار نہیں کر سکتا۔

اور ---- وہ اس لیے کہ ہر قوم کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جس طرح کہ ہر قوم کی اپنی خاص زبان ہوتی ہے اور جیسے اس

قوم کو کوئی بات سمجھانے کے لیے اس کی زبان، اس کے اسلوب بیان اور اس کی ادبی روایات کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کو کسی عملی پروگرام پر چلانے کے لیے اس کے مزاج اور اس کی تاریخی روایات کا خیال کرنا پڑتا ہے، اور جب تک کوئی پروگرام اس کے ذہن میں نہ اترے اور جس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مزاج کے مطابق ہو۔ اس وقت تک اس قوم میں عمل کا ولولہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ارباب انقلاب کا اعتراض تھا۔ اسی طرح ''ارباب دین'' نے بھی مولانا سندھی پر اعتراض کیے ہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے ایک دفعہ ''معارف'' میں یہاں تک لکھ دیا تھا کہ زندگی میں اشارۃً بھی کبھی کتاب وسنت سے اپنی ذرا سی بے تعلقی کا بھی اظہار نہیں فرمایا بلکہ اس کے خلاف ان کی زندگی کے آخری دنوں میں راقم السطور جب خدمت میں حاضر ہوا تو وصیت کے طور پر اسے فرمایا کہ:

''قرآن کی محبت دل میں جاگزین کرو اسے اپنے فکر وعمل کا اساس بناؤ اور پھر زندگی کے مسائل کو سوچو، سمجھو اور ان کو سلجھاؤ، ہوا یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے پہلے تو قرآن کی جلدیں باندھیں پھر اسے غلافوں میں لپیٹا، ہم ان غلافوں کو چاک کرنا چاہتے ہیں ہم ان جلدوں کو پھاڑیں گے تاکہ قرآن جیسا وہ ہے لوگوں کے پاس پہنچے اپنی اصل شکل میں بالکل واشگاف اور بے نقاب لوگ اسے پڑھیں اور اپنی زندگی میں اسے مشعل راہ بنائیں''(23)۔

اس کے باوجود اہل علم کا جو گروہ اس بات پر مصر ہوا کہ مولانا کے انقلابی فکر اور ان کی انقلابی تعلیمات کی سند چونکہ ہم کتاب وسنت کے صحائف میں نہیں پاتے اس لیے ہم مولانا کی دعوت کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔ ان واجب الاحترام اہل علم کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ نے اور سب لوگوں نے دیکھا ہے کہ مولانا جو کچھ فرماتے اور لکھتے تھے اس میں ایک بات کا وہ بہت خیال رکھتے تھے ان کا دستور یہ تھا کہ کتاب وسنت کے حوالے تجاویز بھی کہتے اس کے ساتھ ہی یہ ضرور بتا دیتے کہ یہ نتیجہ میں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی فلاں کتاب کی فلاں عبارت سے استنباط کیا ہے لیکن اگر کوئی ایسی بات کہتے جس کے لیے انہیں شاہ صاحب کی کتابوں سے سند نہ ملتی تو صراحت کر دیتے کہ یہ میرا ذاتی اجتہاد ہے میں اس کو منوانے کے لیے مصر نہیں ہوں جو چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔۔ ہمارے خیال میں ان حضرات کو اس بات سے تو شاید انکار نہ ہوگا کہ مولانا عبید اللہ صاحب شاہ ولی اللہ کے علوم اور ان کی حکمت میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور آپ بھی جانتے ہوں گے کہ ولی اللہی علوم ساری عمر ان کی زندگی کا اوڑھنا، بچھونا رہے ہیں اس سلسلہ میں مجلۃ الفرقان (بریلی) کے صفحات پر ''مولانا سندھی کے افکار میں یہ چیز بری طرح کھٹکتی ہے کہ وہ اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح وبہبود کے لیے ضروری نہیں سمجھتے''۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ: ''ہم بھی آخر کتاب وسنت کے عالم ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابیں ہم نے بھی پڑھی ہیں لیکن جو باتیں مولانا عبید اللہ سندھی صاحب کتاب وسنت کی انقلابی تعلیمات اور شاہ ولی اللہ کی انقلابی حکمت کے متعلق کہتے ہیں وہ ہمیں تو ان کتابوں میں کہیں لکھی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ آخر یہ معمہ کیا ہے؟''۔

ان بزرگوں کو اس بات سے تو شاید انکار نہ ہوگا کہ مولانا بھی کتاب وسنت کے بہت بڑے عالم تھے اور ان کی ساری

زندگی قرآن مجید کے مطالعہ اور اس کے حقائق کو سمجھنے میں گزری اور اس راہ میں انہوں نے کبھی کسی جسمانی تکلیف اور دماغی مشقت کی پروانہ کی، اور آپ کو اس کا بھی علم ہوگا کہ موصوف نے علم حدیث وفقہ کی تحقیق میں بھی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ صرف کیا تھا۔ پھر فلسفہ وحکمت پر بھی وہ غائر نظر رکھتے تھے اور تصوف کے تو وہ محض عالم نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر سلوک کی باقاعدہ منزلیں طے کی تھیں۔ اپنے بزرگوں اور استادوں کے ساتھ ان کی عقیدت اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ جس مرشد نے بچپن میں سب سے پہلے ان کو کلمہ توحید کی تلقین فرمائی تھی، زندگی کے آخری دنوں تک جب کبھی اس مرشد کا نام ان کی زبان پر آتا تو فرط محبت میں مولانا پر رقت طاری ہو جاتی اور آنکھیں بے اختیار پُرنم ہو جاتیں اور جس استاد سے انہوں نے کتاب وسنت کی تعلیم پائی تھی اس پاک نفس بزرگ کے ارشادات کی تعمیل میں انہوں نے اپنی ساری زندگی جان جوکھوں میں کاٹی، وطن سے بے وطن ہوئے، پردیس میں مارے مارے پھرے، ذلتیں برداشت کیں، بھوکے رہے کوڑی کوڑی کے محتاج ہوئے، اس استاد سے ان کی فریفتگی کا یہ حال تھا کہ آخر وقت میں بستر مرگ پر پڑے ہیں، اور جب جان لینے والا فرشتہ آ کر دستک دیتا ہے تو انہیں اپنے مرحوم ومغفور استاد کے نام کے زندہ رکھنے کے سلسلے میں "یادگار شیخ الہند" اور "محمود نگر" کے متعلق تدبیروں میں مصروف پاتا ہے۔

کتاب وسنت کا مطالعہ وتحقیق سے اتنی وابستگی، اور ان کی تعلیم دینے والوں سے زندگی کی آخری ساعت تک اس قدر شیفتگی اور عقیدت ... یہ جانتے ہوئے کسی معترض کا یہ کہنا کون باور کرے گا کہ: "مانا مولانا کی زبان وقلم پر بے شک کتاب وسنت کا ذکر آتا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے دل اور دماغ "نعوذ باللہ" کسی اور وادی میں بھٹک چکے تھے اور وہ محض زمانہ سازی کے طور پر یا اپنی کسی مصلحت کے خیال سے کتاب وسنت کے ذیل میں اپنی باتیں کیا کرتے تھے"۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے متعلق جو یہ کہتا ہے، سچی بات ہے وہ مولانا کے مزاج اور انکی طبیعت سے بالکل ناواقف ہے ورنہ اگر مولانا کی زندگی پر اس کی نظر ہوتی تو وہ بآسانی سمجھ لیتا کہ مولانا جیسی طبیعت والے آدمی کیلئے سالہا سال تک اسی طرح کی دورخی زندگی گزارنا ناممکن تھا اور نہ انہیں اس کی مطلق ضرورت تھی، وہ خدانخواستہ اگر کتاب وسنت کو خیرباد کہہ کہ حقیقتہً دوسری وادی میں قدم رکھ چکے ہوتے تو وہ اس کا کھلے بندوں اعلان کرتے اور اس کے صلے میں ایک دنیا ان کی پیشوائی کو آگے بڑھتی اور عظمت اور قیادت ان کے قدم چومنے کو حاضر ہوتی اگر وہ ایسا کرتے تو ہمارے خیال میں انہیں اس میں زیادہ دقت بھی نہ ہوتی کیونکہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر بچپن ہی میں دنیا کی سب سے بڑی متاع یعنی بیوہ ماں کی محبت، جانثار بہنوں کی عقیدت اور گھر کا آرام اور سکھ چھوڑ چکے تھے۔ اور اس کے بعد بھی بارہا اپنے ذہن اور عمل کی یک رخی کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے مناصب سے ہاتھ کھینچ لیا تھا لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ انہوں نے سید سلیمان ندوی صاحب کا یہ ارشاد گرامی دیکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

"مولانا سندھی کے مضمون کو میں نے بغور پڑھا اور اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ بے شک مولانا کی نظر حضرت شاہ صاحب کے فلسفے اور نظریات پر نہایت وسیع ہے" (24)۔

اس کے علاوہ الفرقان کی اسی شاعت میں مولانا منظور صاحب نعمانی نے بھی مولانا کے متعلق لکھا تھا کہ مولانا کے مطالعہ

کے مطالعہ کے بعد اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۔۔۔۔۔۔ولی اللّٰہی حکمت پر مولانا کی نظر کس قدر گہری ہے اور شاہ صاحب کے علوم و معارف کا انہوں نے کس قدر عمیق مطالعہ فرمایا ہے"۔

قارئین خود ہی انصاف فرمائیں ان کی شہادتوں کے بعد کسی صاحب کا یہ کہنا کہ مولانا خدانخواستہ شاہ صاحب کو سمجھ نہیں سکے یا انہوں نے جان بوجھ کر شاہ صاحب کی باتوں کا غلط مطلب لیا کس قدر ظلم ہوگا۔

اب اگر اہل علم کے گروہ میں سے کوئی صاحب یہ کہیں کہ ہم نے کتاب و سنت کو پڑھا ہے اور شاہ صاحب کے علوم کا بھی احاطہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں قرآن کی انقلابی تعلیم اور شاہ صاحب کی انقلابی حکمت کا کہیں سر پتہ نہیں ملا تو اس کے جواب میں مجبوراً ایسی عرض کرنا پڑے گا کہ محترم بزرگو! پڑھنے پڑھنے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے بیشک آپ نے یہ سب کچھ پڑھا ہمیں اس سے مجال انکار نہیں لیکن آخر اس سے بھی تو انکار نہیں ہو سکتا کہ مولانا نے بھی کتاب و سنت کو پڑھا تھا اور انہوں نے جیسا کہ سب کو تسلیم ہے شاہ صاحب کی حکمت پر برسوں غور کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ مولانا اپنے مطالعہ و فکر کے ذریعہ جن نتائج اور حقائق تک پہنچے، آپ کیوں ان تک نہیں پہنچ سکے، تو اس ضمن میں ہمیں صرف اتنی گزارش ہے کہ مثال کے طور آپ انسان کی نظر کو لیجئے نظر کا کام دیکھنا ہے اور بالعموم ایک آدمی کی نظر دوسرے آدمی کی نظر سے اپنی طبعی خصوصیات میں زیادہ مختلف نہیں ہوتی لیکن یہ تجربے کی بات ہے کہ ایک چیز کو ایک وقت میں دو آدمی دیکھتے ہیں تو ایک خوشی اور انبساط سے بھر جاتا ہے اور دوسرے پر درد و کرب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی آدمی ایک وقت میں ایک چیز کو مرغوب اور دلکش پاتا ہے اور دوسرے وقت میں یہی چیز اسے مکروہ لگتی ہے۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ جب انسانی نظر جیسی مادی چیز کا یہ حال ہے کہ مختلف حالات و کوائف میں اس کے اثرات اس قدر مختلف ہو سکتے ہیں تو فرمایئے جب معاملہ ہو الگ الگ طبیعتوں کا، جدا جدا خاندانی حالات کا، پھر ایک دوسرے کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہو اور بعد میں ایسے حالات رونما ہوں کہ ایک تو جس فضا میں اس نے جنم لیا ہو، اسی میں اطمینان سے اپنی زندگی گزار دے، اور دوسرے کو ساری عمر زمانے کے طرح طرح کے انقلابات سے سابقہ پڑے، کیا اس صورت میں ان مختلف اشخاص کی معنوی زندگی میں بہت بڑا فرق نہیں ہوگا، اور یہ لوگ مشاہدہ اور نظر کی حد سے آگے بڑھ کر جب مطالعہ و فکر کی حدود میں داخل ہوں گے تو کیا یہ یقینی امر نہیں کہ ایک کی فکری جستجو اور قلبی بصیرت ایک ہی کتاب کے مطالعہ سے اس پر حقائق و معارف کی ایک وسیع دنیا بے حجاب کر دے اور دوسرے کی نظر الفاظ کے ٹھوس مفہوم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ہماری تاریخ میں اب تک ایسا ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ اسلام کے مابعد الطبیعاتی مسائل میں یہ ہوتا ہے اور خود احکام کے فرق مراتب پر بھی اس کا اثر پڑا ہے۔ اسی بناء پر علم کلام کے مکتب خیال بنے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ متعدد فقہی مذاہب وجود میں آئے۔ حنابلہ نے تاویل کی مطلق ممانعت کر دی۔ بعض آئمہ نے تاویل کی مشروط اجازت دی۔ معتزلہ کا فرقہ پیدا ہوا۔ اشعریہ نے اپنا علم کلام بنایا اور ماتریدی خیال والوں نے اپنا نظام فکر مرتب کیا، بیشک ان سب کا اساس کتاب و سنت تھا۔ اور سب نے ''محکمات'' ہی پر اپنے علم و فکر کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی لیکن ہر صاحب نظر کو اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق ہی دین کے اسرار اور

حقائق معلوم کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔

شاید بے محل نہ ہو اگر ہم شاہ ولی اللہ صاحب کی سب سے مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے ابتدائی مقدمہ کی ایک عبارت کا ایک مختصر سا خلاصہ یہاں پیش کر دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے مسئلہ زیر بحث کی زیادہ وضاحت ہو سکے گی، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

علوم یقینی اور علوم دینی کا اصل الاصول علم حدیث ہے یہی مشعل ہدایت ہے اور اسی سے دین کی صحیح راہ ملتی ہے لیکن علماء حدیث کے مختلف طبقے ہیں اور ان کے متعدد مراتب میں اس علم کے چھلکے ہیں جن کے اندر بیج ہیں اور اس کی سیپیاں ہیں جن میں موتی ہیں اس علم کو بڑے بڑے اہل فضل وکمال نے موضوع بحث بنایا اس میں پہلا درجہ تو ان محدثین اور حفاظ کا ہے جنہوں نے صحیح اور ضعیف، متواتر اور غریب حدیث کی نظر سے علم پر بحث کی یہ پہلا قدم ہے۔ ظاہر سے اس علم کے باطن کی طرف جانے کا، اور چھلکے سے گودے تک پہنچنے کا، دوسرا درجہ احادیث کی لفظی اور معنوی تشریح اور توضیح کا ہے۔ اس موضوع کو عربی زبان وادب میں دست گاہ رکھنے والوں نے خاص کر لیا، اس کے بعد احادیث سے شرعی مسائل اور جاوی احکام استنباط کرنیکا درجہ ہے اسی کو عام علماء نے لب لباب اور حاصل مقصد سمجھا اور محقق فقہا اس کی بحث میں لگ گئے لیکن میرے نزدیک حدیث کا بحیثیت مجموعی دقیق ترین علم جو اپنے معانی میں سب سے عمیق، نور ہدایت میں سب سے ارفع اور شرعی علوم میں سب سے افضل ہے وہ اسرار دین کا علم ہے جس کی مدد سے احکامِ دین کی حکمت معلوم ہو، ان کی حقیقت کا پتہ چلے اور دینی اعمال کے خواص اور ان کے نکات کو سمجھا جائے۔ خدا کی قسم، یہ ہے وہ علم جس میں دوسرے سب علوم سے زیادہ آدمی اپنے قیمتی وقت کو صرف کرے اور اللہ تعالیٰ نے جن اطاعتوں کو ہم پر فرض کیا ہے ان کو ادا کرنے کے بعد اس کی تحصیل کو اپنی آخرت کے لیے زادِ راہ بنائے'' (25)۔

مولانا جب اپنے طلبہ کو ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کی یہ عبارت پڑھاتے تو اس علم کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ

ایک زمانے میں مسلمانوں کی حکومت تھی ان کی سیادت وسلطنت کا دبدبہ تھا ان کے بازوؤں میں قوت تھی اور ان کے اخلاق میں پختگی تھی ان کی قومی جمعیت بنی ہوئی تھی اور ان کا قانون حاکم اور نافذ تھا اس لیے اسرارِ دین کو سمجھنے اور خاص وعام کو ان حکمتوں سے واقف کرانے کی علماء نے اس وقت سے زیادہ ضرورت محسوس نہ کی لیکن آج نقشہ ہی دوسرا ہے نہ حکومت باقی رہی نہ سلطنت کا دبدبہ ہے۔ جمعیت کبھی کی مفقود ہو گئی قانون کا عمل دخل نہیں رہا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انتشار آخری حد تک نہ پہنچ چکا ہے اور تو اور اب خود ہمارا دین اغیار کے نرغے میں ہے اور اس پر ہر طرف سے اور ہر طرح کے حملے ہو رہے ہیں اور ڈر یہ ہے کہ جس طرح ہماری قومی جمعیت توڑ دی گئی اسی طرح خدا نہ کرے کہیں ہمارے دین کو گزند نہ آ جائے۔ چنانچہ آج اس زمانے میں تو اہل علم کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام کی حکمتوں کو سمجھیں اور غیر تو ایک طرف رہے خود اپنوں کو ان کے دین کی یہ حکمتیں سمجھائیں کیونکہ اب تو نوبت اس کی آ رہی ہے کہ کہیں مسلمان خود ہی اسلام سے خدانخواستہ دل برداشتہ نہ ہو جائیں''۔

اتنا کہنے کے بعد موصوف قدرے توقف فرماتے اور پھر رک رک کر آہستہ سے کہتے کہ:

اس معاملہ میں میرا اپنا حال یہ ہے کہ شاہ صاحب کے اس ارشاد کے مطابق میں نے شروع زندگی سے فرائض کے بعد اس شعبہ علم کی تحصیل اور اسی کے مطالعہ کو اپنی تمام محنت وجستجو کا موضوع بنائے رکھا ہے اور عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اسلام کے اصول وقواعد کے اسرار خود سمجھوں اور ان حقائق سے دوسروں کو بھی آگاہ کروں''(26)۔

اسرارِ دین کی جستجو اور احکامِ اسلام کی حکمت کی تلاش، مولانا کا انقلابی فکر دراصل نتیجہ ہے ان کے اسی دینی جذبے کی برسوں کی سخت اور پیہم جدوجہد کا، لیکن کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

ہم نے بھی اسرارِ دین کی جستجو کی ہے پر ہمارا منتہائے نظر تو وہ نہیں جس پر مولانا اپنی بحث وتحقیق پر پہنچے''۔

انقلاب کا طریقہ کار یہ ہے کہ خرابی پیدا کرنے والی مقتدر جماعت کے خلاف کوئی صاحب فکر دعوت وتبلیغ شروع کرتا ہے اور وہ اپنے گرد ایسی جماعت پیدا کر لیتا ہے جو اپنے نصب العین پر اپنا سب کچھ جان ومال، عزیز واقارب اور اپنی ہر محبوب شے قربان کرنے کو تیار ہوتی ہے۔ جماعت صاحب اقتدار جماعت سے وہ اگر اقتدار چھیننے کی کوشش کرتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ کمزور جماعت سے انتفاع کر رہی تھی۔ یہ طریق اکثر اوقات تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس انقلابی طریق کار کے تین ضروری جزو ہیں:

ا۔ نصب العین (Ideal)۔ ۲۔ جماعت (party)۔

۳۔ لائحہ عمل (programme)۔

ا۔ نصب العین:

نصب العین سے مراد یہ ہے کہ کوئی جماعت اپنے سامنے سوسائٹی میں ایک غلط نظام پاتی ہے۔ وہ جماعت اسے برباد کر کے اس کی جگہ صحیح نظام لانا چاہتی ہے۔ تو یہ تخریب اور اس کی جگہ صحیح نظام کے قیام کا ارادہ اس کا نصب العین کہلاتا ہے۔

۲۔ جماعت:

جماعت سے مراد یہ ہے کہ چند لوگ جو ہم فکر ہیں وہ اپنے فکر کے مطابق عمل کرنے پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے نصب العین کو جانتے ہیں اور اس کی خاطر ہر خطرات برداشت کرتے ہیں۔ وہ ایک جسم کی طرح کام کرتے ہیں۔ اس حیثیت میں وہ جماعت کہلاتے ہیں۔

۳۔ لائحہ عمل:

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ جماعت جس کا نصب العین متعین ہے۔ اپنے مقصد کا حاصل کرنے کے لیے ایک طریق کار سوچتی ہے۔ اس پر خوب غور وفکر کرتی ہے اور آخر کار سب افراد اسے تسلیم کر کے اس پر گامزن ہونا قبول کر لیتے ہیں۔ جب تک کسی جماعت میں یہ تینوں اجزاء نہ پائے جائیں وہ انقلابی نہیں کہلا سکتی۔ اس جماعت کا فکر شروع سے آخر تک ایک ہی رہتا ہے(27)۔

چونکہ صاحب اقتدار جماعت لڑے بھڑے بغیر اپنا اقتدار نہیں چھوڑ سکتی۔اس لیے انقلاب میں عموماً جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔اس لیے انقلابی جماعت جنگ کو بطور ایک ضرورت کے جائز سمجھتی ہے مگر لڑنے اور نہ لڑنے کا فیصلہ حالات کے مطابق کرتی ہے۔ابتداء میں وہ خاموشی کے ساتھ کام کرتی ہے۔اور رائے عامہ کو اپنے ساتھ ملاتی ہے۔یہاں تک کہ زمام اقتدار سنبھالنے کے قابل ہو جاتی ہے۔اس تیاری کے زمانے میں وہ مخالف کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کے باوجود وہ کھلم کھلا لڑائی سے پرہیز کرتی ہے اور بطریق احسن طرح دیتی جاتی ہے۔اور سب حملوں کو نہایت استقامت اور استقلال کے ساتھ برداشت کرتی ہے۔اس کے ارکان کو اپنے نصب العین کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔اور سب میں وحدۃ فکری ہوتی ہے۔اس لیے دشمن کا پروپیگنڈہ یعنی ''فکری حملہ'' ان کو گمراہ نہیں کر سکتا۔ان کی وحدۃ فکری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں وحدۃ عملی پیدا ہو جاتی ہے۔وہ اپنے نفع و نقصان کو مشترک سمجھتے ہیں۔اس لیے دشمن کا ''اقتصادی حملہ'' بھی انہیں منتشر نہیں کر سکتا۔

قرآن حکیم کی دعوت عالم گیر انقلاب کی دعوت ہے۔جس کا تعلق ساری نوع انسانی کے ساتھ ہے۔کسی معاشرے کی اجتماعی زندگی تین ستونوں پر قائم ہے:

۱۔ سیاسی منہج۔ ۲۔ اقتصادی منہج۔ ۳۔ فلسفہ۔

اگر کسی معاشرے کو ایک شخص مان لیا جائے تو سیاست اس کے اجزاء کو آپس میں مربوط کر کے اس کے ڈھانچے کو قائم رکھتی ہے۔اقتصادیات اسے نشو ونما پہنچاتی ہے اور فلسفہ اس کی معنوی زندگی کی تنظیم کرتا ہے(28)۔

اگر کوئی مخالف طاقت اس معاشرہ پر حملہ کر کے اس کی سیاسی طاقت چھین لے لیکن اس کا اقتصادی ڈھانچہ اور اس کا نظام فکر محفوظ رہے تو وہ اپنی سیاسی شکست کا مداوا کر کے اپنی ہستی از سر نو قائم کر سکتا ہے۔تاریخ اس کی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے۔افغانستان کی جنگیں اس کی اچھی مثالیں ہیں۔انگریزوں نے اسے تین مرتبہ (1919,1879,1852) سیاسی اور فوجی شکست دی۔لیکن اس کی اقتصادی اور فکری طاقت محفوظ رہی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانوں نے اپنے آپ کو پھر مضبوط کر لیا(29)۔

لیکن اس معاشرے کی فوجی اور سیاسی شکست کے بعد اس میں اقتصادی بدحالی بھی پیدا کر دی جائے لیکن فکری نظام قائم رہے تو بھی وہ پہلے سے زیادہ محنت کر کے اپنی اقتصادی حالت کی اصلاح اور اپنی سیاسی کمزوری کا مداوا کر سکتا ہے۔اور اگر سیاسی طاقت اور اقتصادی نظام کے ساتھ ہی اس معاشرہ کا فکری نظام بھی ٹوٹ جائے۔تو پھر معاشرہ کا زندہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔اسلام جن ملکوں میں اپنی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں داخل ہوا۔ان ملکوں میں ایران، افغانستان، ترکستان، مصر، شام وغیرہ میں اصل مذہب کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا۔اب ان ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی طاقت اسلام ہی کی خدمت میں استعمال ہو رہی ہے(30)۔

برعظیم پاکستان و ہند میں خود ہماری تاریخ اس تاریخی عمل کی ایک مثال ہے۔سترھویں صدی عیسوی میں برعظیم ہند پر مسلمانوں کا قبضہ کیا۔اس زمانے میں یورپی قومیں اس براعظم کیطرف بڑھیں۔انہوں نے یہاں کی حکمران طاقت کو شکست دینے کے لیے پہلے سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر فکری حملہ کیا۔

سیاسی میدان میں فرانس اور برطانیہ کی آویزش دکن میں شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۸۵۸ء تک سارے ملک پر خود قابض ہو گئے اور مغل حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ہماری سیاسی اور فوجی شکست تھی۔

اقتصادی میدان میں یورپ قوموں، خصوصاً انگریزوں نے ہماری صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کر دیا۔ ہمارے ملک کی پیداوار کوڑیوں کے مول خرید کر لے گئے اور اپنی مصنوعات سونے کے بھاؤ ہمارے ملک میں ٹھونس دیں۔ رفتہ رفتہ اس برعظیم کی ساری آبادی کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ہماری اقتصادی شکست تھی۔

اس پر اکتفا نہ کر کے انگریزوں نے ہم پر فکری حملہ بھی کیا۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے مذہبی افکار میں جو ہماری زندگی کی بنیاد تھے، وسوسے پیدا کرنے شروع کیے۔ یہ ان کا منفی فکری حملہ تھا۔ اسے کے ذریعے سے انہوں نے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اسلامی مذہبی حقائق کے خلاف شکوک پیدا کر کے ان کے یقین کی جڑیں ہلا دیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے افکار ایسے انداز میں پیش کیے، کہ ہمارے نوجوان ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے چنانچہ یورپی مادہ پرستانہ سائنس اور فلسفے نے ہمارے نوجوانوں کے افکار میں مزید تزلزل پیدا کر دیا۔ یہ یورپ والوں کا مثبت فکری حملہ تھا۔

انقلاب میں ضبط کی ضرورت:

قرآنِ حکیم کل قومی پیمانے پر انقلابی تحریک پیدا کرنی چاہتا ہے۔ اس کا ایک نصب العین یا مرکزی فکر ہے۔ وہ اس فکر کو ایک جماعت کی مکمل تیاری کے ذریعے سے انسانی سوسائٹی کے ایک حصے اور ملک کے ایک خطے میں خاص شکل میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ کوئی جماعت ضبط کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور جتنا بڑا انقلاب ہوگا۔ اتنے ہی زبردست ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسلامی جماعت میں ضبط:

جو جماعت بہت سخت ضبط کی مالک ہوتی ہے۔ وہ صلح اور جنگ میں اپنی مرکزی جماعت کے فیصلے کی پوری پوری فرمانبرداری کرتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے جو جماعت پیدا کی وہ جنگ میں ضبط کے مظاہرے کئی بار کر چکی۔ صلح کرنے میں ضبط کے بہترین مظاہرے کا موقعہ حدیبیہ میں پیش آیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے کمزور دشمن کی بدترین شرطیں صرف اس لیے مان لیں۔ کہ وہ بنیادی طور پر ان اصول کی حفاظت چاہتا تھا۔ جن کی حفاظت کے لیے یہ انقلاب برپا کیا جا رہا تھا۔ یعنی دین حنفی کے مرکز۔۔ کعبۃ اللہ۔۔ کا احترام۔۔ آپ کی جماعت نے اس اصول کو پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی، اس صلح کو صرف اس لیے مان لیا کہ وہ ایک زبردست ضبط میں آئے ہوئے تھے۔ اس ضبط کی انتہا یہ تھی کہ جب آپؐ نے اس جماعت سے موت پر بیعت لینی چاہی۔ تو ہر ایک شخص نے ٹھنڈے دل کے ساتھ یہ سمجھ کر بیعت کی کہ یہ موت یقینی ہے۔ اور جو شخص بھی اس وعدے کو توڑے گا۔ اسے ضبط توڑنے کی بڑی سے بڑی سزا بھی مل سکتی ہے (31)۔

فصل سوم:

مولانا عبیداللہ سندھی اوران کی سیاسی تحریک

پاک و ہند کے مسلمانوں میں مولانا عبیداللہ سندھی کو فضیلت ہے کیونکہ انہوں نے اپنی ساری زندگی اسلام کی ترویج، مسلمانوں کی بقا، ترقی اور سیاسی وسماجی حقوق کے لیے وقف کر دی۔ مذہب کے اعتبار سے وہ اپنی آزادی اور انقلاب پسندی کے ذریعہ ہر قیمت پر انگریز کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے (۱۹۱۵ء تا ۱۹۳۹ء) زندگی کا اکثر حصہ جلا وطنی میں گزارا۔ وہ جرمنی، افغانستان، ترکی اور روس کی فوجی اعانت کے ذریعہ بدیسی حکمرانوں کو ملک سے نکالنے کے لیے جدو جہد کرتے رہے۔ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں حکومت موقتہ ہند قائم کی۔ انہوں نے انگریزوں کو یہاں نکالنے کے لیے منصوبے بنائے۔ جنہیں انگریز نے ریشمی رومال سازش قرار دیا۔ لیکن منصوبے کے قبل از وقت افشا ہو جانے سے مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے لیے یہ صورتحال مایوس کن تھی۔ انہیں روس سے مدد حاصل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا۔ اس وقت روس میں سوشلسٹ حکومت قائم ہو چکی تھی جو کہ تمام ملکوں کی آزادی کا دم بھرتی تھی۔ برصغیر میں حالات بگڑتے جا رہے تھے۔ برصغیر میں قیادت گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے یہ اعلان کیا ہوا تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے لیے ایک کروڑ روپیہ سوراج فنڈ کے لیے اور کم از کم ستر لاکھ گھروں میں چلنے لگیں۔ اس کے عوض وہ ہند کو آزادی کا تحفہ دیں گے۔ دوسری طرف مولانا عبیداللہ سندھی کا رابطہ برصغیر کے سیاسی رہنماؤں سے قائم تھا۔ اس کے لیے مولانا عبیداللہ سندھی روس چلے گئے۔ روس میں ان کا قیام ۱۹۲۴ء سے تک رہا۔ اس دوران انہوں نے ماسکو میں روس کے وزیر خارجہ چیچرن سے ملاقات کی۔ جس میں انہوں نے تجویز کیا کہ:

۱۔ فی الحال انڈین نیشنل کانگریس کو ایک کروڑ روپیہ جانا چاہیئے۔ جس کو ہندوستان قرض سمجھے گا اور آزاد ہونے پر روس کو واپس کر دے گا۔

۲۔ افغانستان بھی روس کے ساتھ مل کر کام کرے کیونکہ روس کے لیے ہندوستان سے تعلق پیدا کرنے اور اس کو برقرار رکھنے کا سب سے محفوظ راستہ افغانستان کا ہے۔ ایک کروڑ روپیہ ہندوستان سے تعلق بنانے اور اس کو قائم رکھنے کے لیے روس کو راستہ دینے کے عوض بھیجنا چاہیئے (32)۔

چیچرن نے چوتھی ملاقات میں یقین دہانی کرائی کہ روس کی حکومت ان کی تجاویز مان لے گی لیکن مولانا ہندوستانی راہنماؤں اور محمد نادر خاں سے رابطہ پیدا کریں۔ ماسکو میں رہتے ہوئے رابطہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے مولانا نے ترکی جانا مناسب خیال کیا۔ ترکی میں قیام کے دوران انہوں نے کانگریس راہنماؤں سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس میں انہیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ہندوستانی راہنما لالہ لاجپت رائے استنبول گئے تھے اور مولانا سے ملاقات کی تھی۔ مولانا کے منصوبے سے واقف ہونے پر سخت برہم ہوئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کسی مسلمان ملک اور خاص طور افغانستان سے مدد کی بات کی جائے (33)۔

مولانا حسین احمد مدنی نے لکھا ہے: ''مولانا سے مل کر لالہ جی وطن پہنچے۔ تو اپنی ملاقات کے حوالے سے انہوں نے مولانا کے خلاف پروپیگنڈہ کی ایک زبردست مہم شروع کردی۔ جس کی لپیٹ میں مسلمانوں کے علاوہ کانگریس بھی آ گئی۔ اس زمانہ میں شدھی اور اس کے جواب میں تبلیغ کا دور دورہ ہوا۔ سنگھٹن اور تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔ فرقہ وارانہ فسادات کثرت سے ہونے لگے اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ پس پشت ڈال دیا گیا(34)۔

قبلہ مولانا نے مجھے بتایا کہ ان کے خیال میں لالہ لاجپت رائے نے ہندوستان میں جا کر یہ خبر اپنے سیاسی گرو مدن موہن مالوی کو پہنچائی۔ جس سے ہندوستان میں ہندو مسلم تعلقات سخت خراب ہو گئے(35)۔

برصغیر کے حالات بہت کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا علم مولانا کو اخبارات کے ذریعہ ہوتا رہا۔ مولانا سندھی بہت بڑے سیاسی مفکر تھے۔ انہیں اپنی فکر سے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں مذہبی اختلافات بھی موجود تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ نہ صرف ان دو فرقوں میں باہمی اختلاف ہے بلکہ ہر ایک فرقہ کے اندر قومی اور معاشرتی تقسیمات موجود ہیں۔ پنجابی، سندھی، ہندوستانی، پٹھان، کشمیری اور بلوچی کا سوال موجود ہے۔ تو ہندوؤں میں بنگالی، بہاری، گجراتی، مارواڑی، دہتی اور مدراسی کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔ ان قومی اختلافات کو مذہبی یگانگت بھی نہیں ملا سکتی۔ اس کے بعد ہر ایک قوم میں طبقاتی علیحدگی موجود ہے۔ مال دار اور محنت کش، زمیندار اور کسان سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش ہے۔ ہر ایک ہندوستانی قوم کو دو متقابل اور متعارض صفوں میں بہ آسانی تقسیم کر سکتی ہے۔

مذہبی اور دیگر اختلافات کی وجہ سے مولانا عبیداللہ سندھی کو یقین ہو گیا کہ اقوام ہند کے درمیان اتحاد پیدا کرنا ممکن نہیں دائمی امن و سکون کے لیے کوئی راہ نکالنا ضروری تھا۔ انہوں نے ایک منصوبہ بنایا۔ منصوبے کے خدوخال واضح ہونے کے بعد انہوں نے کانگریس کمیٹی کابل کے تحت ''مہا بھارت سرورا جیہ پارٹی'' قائم کی جس کے ذریعہ وہ منصوبے کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے سیاسی راہنماؤں اور قابل اعتماد رفقاء سے صلاح مشورہ جاری رکھا۔ ان کے رفقاء میں عزیز احمد، اقبال شیدائی، ظفر حسن خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ظفر حسن ان دنوں ماسکو میں مقیم تھے۔ عزیز احمد کے ذریعہ انہیں پروگرام کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو انہیں بعض حصوں میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا وہ ۵ اگست کو ماسکو سے روانہ ہوئے اور ۱۰ اگست کو استنبول پہنچے(36)۔

ان کے اور مولانا کے درمیان ہر روز تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ اس بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے۔ اس سال جس قدر تفصیل و توضیح سے خیالات مرتب کیے ان میں ظفر حسن بھی پورے طور پر شریک رہا اور جس قدر ہندوستانی قابل اعتماد دوستوں سے مشورے ملتے رہے ان کی رائے بھی شامل کر لی گئی۔ اس لیے اسے صحیح معنوں میں کانگریسی کمیٹی کے نام سے نسبت ہو سکتی ہے(37)۔

غالباً ابتدائی مسودہ وہی ہے جسے رسالہ تاریخ و سیاسات نے فروری ۱۹۵۴ء کے شمارے میں وضاحتی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔

''ذیل میں ہم آزادی ہندوستان کے سیاسی آئین کا وہ خاکہ شائع کرتے ہیں جو مولانا عبیداللہ سندھی نے ۱۹۲۲ء میں مرتب کیا تھا۔ وہ اس وقت کابل سے روس ہوتے ہوئے ترکی پہنچے تھے اور عصمت پاشا وغیرہ کمالی اکابر کو بتانا چاہتے تھے کہ حصول آزادی اور انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان کے مسلمان آزاد اور فعال قوم کی طرح رہ سکیں گے۔ اس غرض سے مولانا عبیداللہ سندھی کسی وحدانی یا مرکزی حکومت کی بجائے برعظیم کو مختلف آزاد ممالک میں تقسیم کرنا۔ اور صرف سیاسی اتحاد کے ذریعے متحد رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سفرنامہ کابل اور ذاتی سوانح میں بھی جو علیحدہ چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ صاف صاف تحریر ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں محض ایک ایک اقلیت رہ جانے پر قانع نہیں اور تحریک خلافت کے بعد تک جو مسلم سیاسی اکابر کانگریس کے زیر اثر آ گئے۔ ان کی مذمت کرتے ہیں (ذاتی ڈائری، سفرنامہ کابل)۔ مرحوم کا یہ منصوبہ قسطنطنیہ میں انگریزی اور اردو میں طبع ہوا تھا۔ لیکن مدت سے نایاب ہے۔ ہمیں مولانا کے قریبی عزیز اور رفیق طریق مولوی عزیز احمد نے جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں، مہربانی سے یہ قلمی مسودہ دیا۔ چونکہ یہ نہ صرف مولانا مرحوم کی انقلاب پسندی اور سیاسی فراست کی دستاویز ہے۔ بلکہ ہمارے افکار میں ارتقاء کی اب ایک تاریخی شہادت بن گیا ہے۔ ہم نے اسے رسالہ تاریخ میں از سر نو چھاپ دینا مناسب سمجھا'' (38)۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا مجوزہ پروگرام:

مولانا نے سرور اجیہ پارٹی کا جو پروگرام تجویز کیا تھا وہ ان کے اور ان کے رفقائے کار کے تجزیہ اور حالات کے جائزہ کے مطابق اس نوعیت کا تھا۔ جس سے برصغیر کے تمام مسائل حل ہو سکتے تھے۔ ملک میں پائے جانے والے، نسلی، لسانی، مذہبی اختلافات کی نوعیت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ان سب چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی ایک پروگرام مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایشیاٹک فیڈریشن:

مولانا عبیداللہ سندھی نے ۱۹۲۴ء/۱۳۴۳ھ میں ایشیاٹک فیڈریشن کا تصور پیش کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایشیا کے تمام ممالک ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ آپس میں اتحاد کر کے سامراجی قوتوں (برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ) کو ایشیا سے نکال دیں۔ اس وقت ہانگ کانگ، لاؤس، انڈونیشیا، کمبوچیا، فلپائن، برما، انڈونیشیا، ویت نام، نیپال، بھوٹان، برونائی، شام، لبنان، اردن، ہندوستان وغیرہ انگریزوں، فرانسیسیوں اور ڈچوں کے قبضہ میں تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ خواہش تھی کہ تمام ملک اکٹھے ہو کر ان سے آزادی حاصل کریں۔ آج متنازعہ مسائل کے حل کے لیے آر۔ سی ڈی سارک اوپیک غیر جانبدار ملکوں کی تنظیم، مسلم اور عرب لیگ کام کر رہی ہیں۔ اس سے قبل نیٹو، سیٹو اور وارسا پیکٹ میں شریک کمیونسٹ ممالک کی تنظیمیں بڑا کام کر چکی ہیں۔ یہ سب تنظیمیں موجودہ صدی کے نصف آخر میں معرض وجود میں آئیں اور مولانا سندھی نے ۱۹۲۴ء/۱۳۴۳ھ میں ایشیائی ملکوں کی فیڈریشن قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے (39)۔

سیاسی فکر پر پروگرام کے اثرات:

مولانا سندھی نے سرو راجیہ کے آئینی پروگرام سے ساری دنیا کو متعارف کرنے کا اہتمام بڑے پیمانے پر کیا۔ اردو کے علاوہ ترکی اور انگریزی میں اس کی اشاعت ہوئی۔ مولانا کے بیان کے مطابق پروگرام ہندوستان میں بھی کئی راستوں سے بھیج دیا ہے۔ افغانستان بھی۔ روس کو بھی دیا ہے۔ ترکی اور مصری اہل الرائے بھی دیکھ چکے ہیں۔ ایرانیوں کو بھی دیا ہے۔ جاپان بھی دیکھ لے گا۔ یہاں کے روسی تائید کرتے ہیں۔ علی ہذا القیاس مصری وترک احباب اور ماسکو سے بھی تائید ہوگی مگر ذرا محنت اور مقابلہ کے بعد جاپان بہت مسرت سے قبول کرے گا۔ افغان گورنمنٹ الٹی میٹم سمجھے گی۔ ہندوستان دیکھیں کس نتیجہ پر پہنچتا ہے(40)۔

جواہر لال نہرو جو سیاسیات کے طالب علم کی حیثیت سے ملکی اور پوری صورتحال کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سے اس وقت ملاقات کی تھی۔ جب وہ ترکی سے حجاز کا قصد کر کے روانہ ہوئے۔ اور اٹلی میں مختصر قیام کیا تھا۔ اپنی ملاقات کے تاثرات تحریر کیے۔

''مجھے وہ ایک نہایت چالاک انسان نظر آتے ہیں۔ ان میں سیاسی جوڑ توڑ کی پرانی وضع کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ جدید نظریات سے واقف نہیں تھے۔ انہوں نے ریاست ہائے متحدہ یا متحدہ جمہوریہ ہند کی ایک سکیم تیار کی تھی۔ انہوں نے استنبول میں اپنی مصروفیات کا حال بھی بتایا تھا۔ انہیں میں نے زیادہ اہم خیال نہیں کیا۔ اس لیے میں انہیں بھول گیا۔ چند ماہ بعد ان کی ملاقات لالہ لاجپت رائے سے ہوئی۔ ان کے سامنے بھی وہی کہانی (اسکیم) بیان کی۔ انہوں نے غیر منصفانہ انسانوں اور استعجاب آمیزی کے ساتھ ہندوستان پہنچ کر دہرائی۔ اس سال کے انڈین کونسل کے انتخابات میں ان کے ان خیالات نے اہم کردار ادا کیا''(41)۔

سرو راجیہ پارٹی کے پروگرام کی انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ اس سے وابستہ مسلمان راہنماؤں میں سوائے مولانا ابوالکلام آزاد اور دو ایک راہنماؤں کے کسی نے پسند نہیں کیا اور اگر کیا بھی تو اس کا اظہار نہیں ہوا۔ برصغیر کی سیاسی فکر جو ۱۹۲۶ء/۱۳۴۵ھ کے بعد سامنے آئی۔ اس پروگرام کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ اگرچہ صاحبان فکر نے پروگرام کے خطوط پر اپنے نظریات قائم کیے۔ مگر کسی نے اور حق کا اظہار ضروری نہ سمجھا۔ مولانا سندھی کے خطوط میں اس کے اشارے ضرور ملتے ہیں کہ کن رہنماؤں نے ذہنی طور پر گردگرام قبول کرلیا تھا(42)۔

''ڈاکٹر محمد اقبال اور فضل حسین پہلے ہی یہ نظریہ قبول کر چکے تھے۔ گو ظفر حسن نے شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے آپ بیتی میں لکھا ہے:

''ہم نہیں جانتے کہ علامہ اقبال نے یہ پروگرام پڑھا تھا کہ نہیں۔ اگر نہ بھی پڑھا ہو اور فرض کیا جائے کہ انہوں نے ۱۹۳۰ء/۱۳۴۹ھ کے ملکی حالات کو مدنظر رکھ کر پاکستان بنانے کی تجویز مستقل طور پر سوچ کر پیش کی تھی تو کم از کم یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہستی اور تہذیب کو ہندوستان میں محفوظ رکھنے کی ترکیب سب سے پہلے مولانا کی طرف سے ۱۹۲۴ء/۱۳۴۳ھ میں اس وقت کے حالات کے مطابق ہندوستانیوں کے سامنے پیش کی گئی تھی(43)۔

شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پروگرام سے بخوبی آگاہ تھے۔ رسالہ ''الولی'' حیدر آباد سندھ کے ایڈیٹر علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی نے شمارہ اکتوبر ۱۹۷۷ء/ ۱۳۹۷ھ میں لکھا ہے کہ

''کئی سال ہوئے ایک مرتبہ سندھ مسلم کالج کراچی میں استاد محترم مولانا عبید اللہ سندھی کی یاد میں ایک برسی منائی۔ جس میں سندھ کے مشہور صحافی اور دانشور سید پیر علی محمد شاہ راشدی نے شرکت کی اور مہمان خصوصی مولانا عبد المجید سالک نے تقریر فرمائی۔ لکھے پڑھے اور دانشور لوگوں کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ سالک مرحوم نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ مولانا غلام رسول مہر ۱۹۲۸ء / ۱۳۴۷ھ میں فریضہ حج ادا کرنے گئے تھے۔ مکہ مکرمہ میں انکی ملاقات علامہ عبید اللہ سندھی سے ہوئی۔ علامہ سندھی نے اپنے پروگرام کی کاپی مہر صاحب کو دی۔ مولانا نے یہ پروگرام استنبول میں بنایا تھا۔ جس کی خاص بات یہ تھی کہ ہندوستان کو مختلف اقوام کا ملک بتایا گیا تھا۔ اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس کے خصوصی حقوق اور اگر چاہیں اور الگ ہو جائیں کا ذکر تھا۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب جب واپس ہوئے تو ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) سے اس کا ذکر کیا اور وہ کاپی دے دی۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس پروگرام کو سراہا۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر علامہ اقبال کو الہ آباد میں یونیٹی کانفرنس کی صدارت کے لیے جانا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے وہاں جو خطبہ دیا۔ اس میں سیالکوٹ کے دوسرے عظیم انقلابی اور مفکر علامہ عبید اللہ سندھی کے پروگرام کی بعض اہم باتوں کا بھی ذکر کیا۔ مولانا چونکہ حکومت کے باغی تھے اس لیے ان کا نام نہ لیا''(44)۔

امر واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا خطبہ صدارت مسلم لیگ اجلاس ۱۹۳۰ء/ ۱۳۴۹ھ اسی پروگرام کا نقش ثانی ہے۔ اگرچہ ان کا خیال واضح نہیں ہے۔ انہوں نے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ خواہ یہ مجوزہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرلے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اور مربوط اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی''(45)۔

خطبہ میں ریاست کا لفظ غیر واضح ہے۔ ہر وفاق کی اکائی ریاست ہی کہلاتی ہے۔ جیسے امریکہ کی ریاستیں۔ اس لیے دستوری اصلاحات کے لیے تجاویز مرتب کرنے والی ''نہرو کمیٹی'' میں بھی اسے پیش کیا گیا تھا(46)۔ ایک احتمال یہ ہوتا ہے کہ وہ کس علاقہ کی چار ریاستوں یا صوبوں کو ملا کر مسلمانوں کی وحدت کا تصور پیش کرنا چاہتے تھے۔ اور باقی ہند سے ایسے آزاد کرنے کے حامی نہیں تھے۔ ان کی تصدیق ان کے بعض خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے تھامسن کو ۲ مارچ ۱۹۳۴ء/ ۱۳۵۲ھ کو ایک خط لکھا تھا:

''آپ نے مجھے پاکستان اسکیم کا خالق قرار دیا ہے۔ پاکستان اسکیم میری نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبہ میں تجویز پیش کی تھی وہ مسلم صوبے کے قیام کی تھی۔ میرا مطلب شمال مغربی ہند میں مسلمانوں کی مکمل اکثریت کے صوبے سے ہے۔ جو ہند کے موجودہ وفاق کا حصہ ہوگا۔ پاکستان سکیم میں مسلم صوبوں کا ایسا وفاق تجویز کیا گیا تھا جو ایک جداگانہ ڈومینن کی حیثیت سے براہِ راست برطانیہ سے منسلک ہو''(47)۔

اسی طرح ۶ مارچ ۱۹۳۴ء/۱۳۵۳ھ کو انہوں نے راغب احسن کو لکھا تھا "براہِ کرم یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ اس تبصرہ کے لکھنے والے (مسٹر تھامس) میری سکیم کو پاکستان کی سکیم سمجھتے ہیں۔ میں نے انڈین فیڈریشن میں ایک مسلم صوبے کے قیام کی تجویز دی ہے۔ جبکہ پاکستان اسکیم میں شمال مغربی صوبوں کی ایسی فیڈریشن کی اسکیم رکھی گئی ہے جو انڈین فیڈریشن سے باہر ہو اور براہِ راست برطانیہ سے منسلک ہو" (48)۔

دولت کی مساویانہ تقسیم:

موجودہ تقسیم دولت اور قانون ملکیت اور اس کے عوض ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں انفرادی ملکیت کے بدلے اجتماعی ملکیت کا قانون جاری ہو اور زمین کی پیداوار اور صنعتی مال کو بیچنے کے لیے نہیں بلکہ حسب ضرورت استعمال کے لیے پیدا کیا جائے۔ انقلاب کا یہ پہلو دنیا پر اثر ڈال رہا ہے۔ اگر کمیونسٹ انٹرنیشنل اپنے انتہائی نقطہ نظر میں جلدی کامیاب نہ بھی ہو پھر بھی دو دنیا میں سیاسی اور اقتصادی طاقت، محنت کش طبقہ کو دلا کر رہے گی۔

سرور اجی اصل الاصول کی تشریح میں مجدد ولسان دہلی خواجہ الطاف حسین حالی کے مسدس کا اقتباس۔

سرمایہ دار

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے
خمیر ان کا اور ان کی طینت جدا ہے
نہ گفتار میں ان کی کوئی خطا ہے
نہ کردار ان کا کوئی نہ روا ہے

وہ جو کچھ کہیں کہہ سکے کون ان کو
بنایا ندیوں نے فرعون ان کو

سمجھتے ہیں سب عیب جن عادتوں کو
بہالم سے نسبت ہے جن سیرتوں کو
چھپاتے ہیں اوباش جن خصلتوں کو
نہیں کرتے اجلاف جن حرکتوں کو

وہ یہاں اہل دولت کو ہیں شیر مادر
نہ خوف خدا ہے، نہ شرم پیمبرؐ

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا
نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا

ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا
تعیش میں جینا نمائش میں مرنا

سدا خواب غفلت میں بے ہوش رہنا
دم نزع تک خود فراموش رہنا

پریشان اگر قحط سے اک جہاں ہے
تو بے فکر ہیں کیونکہ گھر میں سماں ہے
اگر باغ امت میں فصل خزاں ہے
تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گل فشاں ہے

بنی نوع انسان کا حق ان پر کیا ہے
وہ اک نوع نوع بشر سے جدا ہے

کہاں بندگان ذلیل اور کہاں وہ
بسر کرتے ہیں بے غم قوت و ناں وہ
پہنتے نہیں جز سموا و کتاں وہ
مکاں رکھتے ہیں اشک خلد و جناں وہ

نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

کمر بستہ ہیں لوگ خدمت میں ان کی
گل و لالہ رہتے ہیں صحبت میں ان کی
نفاست بھری ہے طبیعت میں ان کی
نزاکت سے داخل ہے عادت میں ان کی

دواؤں میں مشک ان کے اٹھتا ہے ڈھیروں
وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں

یہ ہو سکتے ہیں ان کے ہم جنس کیونکر
نہیں چین جن کو زمانہ میں دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر
نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر

پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر الٹی ہو تو تقدیر کھوٹی(49)

ہندوستان میں محنت کش طبقے کی حکومت کا قیام:

مولانا سندھی واپس لوٹے تو انہیں یہی فکر لاحق رہتی کہ ہندوستانی عوام کیسے منظم ہوں اور ہندوستان کی فوجی طاقت کس طرح آج کی ضرورتوں کے مطابق مضبوط کی جا سکتی ہے۔ مولانا نے اپنے خطبات اور مقالات میں بار بار اسی مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا مسئلہ جس کو حل کیے بغیر مستقبل کی کوئی تدبیر عمل میں نہیں آ سکتی۔ ہندوستان میں اجنبی تسلط کا مسئلہ ہے۔ گزشتہ ایک سو برس سے اس ضمن میں جو بھی کوششیں ہوئیں ان سے کبھی بھی خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف طبقوں نے اب تک یک خیال اور یک سو ہو کر کبھی اس ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد نہیں کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی فوج اور بعض جاگیردار طبقے اٹھے۔ لیکن عوام اور متوسط طبقے ان کے ساتھ نہیں تھے۔ یہ عناصر اور متوسط طبقے، مزدور و کسان اکٹھے ہو کر ایک انقلاب لائیں گے۔ جس کی رفعت و عظمت کی تاریخ میں شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔

اپنے ایک مقالہ میں مولانا سندھی نے اس سلسلہ میں بھی خواجہ الطاف حسین حالی کا اقتباس پیش کیا ہے:

محنت کش

مگر ایک فریق ان کے سوا ہے
شرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے
سب اس بزم کا نور ضیا ہے
سب اس باغ کی جن سے نشوونما ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے میں خدمت کی خاطر

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری
جہاں دیکھیے فیض اس کا ہے جاری
یہی ہے کلید در فضل باری
اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری

اسی سے ہے قوموں کی یہاں آبرو سب
اسی پر ہیں مغرور میں اور تو سب

ہلائے نہ اگلے اگر دست و بازو
جہاں عطرِ حکمت سے ہوتا نہ خوشبو
نہ اخلاق کی وضع ہوتی ترازو
نہ حق پھیلتا ربع مسکوں میں ہر سُو

حقائق یہ سب غیر معلوم رہتے
خدائی کے اسرار مکتوم رہتے

گلستاں میں جو بن گل و یاسمین کا
سماں زلف سنبل کی تاب و شکن کا
قد دلربا سرو آزاد نا اقرن کا
رخ جاں فزا لالہ و نسترن کا

غریبوں کی محنت سے ہے رنگ و بو سب
کمیروں کے خون سے ہیں یہ تازہ اور سب

جنیں گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ و ایوان
بنیں گر نہ وہ شاد و کشور جو عریاں
جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاندار بے جاں
جو چھانٹیں نہ وہ تو ہو جنگل گلستاں

یہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے
مشقت میں عمران کی کٹتی ہے ساری
نہیں آتی آرام کے ان کی باری
سدا بھاگ دوڑ ان کی رہتی ہے جاری
نہ آندھی میں عاجز نہ مینہ میں ہیں عاری

نہ لُو جیٹھ کی دم تڑاتی ہے ان کا
نہ ٹھر ماگھ کی جی چھڑاتی ہے ان کا

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب و تواں کو
گلاتے ہیں محنت میں جسم و روان کو

سمجھتے نہیں اس میں جاں اپنی جاں کو
وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو

بس اس طرح جینا عادت ہے ان کی
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے ان کی (50)

اس اصول پر حکومت کے لیے ضروری ہے کہ:

(الف) ملک کے بڑے طبقوں یعنی کاشت کار، مزدور اور دماغی محنت کش کو چھوٹی صنعتوں یعنی زمیندار اور سرمایہ دار کی طرح جمہوری گورنمنٹ کے ہر ایک شعبہ میں نمائندگی کا حق ان کی تعداد کے مطابق دے کر اسے محفوظ کر دیا جائے۔

(ب) اقتصادی نظام مستقل طور پر ایسا قائم کیا جائے جو محنت کش طبقہ یعنی کاشتکار، مزدور اور دماغی محنت کش کو قرض و افلاس سے بچانے کا ضامن ہو۔ اور ملک کو ایسے خارجی قرضہ کا محتاج نہ بنائے جس سے سیاسی آزادی سلب ہونے کا خطرہ پیدا ہو سکے (51)۔

محنت کش طبقہ کی حکومت کے قیام کے لیے پارٹی کی تشکیل:

ہندوستان میں مولانا عبیداللہ سندھی نے محنت کش طبقہ کی حکومت کے قیام کے لیے ایک پارٹی تشکیل دی جس کا نام ''مہا بھارت سر دراجیہ پارٹی'' تھا۔ اس کے اصول و مقاصد درج ذیل تھے:

۱۔ ہندوستان کی مکمل آزادی حاصل کرنا۔ ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا۔

۲۔ آزاد ہند کو ملوکیت اور سرمایہ داری سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا اور اسے انسانی سوسائٹی کے لیے ایک نمونہ بنانا۔

۳۔ تمام ہندوستانی اقوام کو نظام توافق (فیڈرل نظام) میں جمع کرنا۔

۴۔ ایشائی اقوام میں امپیراطوری اور سرمایہ داری کے خلاف ایک توافق (سر دراجیہ ایشاٹک فیڈریشن) پیدا کرنا۔

۵۔ اقوام عالم میں مشرق کو اس کا حق دلوانا (52)۔

پارٹی کے مراکز:

مہا بھارت سر دراجیہ پارٹی کا مستقل مرکز دہلی میں ہوگا۔ اس کے ثانوی مراکز میں لاہور اور آگرہ شامل ہیں۔ مہا بھارت کے سروراجیہ پارٹی کے کام آگے بڑھانے کے لیے مہا بھارت سر دراجیہ پارٹی کے کام آگے بڑھانے کے لیے ''سروراجیہ ہند'' اپنے آپ کو موسوم کرے گی۔ سر دراجیہ ہند کو مہا بھارت سروراجیہ پارٹی ایسے ملکوں میں تقسیم کرے گی۔ جہاں ایک قوم آباد ہے۔ جو ایک زبان بولتی ہے۔ جہاں کی معاشرت میں عموماً یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان ممالک میں ہر ایک ملک ''سر دراجیہ'' ملک کہلائے گا۔ ایک ابتدائی تجزیہ کے طور پر م۔س پارٹی سر دراجیہ ہند کو دس سر دراجی ملکوں میں تقسیم کرتی ہے۔

۱۔ بھارت: جس کی زبان ہندوستانی (اردو) ہے۔ اس میں دوآبہ گنگا، جمنا اور لکھنؤ شامل ہیں۔ اس کے مرکز شہر دہلی

اور آگرہ ہیں۔

۲۔ جنوب مشرقی پنجاب: جس کا مرکزی شہر امرت سر ہے۔اور زبانی پنجابی ہے۔

۳۔ شمال مغربی پنجاب: جس کی زبان پوٹھوہاری پنجابی ہے۔مرکزی شہر راولپنڈی ہے۔

۴۔ جنوب مغربی پنجاب: جس میں ریاست بہاولپور داخل ہے۔اس کا مرکزی شہر ملتان ہے اور زبان ملتانی پنجابی ہے۔ لاہور تینوں جمہورتیوں کے نظام سے خارج رہے گا۔

۵۔ کشمیر: جس کی زبان کشمیری ہے اور مرکزی شہر سری نگر ہے۔

۶۔ پختانیہ: (صوبہ سرحد شمال مغربی) جس کی زبان پشتو ہے۔اور مرکزی شہر پشاور ہے۔

۷۔ بلوچستان: جس کی زبان بلوچی ہے اور مرکزی شہر کوئٹہ اور قلات ہیں۔

۸۔ سندھ: جس کی زبان سندھی اور مرکزی شہر کراچی ہے۔

۹۔ گجرات: جس کی زبان گجراتی اور مرکزی شہر احمد آباد ہے۔

۱۰۔ راجپوتانہ: اس کی زبان ہندوستانی (ہندی) ہے اور مرکزی شہر اجمیر ہے۔

(ب) ہر ایک سروراجی ملک مستقبل میں ایک "سروراجی جمہوریہ" ہوگا۔ جو اپنی اقتصادی، تمدنی اور سیاسی آزادی محفوظ رکھتے ہوئے متوافق جمہوریات ہند (انڈین فیڈرل ری پبلکن) کے لیے اکائی بنے گا(53)۔

انقلاب کو منظم کرنے کی حکمت عملی

مہابھارت سروراجیہ پارٹی کے ممبر اور رضا کار:

۱۔ اس پارٹی میں شمولیت کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ نیشنل کانگریس کریڈ کو مانتا ہو۔

۲۔ سروراجیہ پارٹی کے اصول ومقاصد اور پروگرام کو وفاداری سے مانتا ہو۔

۳۔ پارٹی کے انضباطی احکام کی پابندی کا یقین دلائے۔

اپنی ضروریات زندگی اپنے ملک کے متوسط الحال زراعت پیشہ اشخاص سے نہ بڑھائی جائے۔

۴۔ اپنی ضروریات زندگی سے زائد جائیداد اگر رکھتا ہو تو پارٹی کے نام منتقل کردے (جب تک پارٹی ممبروں کی جائیداد کو اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کرے۔اس وقت تک ان ہی ممبروں کے پاس امانت رہے گی)(54)۔

مجالس آمرہ:

جس وقت ایک سروراجی ملک میں کم از کم ۱۰۰ پارٹی ممبر پیدا ہو جائیں گے اور ایک جیش رضا کاراں مرتب ہو جائے گا تو ممبروں اور رضا کاروں کی مشترکہ کانفرنس منعقد ہوگی جسے اس ملک کی "سروراجیہ کانفرنس" کہا جائے گا۔اس کانفرنس میں ان تمام پارٹیوں کے ممبر بطور مشیر شامل ہو سکتے ہیں جن کے سروراجی پارٹی اشتراک عمل کا فیصلہ کر چکی ہے لیکن رائے دینے کا حق پارٹی

ممبروں اور رضا کاروں تک محدود رہے گا۔

سرودراجیہ کانفرنس کے ذمہ دو کام لگائے گئے۔

۱۔ کہ اپنے ملک کے حاجت مند محنت کش طبقہ کا پرانا حق ادا کرے۔ انہیں دوبارہ قرض میں مبتلا ہونے سے بچائے اور جہاں مسلمانوں کا افلاس گاؤکشی کا بند کرنے میں مانع ہو۔ ان کی امداد کرے۔

۲۔ یہ کہ برطانوی قرض ہند جو سیاسی آزادی کو سلب کر رہا ہے۔ اس کا جس قدر حصہ اس ملک پر عائد ہوتا ہے۔ اس کو ایسے قرض میں تبدیل کرے جس میں سیاسی آزادی سلب ہونے کا خطرہ نہ ہو۔

تمام کاموں کی تکمیل کے لیے کانفرنس مختلف صورتوں میں پارٹی فنڈ جمع کرے گی:

۱۔ پارٹی ممبروں کی منقولہ جائیداد اپنے قبضہ میں لے گی۔

۲۔ رضا کاروں سے چندہ لیا کرے گی۔

۳۔ سوشل ریفارموں اور حامیاں انسانیت سے صدقات وصول کرے گی۔

۴۔ ملک کے ہر ایک شخص سے اقتصادی آزادی حاصل کرنے کے لیے ٹیکس آزادی وصول کرے گی۔

۵۔ اولاً اپنے ملک ثانیاً دوسرے سرودراجیہ ملکوں میں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے قرض حاصل کرے گی

ہر سرودراجیہ کانفرنس کا اصل اور اہم کام اپنے ملک کی سرودراجیہ جمہوریہ پیدا کرنا اس لیے وہ محنت کش طبقہ کو سیاسیات کی تعلیم دے گی۔ ان کی تنظیمات اس طرح درست کرے گی کہ وہ اپنے ملک کی حکومت کے ہر شعبے میں اپنی تعداد نفوس کے مطابق نمائندگی حاصل کر سکیں(55)۔

۲۔ سرودراجیہ عاملہ کمیٹی ایک سال کے لیے منتخب ہوا کرے گی اور کانفرنس سال میں دو دفعہ ماہ گل (اپریل) اور ماہ میزان (اکتوبر) منعقد ہوگی۔

کسی پر جو سختی صعوبت ہے ان پر
کسی کو ہو غم و رنج کلفت ہے ان پر
کہیں ہو فلاکت مصیبت ہے ان پر
کہیں آئے آفت قیامت ہے ان پر

۳۔ بوقت ضرورت سرودراجیہ عاملہ کمیٹی کے فیصلہ پر یا تیس ممبروں کی متفق درخواست پر کانفرنس بلائی جا سکتی ہے۔

۴۔ سرودراجیہ عاملہ کمیٹی اپنے خاص کاموں کے لیے چھ ماتحت انجمنیں بنائے گی جن میں کمیٹی پارٹی ممبروں کے ساتھ رضا کار بھی اپنے انتخاب میں شامل کرے گی۔ بوقت ضرورت ان انجمنوں میں پارٹی پروگرام سے ہمدردی رکھنے والے تنخواہ دار اصحاب بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔

اس پارٹی کے ماتحت چلنے والی انجمنیں درج ذیل ہیں:

ا۔ انجمن تنظیم: جوایک ہر پرگنہ تحصیل وضلع میں اپنا دفتر کھولے گی جو

ا: کسان سبھائیں، انجمن مزدوراں، دماغی محنت کش کی محفل اور طالب علموں کی انجمنیں قائم کریں گی۔

ب: پارٹی فنڈ جمع کریں گی۔ جس میں ممبروں کی منتقل شدہ جائیدادیں۔ پارٹی کا قرض، ٹیکس آزادی اور دوتمام مالی امداد داخل ہے۔ جوانسانیت کے ہمدرد اور سوراج کے ہمدرد لوگوں کو ملے (56)۔

۲۔ انجمن نشرواشاعت:

اس کا کام اپنے ملک کی عام زبان میں سرودراجیہ اخبار جاری کرنا۔ پارٹی پروگرام کے متعلق لٹریچر ایک لائبریری میں جمع کرنا۔ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں پارٹی پروگرام بطور نصاب داخل کرانے کی کوشش کرنا۔

۳۔ انجمن انضباط:

اس میں پارٹی ممبروں اور رضا کاروں کے سوا اور کوئی شامل نہیں ہوسکتا۔ پارٹی ممبر اور رضا کار بھرتی کریں گے۔ انضباط کے لیے ہدایات نافذ کریں گے۔ ان کی خدمات کا حساب لیا کریں گے۔ اس انجمن کے احکام ممبروں اور رضا کاروں کے لیے قطعی ہوں گے۔

۴۔ انجمن کوآپریٹو بنک:

اس میں مالیات کے تنخواہ دار ماہر بھی شامل کیے جائیں گے۔ پارٹی فنڈ سے ایک سرودراجیہ کوآپریٹو بنک کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

۵۔ انجمن مجالس وامداد باہمی:

سرودراجیہ بنک سے سرمایہ لے کر سرودراجیہ شرکت ہائے تعاون کھولی جائیں گی جو زراعت، پیداوار اور ضروریات محنت کش طبقہ کی تجارت کریں گی۔ محنت کش طبقہ میں امداد اور قرض بلاسود ان شرکتوں کے توسط سے تقسیم ہوگا (57)۔

۶۔ انجمن محاسبہ دیوان:

جو مقروض محنت کش طبقہ کے پرانے قرض کی ادائیگی اپنے ذمہ لے کر پنچایتی فیصلہ سے رقوم واجب الادا متعین کرے گی۔ جس کو سرودراجیہ بنک اپنے صیغہ جمع صدقات سے ادا کریگا (58)۔

محنت کش انسانوں کی ہمدردی

سرودراجی تخیل کی عظمت

بہت نوع انسان کے غم خوار دیا در

ہواخواہ ملت ہیاندیش کشور

شدائیہ کے دریائے خوں میں شناور

جہاں کے پُرآشوب کشتی کے نگر

ہر قوم کی نیست و نابودان سے ہے یہاں
میں اس انجمن کی نودان سے ہے یہاں

نہ احباب کے تیغ احساں کے گھایل
نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سایل
نہ دکھ درد میں سوئے آرام مایل
نہ دریا کوان کے راستے میں حایل

سنے ہوں کبھی رسم و سام جیسے
غیور اب بھی لاکھوں میں گمنام ویسے
کسی پر چلیں تیرا آماج یہ ہیں
لٹے کوئی رہ گیر تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے
یہ پیاں کو منتوں سے ہیں جڑنے والے
یہ فوج حوادث میں لڑنے والے
یہ غیروں کی ہیں آگ میں لڑنے والے

امنڈ آتا ہے رکنے سے اوران کا دریا
جنوں سے زیادہ ہے کچھ اوران کا سودا

جماتے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ
بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل پھر سمٹتے نہیں یہ
جہاں بڑھ گئے پھر تو گھٹے نہیں یہ

مہم واں کیے سر نہیں بیٹھتے یہ
جب اٹھتے ہیں اٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جوان کو قوت
سماتی ہے دل میں بہت ان کے عظمت
نہیں پھیرتی ان کا منہ کوئی زحمت

نہیں کرتی زیران کو کوئی صعوبت

بھروسے پہ اپنے دل دوست ددیا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے (59)

فکری تربیت:

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے ۱۵ سے ۱۶ برس کی عمر میں اپنا آبائی وطن چھوڑا۔ انہوں نے تمام عمر لوگوں کی فکری تربیت کی اور انہوں نے لوگوں کا ذہن بنایا۔

مولانا سندھی مرحوم نے اپنے پہلے سیاسی پروگرام کے مطابق جو انہی کے الفاظ میں "اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی" کام شروع کیا اور جماعت بنائی تو اس کا پہلا میدان عمل سندھ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے ان کے اس کام کو بہت پسند کیا اور انہیں چند ہدایات دیں۔ بعض اصلاحات کے بعد اس کا تعلق تحریک اتحاد واسلامی سے جوڑ دیا (60)۔

سندھ کے صاحب استعداد نوجوانوں کی فلسفہ ولی اللہی کے مطابق تعلیم وتربیت کا بیڑ ااٹھایا اور سندھ کو افکار ولی اللہی سے منور کرنے اور اسے خطبہ، علوم ومعارف بنادینے کی کوشش کی (61)۔

اجتماعی قومی تنظیم:

سب سے پہلی کتاب مولانا سندھی کے بارے میں سرور صاحب نے لکھی اس کا نام "مولانا عبیداللہ سندھی" ہے۔ یہ کتاب سندھ ساگر اکادمی لاہور نے شائع کی لیکن ۱۹۵۵ء/۱۳۷۵ھ میں اس کی تلخیص ہوئی اور کتاب کا نام "تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی" رکھا گیا۔ اس کتاب کے آغاز کے چند الفاظ جو سرور صاحب نے مولانا سندھی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ نہایت دردناک ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ الفاظ پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ الفاظ درج ذیل ہیں:

"ایک دن مولانا بڑے مغموم تھے۔ فرمانے لگے کہ میں مسلمانوں کو کام کی اور ضرورت کی باتیں کہتا ہوں۔ لیکن وہ نہیں سنتے۔ بلکہ مجھے مطعون کرتے ہیں۔ مجھے دیکھو میں سولہ برس کا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر نکل آیا تھا۔ مانا کہ میرا خاندان بہت بڑا نہ تھا۔ اور نہ ہمارے ہاں دولت کی فراوانی تھی۔ لیکن آخر میری ماں تھی، میری بہنیں تھیں اور ان کی محبت میرے دل میں جاگزین تھی۔ لیکن اسلام سے مجھے اتنی محبت تھی کہ میں کسی محبت کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ماں کو چھوڑنے سے کس قدر مجھے ذہنی کوفت ہوئی (یہ کہتے ہوئے مولانا آبدیدہ ہوگئے) آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: اسلام میں میری شیفتگی کا نتیجہ تھا کہ جو مجھے اسلام کی بات سمجھاتا اور وہ بات میرے دل میں بیٹھ جاتی تو میں اس کا دل وجان سے گرویدہ ہو جاتا (62)۔

سرور صاحب نے ان الفاظ کو اس لیے لکھا کہ مسلمانوں کو اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہیے تا کہ مسلمانوں کی صحیح طور پر تنظیم ہو سکے۔

مولانا اس فکر کے حامی ہیں کہ قرآن مجید پوری انسانیت کی بنیادی فکر کا ترجمان ہے۔اور یہ فکر اپنی فطرت میں آفاقی ہے۔تمام مذہبی اصولوں اور قابل قدر انسانی افکار کا خلاصہ ہے۔مولانا عبید اللہ سندھی کے خیال میں قرآن حکیم اسی بنیادی اور خالص فکر آسانی یا ضمیر انسانی کی نمائندگی کرتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں مولانا سندھی پر یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن کریم کا اصل مدعا اور اصل خالص پاک اور بلند انسانیت کا قیام ہے۔اس مقصد کیلئے جدو جہد کرنا انسانی زندگی کا ایک اعلیٰ ترین مقصد ہے(63)۔

جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کا اساسی پروگرام

انّ ولیّ الله الّذی نزّل الکتاب وھو یتولّی الصّلحین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد رب العالمین وصلی اللّٰہ علی سیّدنا محمد سیّد المرسلین وخاتم النبیین وعلی اٰله واصحابه واتباعه من ائمة الدین وعباد اللّٰہ الصالحین وبارك وسلم. امّا بعد.

آج ہم نے خدا کا نام لے کر اور اسی کی مدد پر اعتماد کر کے شمال مغربی ہند کی نئی سیاسی جماعت، جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے پہلے حصّہ کا کام سندھ میں شروع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔

پارٹی کے چند اساسی قواعد ہم نے ضبط کر لیے ہیں تا کہ خواص کو دعوت دینے میں آسانی ہو۔ ان میں سے اکثر وہی باتیں ہیں جو سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک علومِ متعارفہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کی مزید تشریح کی اس مقدمہ میں ضرورت نہیں۔ البتہ پارٹی کے میدانِ عمل کو محدود کرنے کا مسئلہ قابلِ ایضاح ہے۔

جس متبصر کو گذشتہ تیس برس کی تاریخ پیشِ نظر ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تقدم اتنا مشکل نہیں جیسا کہ اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ کھیل جب کبھی بن کر بگڑتا ہے تو اس کی تہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعثِ نقصان نظر آتا ہے۔

اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے متفرق طور پر سیاسی نظریات بنائے گئے مگر عملاً ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کا منظر سامنے نظر آتا ہے۔

ہم نے عملی اشتراک کے ساتھ فکری اتحاد کا ضمیمہ بھی لگا دیا ہے۔ اس طرح ایک نیا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے ایک ایسا قطعہ انتخاب کیا ہے جو دونوں تہذیبوں کا مرکز ہے (64)۔

جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے۔ اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم الشان قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے۔ ان کی تالیفِ قلوب پر قادر ہو سکے تو اس لاینحل مشکل کی کلید مل جائے گی۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکماء کا ایک طائفہ نیوفلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے جن میں سے الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہورِ عالم ہیں۔

ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے صوفیہ کرام کی آمد شروع ہوئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس خاک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفتِ الٰہی میں کامل خادمِ انسانیت پیدا ہوئے۔ وہ سب اسی حکمتِ اشراقی کے امام تھے۔ مگر ایسا عالم جو اپنے انکشافات اور نظریات کی تدوین و تنظیم پر قادر ہو، امام ولی اللہ دہلوی جیسا پیدا نہیں ہوا۔

ان تمام ائمہ تصوف کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے، جو ویدانت فلاسفی کا اصل اصول ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی کی

تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی اور اسے کتاب و سنت کا بطن بنایا۔ جیسا کہ ان کی معرکتہ الآ راء کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور ان کی فلسفی تصانیف البدور البازغہ اور التفہیمات الالٰہیہ وغیرہ سے واضح ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر دونوں مذاہب کے خدام انسانیت اسی فلاسفی کو امام بنا کر تقدم کی جدو جہد میں مصروف ہو جائیں تو ہند ایک دفعہ پھر مجمع البحرین بن کر دنیا کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

ہمارے پرانے رفقاء میں سے اگر کوئی بزرگ ہمارا نیا انداز دیکھ کر چین بجبیں ہوں تو ان کی خدمت میں مختصراً عرض ہے۔

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

فقط ہمارا اصلی مخاطب ہندوستانی نوجوان ہے

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانانِ سعادت مند پند پیر دانا را

خلاصہ کلام

اگر کسی معاشرے کو ایک شخص مان لیا جائے تو سیاست اس کے اجزاء کو آپس میں مربوط کر کے اس کے ڈھانچے کو قائم رکھتی ہے۔ اقتصادیات اسے نشو ونما پہنچاتی ہے اور فلسفہ اس کی معنوی زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔ لیکن اس معاشرے کی فوجی اور سیاسی شکست کے بعد اس میں اقتصادی بدحالی بھی پیدا کر دی جائے لیکن فکری نظام قائم رہے تو بھی وہ پہلے سے زیادہ محنت کر کے اپنی اقتصادی حالت کی اصلاح اور اپنی سیاسی کمزوری کا مداوا کر سکتا ہے اور اگر سیاسی طاقت اور اقتصادی نظام کے ساتھ ہی اس معاشرہ کا فکری نظام بھی ٹوٹ جائے۔ تو پھر معاشرہ کا زندہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسلام جن ملکوں میں اپنی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں داخل ہوا۔ ان ملکوں میں ایران، افغانستان، ترکستان، مصر، شام وغیرہ میں اصل مذہب کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا۔ اب ان ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی طاقت اسلام ہی کی خدمت میں استعمال ہو رہی ہے۔

اسلام میں کسی قوم کا نظام فکر، اس کے فلسفہ حیات پر مشتمل ہوتا ہے، وہ اس کے افکار میں سے تعارض دور کر کے وحدت فکری پیدا کر دیتا ہے جس سے معاشرے میں وحدت عمل ظاہر ہوتی ہے۔ یہ فکر و عمل کی وحدت ہی اس معاشرے کی نشو ونما اور قوت کا موجد بنتی ہے۔ اس کے برخلاف جس معاشرے میں وحدتِ فکری نہ ہو، اس میں انتشارِ عمل پیدا ہو جاتا ہے اور اندرونی اختلافات اس کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے انقلاب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کیا جائے کیونکہ ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے کے لیے بار بار کوششیں کی گئیں۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ مسئلہ کی اہمیت و اصلیت پر غور نہیں کیا جاتا۔ مولانا سندھی اپنے مقالہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ان کے اندر (ہندو اور مسلمانوں) میں باہمی اختلافات ہیں۔ مسلمانوں میں قومی سوال موجود ہے تو ہندوؤں میں یہ مسئلہ پایا جاتا ہے۔ ان قومی اختلافات کو مذہبی یگانگت بھی نہیں مٹا سکتی۔ مسلمانوں میں پنجابی، سندھی، پٹھان، کشمیری اور بلوچی کا قومی سوال موجود ہے۔ جبکہ ہندوؤں میں بنگالی، مدراسی، مرہٹی، گجراتی و دراوڑی کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مولانا عبید اللہ سندھی نے محنت کش طبقہ کی حکومت کے قیام کے لیے ایک پارٹی تشکیل دی جس کا نام ''مہا بھارت سرو راجیہ پارٹی'' تھا۔ اس کے اصول و مقاصد درج ذیل تھے:

۱۔ ہندوستان کی مکمل آزادی حاصل کرنا۔ ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا۔

۲۔ آزاد ہند کو ملوکیت اور سرمایہ داری سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا اور اسے انسانی سوسائٹی کے لیے ایک نمونہ بنانا۔

۳۔ تمام ہندوستانی اقوام کو نظام توافق (فیڈرل نظام) میں جمع کرنا۔

۴۔ ایشائی اقوام میں امپیریلزم اور سرمایہ داری کے خلاف ایک توافق (سرو راجیہ ایشیاٹک فیڈریشن) پیدا کرنا۔

۵۔ اقوامِ عالم میں مشرق کو اس کا حق دلوانا۔

مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے ۱۵ سے ۱۶ برس کی عمر میں اپنا آبائی وطن چھوڑا۔ انہوں نے تمام عمر لوگوں کی فکری تربیت کی اور انہوں نے لوگوں کا ذہن بنایا۔

مولانا سندھی مرحوم نے اپنے پہلے سیاسی پروگرام کے مطابق جو انہی کے الفاظ میں ''اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی'' کام شروع کیا اور جماعت بنائی تو اس کا پہلا میدان عمل سندھ تھا۔ حضرت شیخ الہند نے ان کے اس کام کو بہت پسند کیا اور انہیں چند ہدایات دیں۔ بعض اصلاحات کے بعد اس کا تعلق تحریک اتحاد واسلامی سے جوڑ دیا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی تمام زندگی اسلام اور انسانیت کے کاز (Cause) کے لیے وقف کر دی۔ مولانا نے انسانی وحدت پر زور دیا۔ جبکہ ہم مغربی طرزِ زندگی کو دیکھتے ہیں تو اس کی بنیاد ترک مذہب اور بے مہار طلب آزادی پر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مغربی طرزِ زندگی اپنے نقطہ عروج پر پہنچ کر زوال پذیر ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی نے حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر کو بڑھایا ہے اور اپنے انقلاب کے لیے انہیں کا فلسفہ وفکر کی دعوت دی ہے۔

حوالہ جات

1- مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے علوم و افکار، مولانا صوفی عبدالحمید سواتی، ادارہ نشر اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، ص ۳۶۲۔

2- ایضاً، ص ۳۶۳۔

3- ایضاً۔

4- ایضاً، ص ۳۶۸۔

5- ایضاً، ص ۳۷۰۔

6- ایضاً، ص ۳۷۱۔

7- ایضاً، ص ۳۷۴۔

8- ایضاً، ص ۳۷۵۔

9- ایضاً، ص ۳۷۸۔

10- ایضاً، ص ۲۶۵۔

11- محمد سرور، مولانا عبید اللہ سندھی حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۳۶۶۔

12- ایضاً

13- ڈاکٹر ابوسلمان سندھی، مقالات مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۶۔

14- ایضاً، ص ۳۸۔

15- عبدالحمید سواتی، مولانا عبید اللہ سندھی کے علوم و افکار، ادارہ نشر و اشاعت، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، ۱۹۹۰ء، ص ۳۶۔

16- شاہ ولی اللہ اور ان کا نظریہ انقلاب، مولانا سندھی، طیب پبلشرز لاہور، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۔

17- ایضاً، ص ۲۰۔

18- ایضاً۔

19- ایضاً، ص ۲۳۔

20- محمد سرور، مولانا عبید اللہ سندھی، حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، ص ۵۱۔

21- ایضاً، ص ۵۵۔

22- ایضاً، ص ۶۲۔

23- شاہ ولی اللہ اور ان کا نظریہ انقلاب، مولانا سندھی، طیب پبلشرز لاہور، اکتوبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۔

24- ایضاً، ص ۱۴۔

25- ایضاً، ص ۱۸۔

26- ایضاً، ص ۱۹۔

27- عبید اللہ سندھی، مولانا، قرآنی فکر انقلاب، مکتبہ حنفیہ، اردو بازار گوجرانوالہ، ص ۵۔

28- عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی فکر انقلاب، مکتبہ حنفیہ، اردو بازار گوجرانوالہ، ص٦۔

29- ایضاً، ص٦۔

30- ایضاً۔

31- عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی دستور انقلاب، ادارہ نشریات اسلام، اردو بازار لاہور، ص١٥-١٦۔

32- ظفر حسن، آپ بیتی، منصور بک ہاؤس لاہور، ص٥٣، ت،ن۔

33- ایضاً۔

34- مولانا عبیداللہ سندھی، کابل میں سات سال، مرتبہ محمد سرور، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور ١٩٧٦ء، ص١٣٩۔

35- ظفر حسن، آپ بیتی، ص٨٨۔

36- دیباچہ سوراجیہ پروگرام بحوالہ رسالہ تاریخ وسیاست، کراچی، فروری ١٩٥٤ء، ص١٦۔

37- محمد سلیم، مولانا عبیداللہ کے سیاسی مکتوبات، ندوۃ المصنفین، لاہور، ١٩٥٥ء، ص٥٨۔

38- رسالہ تاریخ وسیاست، کراچی، فروری ١٩٥٤ء، ص١١۔

39- مولانا عبیداللہ کے سیاسی مکتوبات، ص٦١۔

40- ایضاً، ص٦٠۔

41- Jewehar lal Nehru, An Autohiography John Lane, London 1936, page 151.

42- مولانا سندھی کے سیاسی مکتوبات، ص٦١۔

43- ظفر حسن کی آپ بیتی، ص١١٦۔

44- رسالہ الولی، حیدرآباد سندھ، اکتوبر ١٩٧٧ء، ص٤۔

45- فاؤنڈیشن آف پاکستان، ص١٥٩۔

46- محمد فرید الحق، اقبال، جہان دیگر، کراچی، ص١١٤-١١٥، ١٩٨٣ء۔

47- ایضاً۔

48- مقالات مولانا عبیداللہ سندھی سیمینار کراچی، مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان سندھی شاہجہان پوری، مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی، کراچی ١٩٩٤ء، ص١٢٨۔

49- محمد سرور، خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ١٩٨٧ء، ص٢٥٦۔

50- ایضاً، ص٢٥٧۔

51- ایضاً، ص٢٦١۔

52- عبدالخالق آزاد، مرتب خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، دارالتحقیق والاشاعت، فرسٹ فلور، کمرہ نمبر ١٢، کوئینز سنٹر شارع فاطمہ جناح لاہور، ص١٥٢۔

53- ایضاً، ص١٥٦۔

54- ایضاً۔

55- محمد سرور، خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۶۸۔

56- ایضاً، ص ۲۶۹۔

57- عبدالخالق آزاد، مرتب خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، دارالتحقیق والاشاعت، فرسٹ فلور، کمرہ نمبر ۱۳، کوئینز سنٹر شارع فاطمہ جناح لاہور، ص ۱۶۱۔

58- ایضاً، ص ۱۶۳۔

59- محمد سرور، خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۲۵۹۔

60- ڈاکٹر ابوسلمان سندھی، مقالات (مولانا عبیداللہ سندھی کی خدمات)، مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۶۔

61- ایضاً، ص ۱۲۹۔

62- ایضاً، ص ۱۵۲۔

63- ڈاکٹر ابوسلمان سندھی، مقالات مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۶۔

64- محمد سرور، خطبات ومقالات مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور۔

باب ششم

سید جمال الدین افغانی

اور

مولانا عبید اللہ سندھی

کے تصور انقلاب کا تقابلی جائزہ

تعارف

اس باب میں سید جمال الدین افغانی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے تصور انقلاب کا تقابلی جائزہ شامل تحقیق ہے۔
پہلی فصل میں مذہبی نظریات، دوسری فصل میں سیاسی نظریات، تیسری فصل میں معاشی نظریات اور چوتھی فصل میں معاشرتی نظریات کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

فصل اوّل:

سید جمال الدین افغانی و مولانا عبید اللہ سندھی کے تصورِ انقلاب کا تقابلی جائزہ

اس عظیم مقصد اور مشرق کے مخصوص سیاسی حالات نے جمال الدین افغانی جیسے جذباتی اور حساس شخص کے لیے سرگرمی و جدوجہد اور قوتِ عمل کا کوئی اور دوسرا میدان باقی نہیں چھوڑا اور وہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں کوئی ایجابی خدمت انجام نہ دے سکے۔ ان کو مغربی تہذیب کے گہرے اور تفصیلی مطالعہ، آزادانہ تحلیل و تجزیہ کے عمل کو مکمل کرنے اور اس کی روشنی میں ایک ایسا نظام مکتب فکر تیار کرنے کا موقع نہیں ملا جو بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ چل سکے اور مشرق کے طاقتور تقلیدی رجحان پر غالب آسکے۔

لیکن جدید تعلیم یافتہ اور ذہین مسلمان نسل کی نگاہوں میں وہ نہایت بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ ان چند افراد میں ہیں جنہوں نے جدید اسلامی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان کی عظمت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مصر کے تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کو الحاد و لادینیت کے آغوش میں جانے کے کام میں مزاحمت کی۔

تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے ذہنی و علمی اثرات اور اس کی طرف سے اجمالی عقیدت کے باقی رہنے میں ان کی تحریروں اور ان کے اثرات کا ضرور دخل ہے۔ بروکلمان نے صحیح کہا ہے کہ:

"مصر کی روحانی زندگی پر پہلے بھی اسلام کی حکمرانی تھی اب تک بھی یہی حال ہے۔ یہ زیادہ تر ایک ایرانی جمال الدین کے باعث ہے جنہوں نے سیاسی وجوہ سے اس بات کو ترجیح دی کہ اپنے آپ کو اس ملک کی طرف منسوب کر کے جہاں اپنی جوانی گزاری تھی، افغانی بتائیں (1)۔

مذہبی نظریات

نظریہ توحید:

جس طرح خدا کا قانون تمام کائنات میں جاری ہے اور کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔ ایسے ہی اس کا قانون قرآنِ حکیم۔۔۔ انسانی معاشرے میں جاری کیا جائے اور تمام مصنوعی "خداؤں" کی "خدائی" ختم کر دی جائے اور بندگی صرف خدا کی کی جائے یعنی انسان اپنے آپ کو اپنے تمام اعمال و افعال اور خیالات میں خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے۔ اس میں لوگوں کے دکھاوے یا حاکم کے فیصلے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ فیصلہ خود ہر ایک انسان کو اپنے دل کے اندر کرنا ہوگا۔ جب تک انسان کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ میرا یہ کام خدا کے سامنے پیش ہوگا تو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اس وقت تک وہ اس کام کو اچھا نہ سمجھے یہ ہے خدا کی بندگی۔ اس طرح جوابدہ سمجھنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی ساری نوع کی یکساں خدمت کر سکے گا کیونکہ وہ حقیقت میں اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی اس تجلی کے حوالے کر دے گا جو انسانیت کے قلب پر پڑتی ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے تمام نوعِ انسان کی ہمدردی اور خدمت کرنی ہوگی (2)

ایمان باللہ کی سب سے اونچی منزل یہ ہے کہ آدمی یہ مانے کہ اس زمین اور آسمان میں اگر کوئی وجود حقیقی ہے تو اسی کا ہے۔ جو کچھ ہے سب اسی کا فیضان ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کا اصلی سبب وہی ہے۔ ایمان باللہ یا خدا پرستی کی ایک منزل انسانیت دوستی کی ہے اگر آدمی یہ مانتا ہے کہ سارے انسان اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور اس کو ان انسانوں کے خالق سے حقیقی محبت ہے تو لازمی ہے کہ اسے اس کی مخلوق سے بھی محبت ہو اور اگر اسے اس مخلوق سے محبت نہیں تو یہ سمجھ لو کہ وہ خدا کی محبت کے دعویٰ میں سچا نہیں۔ خدا پرستی کی پہچان اس دنیا میں تو یہی ہے کہ خدا پرست انسان کی خدمت اور اس کی بہبودی میں ڈھونڈے (3)۔

ہمارے صوفیائے کرام نے تو خدا پرستی کی اس عملی شکل یعنی انسانیت دوستی کو اصل دین قرار دیا تھا۔ ان کا تو یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ جسے صرف اپنے گروہ اور جماعت سے محبت ہے اور وہ دوسروں کو جو اس کے ہم عقیدہ نہیں، نفرت سے دیکھتا ہے۔ وہ اچھا موحد اور خدا پرست ہی نہیں۔ وہ اپنی تعلیمات میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ تمام انسانوں کو عیال اللہ سمجھو۔ اور ان کا خود اپنا عمل بھی اس کا شاہد تھا لیکن اس سے نہ خیال ہو کہ انہوں نے صواب و ناصواب اور ثواب و گناہ کی تمیز اٹھا دی تھی۔ بے شک وہ نیکوکار کو اچھا سمجھتے تھے۔ لیکن غلط کار کا انہیں اس نیکوکار سے زیادہ خیال رہتا تھا اور جس طرح ماں اپنے نافرماں بچے کے لیے زیادہ کڑھتی ہے اور اس کا اسے دوسروں سے زیادہ خیال ہوتا ہے اسی طرح غلط کار کو سیدھے راستہ پر لگانے کے لیے یہ خدا پرست بزرگ بے قرار رہتے تھے۔ آپ ﷺ کو ہر نعمت میسر تھی اور گھر کے اندر اور گھر کے باہر سب قسم کا اطمینان حاصل تھا لیکن دوسروں کا دکھ اور ان کی گمراہی تھی کہ آپ کو بے چین کیے دیتی۔ چنانچہ وہ مکہ میں اپنا پیغام سناتے پھرتے ہیں طائف والوں کو جا کر حق کی دعوت دیتے ہیں سختیاں ہوتی ہیں تو صبر کرتے ہیں اور جو سختیاں کراتے ہیں ان کے لیے بددعا نہیں بلکہ دعا کرتے ہیں خدا پرستی جس سے مقصود یہ تھا کہ انسان کے دل میں مجموعی انسانیت کے لیے وسعت پیدا ہو جائے اتنی مسخ ہوئی کہ خدا پرستی کے مدعی کے دل میں اپنی ذات کے سوا کسی اور کی سمائی مشکل ہو گئی (4)۔

سید جمال الدین افغانی کے مطابق بزدلی کے علاوہ ایک وہم ہے جو قوموں کو غلامی کی زنجیروں کو جکڑ دیتا ہے اور بغیر جنگ کیے لوگوں کو سرتسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کمزور کو قوی، قریب کو دور، امن کو خوف اور جائے پناہ کو ہلاکت گاہ کی شکل میں دکھانا وہم کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ سید جمال الدین افغانی وہم کے بارے ایک کہاوت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اصطخر میں ایک طلسم خانہ تھا جو مسافر اس طلسم خانے کے ساتھ رات بسر کرتا وہ موت کا شکار ہو جاتا اور صبح اس کی لاش ملتی تھی۔ اس کے جسم پر کسی چوٹ یا زخم کا نشان نہیں ہوتا تھا لوگ اس بات سے بہت خوفزدہ تھے اتفاقاً ایک شخص جس نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی، طلسم خانہ پر پہنچا اسے نہایت ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں۔ چونکہ وہ جان دینے کے لیے گیا تھا اس لیے وہ نہ ڈرا اور صبح تک ٹھیک ٹھاک رہا۔ صبح اس کو وہاں سے بہت سی دولت ملی، بعد میں پتہ چلا کہ لوگ ان آوازوں سے سہم جاتے اور ڈر کر مر جاتے۔ سید جمال الدین افغانی نے اس مثال کے بعد یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دوسری قوموں کا رعب اسی طرح مسلط رہتا ہے اور بالخصوص مسلم ممالک کا انگریزوں سے خوفزدہ ہونا اصطخر کے طلسم خانے کے وہم سے کم نہیں۔

نظریہ جہاد

سید جمال الدین افغانی کا کہنا ہے کہ حق کی راہ میں قدم بڑھانا اور حق کا بول بالا کرنے کے لیے جان ومال کو قربان کر دینا مومن کی پہلی علامت ہے۔ عدل الہی کو پھیلاتے اور کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لیے جاں نثاری کو قرآن کریم نے بنیادی رکن قرار دیا ہے۔ اسی لیے وہ ایک مضمون بزدلی کی مذمت یوں بیان کرتے ہیں۔

بزدلی ایک جال ہے جو نفوس انسانی کو شکار کرنے اور قوموں کو فنا کر جانے کے لیے حوادث زمانہ نے پھیلا رکھا ہے۔ جس میں شیطان اللہ کے بندوں کا پھانس کر راہ الہی سے روکنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہی ہر کمینگی اور بری خصلت کی جڑ ہے۔ کوئی بدبختی نہیں جو بزدلی سے شروع نہ ہوتی ہو۔ کوئی خرابی نہیں جس کے جراثیم اس میں موجود نہ ہوں۔ کوئی کفر نہیں جس کے لیے یہ سبب اور علت کا کام نہ کرتی ہو۔ اسی جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔۔۔۔ بزدلی ننگ ہے۔ عار ہے۔ ہر انسان فطرت کے لیے عموماً اور ان لوگوں کے لیے خصوصاً جو اللہ اور اس کے رسولوں اور روز جزا پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں اجر حسن اور مقام کریم کو حاصل کرنے کے امیدوار ہیں۔

جہاد کے لیے سید جمال الدین افغانی فوجوں کے جمع کرنے اور انہیں آلات جنگ میں لیس کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں وہ ملک کو مدافعت کے لیے فوج اور سامان جنگ جمع کرنے کو والیان حکومت کے لیے لازمی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ اپنے ملک کو ہلاکت کا لقمہ بنائیں گے اور اپنے آپ کو خطرات میں دھکیل دیں گے۔ سید جمال الدین افغانی قرآن مجید کا حوالہ دیتے ہیں کہ **غدو لهم ما استطعم من قوة**۔ اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے ہر وہ حربہ تیار رکھو جو تمہارے بس میں ہو۔ سید جمال الدین افغانی کے مطابق **ما استطعتم** میں سامان جنگ کے انواع واقسام ومقدار کا کوئی تعین نہیں ہے۔ اس لیے زمانے کے تقاضے اور خطرناک دشمنوں کے حالات کے مطابق اسلحات کا فراہم کرنا فرض ہے۔ اس لیے وہ جدید اسلحات کا نہ صرف حاصل کرنے بلکہ ان کے ایجادات کی ضرورت پر بہت زور دیتے ہیں۔

مولانا سندھی کا نظریہ جہاد یہ ہے وہ کہتے ہیں: اکثر حق کے لیے جہاد کرتے میں اپنوں سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اور بسا اوقات تو کشت وخون تک نوبت پہنچتی ہے لیکن یہ کشت وخون انسان دوستی کے منافی نہیں ہوتا۔ آپ کے خیال میں انقلابی کو اپنے اوپر بڑا اعتماد ہوتا ہے۔ وہ نہ دوسروں کے عائد کردہ خدا کو مانتا ہے نہ ان کے اخلاق کے ٹھونسے ہوئے معیاروں کو وہ سماج کا انکار کرتا ہے۔ حکومت کا انکار کرتا ہے۔ ماں باپ کے کہنے کو نہیں مانتا۔ دوستوں اور عزیزوں کا انکار کرتا ہے۔ لیکن اگر مانتا ہے تو صرف اس بات کو جسے وہ خود حق سمجھتا ہے اور وہ اس حق کو جس پر اسے یقین ہوتا ہے۔ اٹل اور قطعی جانتا ہے۔ یہ عزم اور یہ ارادہ زندگی میں بڑی چیز ہے اور دراصل ہمارا اعتماد علی اللہ اسی اعتماد علی النفس کا حاصل ہے مولانا فرماتے ہیں کہ روس جانے سے پہلے گو میں اس حقیقت کا شعور رکھتا تھا لیکن اس کو کبھی زبان پر نہ لاتا تھا، پر اب میں اسے برملا کہتا ہوں آپ نے ایک دفعہ کہا کہ میرے نزدیک ایک انقلابی ہزار غیر انقلابیوں پر بھاری ہوتا ہے (5)۔

مولانا کے نزدیک انقلاب کا جذبہ ہی فرد کی خودی کو بیدار کرتا ہے اور جب انسان کی خودی بیدار ہو جائے تو وہ بلا خوف د

خطر زندگی کی کش مکشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے وہ فرسودہ اور بےکارہ ستوروں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے اور زندگی کی نئی طرح ڈال دیتا ہے یعنی عمل کا مظہر اتم ذوق انقلاب نے روسی اشتراکیوں میں اتنی ہمت اور جرات پیدا کر دی تھی کہ انہوں نے زار کی زبردست حکومت کے پرخچے اڑا دیے اور روس میں ایسا نظام قائم کیا جس کی ساری دنیا مخالف تھی اور بڑی بڑی سلطنتیں اس کی تباہی کرنے کے درپے تھیں لیکن انقلاب کا ولولہ رکھنے والوں نے کسی کی پروانہ کی اور اپنے عزم ویقین پر برابر ثابت قدم رہے (6)۔

مولانا کے نزدیک انقلاب ہی کائنات کا پیغام ہے اور زندگی میں نمو، حرکت اور ارتقاء اسی جذبہ انقلاب کے رہین منت ہے جس طرح ولانا کی خود اپنی زندگی ایک نصب العین کے لیے ان تھک اور مسلسل جدوجہد میں گزری ہے اور اس راہ میں انہوں نے کہیں قیام اور قرار گوارا نہیں کیا اسی طرح وہ کائنات کے متعلق بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس میں پیہم کش مکش جاری ہے اور ازل سے ابد تک چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی برابر دست وگریبان رہے گا۔ زندگی میں ہر ہر لحہ انقلاب کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ فرد کا لحظہ بہ لحظہ خوب سے خوب تر کی تلاش کرنا اسی انقلاب کا فیضان ہے۔ جماعتیں ولولہ انقلاب کھو بیٹھیں تو زندگی سے محروم ہو جاتی ہیں اور اگر ان میں کش مکش انقلاب رہے تو زندہ اور پائندہ رہتی ہیں (7)۔

مولانا کسی ایسی زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے جس میں انقلاب کا جذبہ سرد پڑ گیا ہو اگر کسی فرد، جماعت یا قوم کو یہ مرض لاحق ہو جائے تو مولانا کے نزدیک ان کو زندوں میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ بے عزتی کی زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اک حدیث ہے کہ اس قوم نے جہاد کو چھوڑ دیا وہ ذلیل و برباد ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں کسی قوم کا باعزت اور بااقبال ہونا صرف اس بنا پر ہوتا ہے کہ اس قوم میں جہاد کی روح سرگرم عمل ہے (8)۔

فصل دوم

سیاسی نظریات

سید جمال الدین افغانی کے سیاسی نظریات کا جائزہ لینے سے قبل یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ان کا زمانہ مسلمانوں کے ادبار کا بدترین عہد تھا۔ ویسے تو بہت سی اسلامی حکومتیں قائم تھیں لیکن ان میں سے اکثر کے تعلقات صحیح نہیں تھے اور باقی ماندہ ملکوں کو دوسرے ممالک سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

سید جمال الدین افغانی کا پین اسلام ازم اور اسلامی عالمی حکومت کا تصور یہ ہے کہ تمام مسلمان اقوام ایک حکومت اسلام کے ماتحت متحدہ ہو جائیں اور ان سب پر ایک خلیفۃ المسلمین کا قطعی اور کلی اقتدار ہو۔ اس طرح اسلام کے پرافتخار دور میں ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں اسلام کی متحدہ طاقت متواتر اختلافات اور نزعات سے منتشر ہوگئی۔ اور مسلمان حکومتیں جہالت اور بے بسی میں غرق ہو کر مغربیوں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوگئیں۔ اس طرح جمال الدین افغانی پوری ملت اسلامیہ کو ایک جھنڈے اور ایک امیر کے ماتحت متحد کر کے مسلمانوں کو ایک متحدہ قوت دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اتحاد ایک بہت بڑی طاقت ہے جو کسی بھی قوم کے عروج و زوال کا باعث بنتی ہے۔ اور جب کسی قوم میں مکمل اتحاد و اتفاق ہوتا ہے تو اس کا تاب اقبال نہایت بلندی پر پوری آب و تاب سے چمک رہا ہوتا ہے جیسا کہ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں ہوا کہ وہ عرب سے اٹھے اور پوری دنیا پر چھا گئے۔

سید صاحب کے دور میں چونکہ مسلمان مختلف علاقوں میں آباد تھے۔ اگرچہ ترکی میں سلطنت عثمانیہ قائم تھی۔ خطہ عرب افریقہ، مشرقی یورپ، ترکی وسط ایشیا کے بہت سارے علاقے ان کے زیرنگین تھے اور وہ خلافت اسلامیہ کہلاتی تھی۔

ایران میں مسلمانوں کی ایک الگ حکومت تھی۔ افغانستان میں مسلمانوں کی علیحدہ حکومت تھی اور برصغیر پاک و ہند جہاں پر مسلمانوں نے بارہ سو سال تک حکومت کی تھی۔ ان کی ایک قابل قدر افرادی قوت وہاں پر موجود تھی وہ انگریز کے ہاتھوں اپنے اقتدار گنوا بیٹھے تھے اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

سید جمال الدین افغانی مسلمانوں کی ان تمام منتشر قوتوں کو اکٹھا کر کے ایک مرکز کے تحت لانا چاہتے تھے اور وہ عالم اسلام کے مسلمانوں کی ایک حکومت بنانا چاہتے تھے۔ جو ایک مسلمان حکمران کے ماتحت ہو اور خلافت راشدہ اس کا منبع ہو۔ یعنی وہ شورائی یا جمہوری نظام کے تحت چلے اور اس کے تمام قوانین کتاب و سنت سے ماخوذ ہوں۔

پان اسلام ازم اور عصر حاضر

اس وقت سیاسی صورت حال کچھ اس طرح تھی کہ عرب اس اتحاد کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے کیونکہ وہ عثمانیوں سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھے اور بدقسمتی سے عثمانی عربوں کی مشکلات نہیں سمجھ رہے تھے بالآخر اس وقت کے حالات عربوں اور ترکوں کی درمیان جنگ کی صورت اختیار کر گئے اس جنگ نے اسلامی اہمیت کے حامل مقامات پر سامراجی طاقتوں کے قبضہ کا راستہ صاف کر دیا۔ عرب عثمانی سلطنت سے خوش نہیں تھے لیکن ہندوستان کے مسلمان اس نظریہ

(پین اسلام ازم) سے سرشار تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ۱۹۱۷ء میں ترکوں کی حمایت میں جو تحریک خلافت چلائی تھی وہ اتحاد عالم اسلام سے ان کی وابستگی کا اظہار تھا اور جہاں تک عربوں کا تعلق ہے جب انہیں داخلی مسائل سے فرصت ملی تو انہوں نے اپنی توجہ پہلے عرب اتحاد اور اس کے بعد مسلم اتحاد پر کی۔ شاہ عبدالعزیز نے سعودی عرب میں اپنی حکومت قائم کر کے ملک کو بدامنی ولاقانونیت سے نجات دلائی اور مسلم اتحاد کی طرف توجہ دی۔ سید جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کو قرآن مجید کے نام پر اتحاد کی اپیل کی تھی۔ ابن سعود پہلے شخص تھے جنہوں نے پین اسلام ازم کے روحانی پہلو کیطرف مسلمانوں کی توجہ دلائی۔ ابن سعود نے اس اہم ترین پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ اتحاد بین المسلمین جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ جل جلالہ سے محبت اس کی وحدانیت پر ایمان کامل اور اس سے مخلصانہ لگاؤ کی بناء پر مسلمانوں کو یکجا کیا جائے (9)

جمال الدین افغانی دنیائے اسلام میں اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہتے تھے انہوں نے ایک ہفت روزہ رسالہ "العروۃ الوثقی" عربی میں پیرس سے نکالا جس کا مقصد تھا کہ مسلم اقوام مغرب کے استعمار اور استحصال کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کریں۔ یہ رسالہ برطانیہ کی حکمت عملی کے خلاف تھا۔ اس لیے مصر و ہندوستان میں اس کی درآمد بند کردی گئی۔ اسی طرح اسلامی اتحاد کے لیے انہوں نے مکہ معظمہ میں ایک انجمن "ام القریٰ" کے نام سے قائم کی جسے ایک ہی سال میں اس وقت کے خلیفہ عبدالحمید نے بند کروادیا۔ افغانی بیک وقت ادیب، خطیب، صحافی اور سب سے بڑھ کر سیاست دان تھے وہ مکہ معظمہ کو اسلام کا مرکز خیال کرتے تھے۔ ان کی اسلامی تعلیمات اور اسلامی علوم میں گہرے بصیرت اور ان کی شخصیت کی ژرف نگاہی ان کی وسیع النظری جو ان کے انسان اور انسانی معاشرے کو سمجھنے کی وجہ سے ظہور میں آئی۔ ایسی صفات تھیں جو انہیں اسلام کے ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک زندہ تابندہ رشتہ بنا دیتی ہیں۔

سیاسی انقلاب

افغانی کی تمام کوششوں اور مسلسل جدوجہد کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلم اقوام ایک حکومت اسلامی کے ماتحت متحد ہو جائیں اور ان سب پر ایک خلیفۃ المسلمین کا قطعی اور کلی اثر واقتدار ہو جس طرح اسلام کے پر افتخار دور میں ہوتا تھا بعد میں اسلام کی متحدہ طاقت متواتر اختلافات اور نزاعات سے منتشر ہوگئی اور مسلمان ممالک جہالت اور بے بسی میں مبتلا ہو کر مغربی استعمار کے تسلط کا شکار ہوگئے افغانی نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جو ذریعہ منتخب کیا وہ سیاسی انقلاب تھا ان کے خیال میں مسلمان قوموں کے لیے، اس آزادی کی خاطر جو انہیں اپنے حالات درست کرنے کے لیے ضروری ہے یہی ذریعہ سب سے زیادہ زندگی میں ہی دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے طریقہ کار میں بیک وقت سیاسی انقلابیوں اور علماء کو اپنا ہم خیال بنایا اور اسی سلسلے میں مقامی قومیت اور اتحاد اسلامی دونوں کو اہمیت دی۔ انہوں نے ایران میں ایک سیاسی مقتدر کی حیثیت سے، مصر اور ترکی میں ایک معلم کی حیثیت سے اور یورپ اور ہندوستان میں ایک نیم انقلابی کی حیثیت سے مسلمانوں کی ذہنی اصلاح کی تدابیر اختیار کیں جسے وہ مغربی استعمار کے خلاف کامیابی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔

جمال الدین افغانی کی سرگرمیاں عملاً سارے عالم اسلام اور ان مغربی ممالک میں بھی جاری رہیں جو مسلمانوں کے

ممالک سے سیاسی وابستگی رکھتے تھے۔ افغانستان، ایران، ترکی، مصر، ہندوستان، سب سے وقتاً فوقتاً افغانی کا قوت آزمارابطہ پیدا ہوا اور ان سب ممالک میں ان کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں (10)۔ انقلاب ایران جس کا آغاز ۱۸۹۱ء میں اجارہ تمباکو کے خلاف سوزش سے ہوا اور جس کا اختتام قیام شروطیت پر ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ اپنے ابتدائی مراحل میں افغانی ہی کے مشورے اور حوصلہ افزائی کے سبب ہوا تھا سوڈان کی مہدی تحریک میں بھی ان کے اثرات موجزن رہے ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں کی کامیاب شورش افغانی ہی کی تحریک پر تیار ہوئی تھی (11) جس کو انہوں نے قسطنطنیہ کے دوران قیام میں شروع کیا تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ترکی میں دستوری نظام بحال کیا جائے۔ اس میں بالآخر ایک مرحلے پر خود فوج بھی انقلابیوں میں شامل ہوگئی اور سلطان عبدالحمید کو مجبور ہو کر ۱۸۷۶ء کا دستوری نظام بحال کرنا پڑا۔ اس طرح ملک کا اقتدار نوجوان ترکوں کے ہاتھوں میں آگیا۔ مصری قوم پرستوں کی وہ تحریک جو اپنے ابتدائی مرحلے میں، اعرابی بغاوت، کے ناکام ہوجانے کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی جس کے ابتدائی محرک بھی افغانی ہی تھے اعرابی اور ان کیساتھی اپنے آپ کو افغانی کے پیرو بیان کرتے تھے اور مصر ہی میں جس ذہنی اصلاح و بیداری کے محرک محمد عبدہ تھے وہ بھی بڑی حد تک افغانی ہی کے طفیل تھی۔

سید جمال افغانی بلاشبہ مذہبی اور معاشرتی رہنما اور معلم تھے انہوں نے دور دور کا سفر کیا تاکہ اپنی تعلیم دوست دشمن سب کے سامنے پیش کریں۔ انگلستان، فرانس اور روس کی جدوجہد کے بڑے مرکز تھے۔ اس لیے کہ یہی ممالک تھے جنہوں نے سب سے زیادہ اسلامی ممالک کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان ممالک کے مدبران سے ڈرتے تھے اور ساتھ ہی انہیں ناپسند بھی کرتے تھے اور باوجود اس کے جب کبھی وہ سارے قریب مصلحت سمجھتے تھے وہ ان سے مشورہ لیتے تھے اور ان کی امداد و رہنمائی کے طالب رہتے تھے۔

افغانی تصور انقلاب میں ایران و افغانستان کی اہمیت

اس وقت ایران اور افغانستان میں شدید اختلافات تھے جس کی نوعیت مذہبی اور سیاسی بھی تھی۔ جس کی وجہ سے ان دونوں ممالک میں جنگوں کا سلسلہ جاری تھا۔ سید جمال الدین افغانی کی کوشش تھی کہ ان دونوں میں سیاسی اختلافات دور کر کے دونوں مسلمان قوموں میں اسلامی اخوت کو فروغ دے کر اتحاد پیدا کیا جائے۔ وہ ان دونوں ملکوں میں اتحاد کو کس قدر اہمیت دیتے تھے ان کے نزدیک یہ دونوں قومیں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں ہمارے سچے دین اسلام نے ان میں دینی رابطہ قائم کر کے ان کے تعلقات کو اور بھی مستحکم بنا دیا۔ ان میں جو اختلافات ہیں وہ معمولی نوعیت کے ہیں اگر ایران اور افغانستان اپنے اختلافات دور کرلیں اور ان میں اسلامی اتحاد کا رشتہ مضبوط ہو جائے تو ہمارے اسلامی ملکوں کو ایک نئی اسلامی قوت حاصل ہو جائیگی۔ افغانیوں، ایرانیوں اور دوسرے مسلمانوں میں زندگی کی ایک ایک نئی لہر دوڑ جائیگی۔ ان کی عظیم الشان امیدیں از سر نو زندہ ہو جائیں گی اور اسلامی دنیا کو ایک نئی قوت حاصل ہوجائیگی (12)۔

مولانا عبیداللہ سندھی قافلہ حریت کے علمبردار تھے اور ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے برس ہا برس کی منصوبہ بندی اور سوچ و بچار کے بعد تحریک ریشمی رومال کے ذریعہ برصغیر سے انگریزوں کو دیس نکالا دینے کے لیے آخری جدوجہد کی تھی جو بلا

قسمتی سے ناکام ہوگئی تھی اور انگریز چونکہ ہندو اور مسلمانوں کو لڑا کر (Devide & Rule) زیادہ دیر تک اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتا تھا جبکہ مولانا سندھی اور ان کے رفقاء اس تقسیم کو ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نہایت خطرناک رکھتے تھے اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ بدقسمتی سے تقسیم در تقسیم کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا۔

سروراجیہ نظام توافق ایشیائی (سروراجیہ ایشیاٹک فیڈریشن)

یہی وہ مقام تھا جب مولانا سندھی اور ان کے رفقاء نے حالات کا تجزیہ کر کے اپنا ایشیاٹک فیڈریشن کا تصور پیش کیا یاد رہے کہ اس دوران روس میں سوشلسٹ انقلاب آ چکا تھا اور دنیا سرمایہ دار اور جاگیردار معاشرے اس نئے نظام کو عجیب وغریب نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ یہ نظام سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ کر کے آیا تھا۔ مولانا سندھی نے اس کا بغور مطالعہ کیا۔ اور ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے نظام کی حدود صرف عالم اسلام کی بجائے صرف ایشیا تک محدود کر دی۔ ان کے پروگرام کے مطابق آزاد ہندوستان میں کوئی نظام حکومت کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جب تک اکثر ایشیائی اقوام اسے منظور نہ کریں اس لیے وہ ایشیائی ممالک میں شہنشاہت اور سرمایہ داری کے خلاف توافق پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے وہ روس کے نیم ایشیائی ممالک میں شمار کر کے ایشیاٹک فیڈریشن کا ممبر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غیر ایشیائی پسماندہ ممالک مثلاً مصر اور مراکش وغیرہ بھی جو شہنشاہت اور سرمایہ داری کی مخالفت کر کے اس میں شامل ہوسکتے ہیں۔ جن ایشیائی ممالک میں اس وقت شاہی حکومت قائم ہے اگر وہاں پر شہنشاہت اور سرمایہ دار مخالف پارٹیاں برسر اقتدار آ جائیں تو وہ بھی ایشیاٹک فیڈریشن میں شامل ہوسکتی ہیں۔ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ایشیائی ممالک کی سوشلسٹ یا ایسی پارٹیاں جو کاشتکاروں، مزدوروں اور دماغی محنت کشوں کے مفاد کی محافظ ہوں اور ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ یورپ اور امریکہ کی سوشلسٹ یا محنت کشوں کے حقوق کے علمبردار پارٹیوں کے نمائندوں کو م، س، پ کانگریس کے اجلاسیں بطور مبصر شامل کرنیکے حق میں ہیں۔

وہ دنیا بھر کے سوشلسٹ یا محنت کشوں کے حقوق کے علمبرداروں کا آپس میں رابطہ کرنے کے حق میں ہیں وہ کسی ایسے مذہب کو تسلیم نہیں کرتے جس کی سیاست میں شہنشاہت، سرمایہ داری اور جاگیرداری شامل ہو۔

عرب کو قدرت نے ایک عظیم رہنما جمال عبدالناصر کی صورت میں دیا جنہوں نے عرب قومیت کے عنوان سے عالم عرب کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی جو درحقیقت مظلوم اقوام کو ظالم قوتوں کے خلاف متحد کرنے کا آغاز تھا یوں بالواسطہ پین اسلام ازم کی تقویت کے لیے کام کیا۔ جمال عبدالناصر پہلے بااختیار عرب لیڈر اور سربراہ مملکت تھے جنہوں نے سید جمال الدین افغانی کے سیاسی افکار پر عمل کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنی توجہ مصر کو انگریزوں کے اقتدار سے آزاد کرانے پر مرکوز کی۔ اور ۱۹۵۴ء میں انگریز نہر سویز سے انخلا پر راضی ہوگئے ایک سال بعد ۱۹۵۵ء میں جمال عبدالناصر نے چیکوسلواکیہ سے اسلحہ خریدنے کا معاہدہ کیا۔ جس سے مغربی طاقتیں چونک گئیں۔ کیونکہ ۱۹۵۵ء تک عرب اور مسلم ممالک کو اسلحہ فراہم کرنے ان کی مکمل اجارہ داری تھی۔ جمال عبدالناصر کی طاقت کو روکنے کے لیے برطانیہ اور امریکہ نے مختلف منصوبوں پر قرض دینے سے منحرف ہوگئے۔ جمال عبدالناصر نے اس کا بدلہ ۱۹۵۶ء میں نہر سویز کو قومی ملکیت میں لے کر کیا۔ برطانیہ نے جمال عبدالناصر کو اپنے مفادات کے لیے

زبردست خطرہ سمجھا اور اس نے اپنے حلیف طاقتوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جمال عبدالناصر کے عروج سے مغرب کو ویسا نقصان اٹھانا پڑے گا جیسا کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں اٹھایا تھا۔ اس وقت برطانوی وزیر اعظم انتھونی ایڈن نے امریکہ کے صدر آئزن ہاور کو خط لکھا۔

کیا ہم ان (عربوں) پر یہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ جرمنوں سے زیادہ سمجھدار ثابت ہوں گے۔ اگر بعد میں عربوں میں پھوٹ بھی پڑ جائے جیسا کہ پہلے خلفاء کے بعد ہوا تو بھی اس اثنا میں کافی نقصان پہنچ چکا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ناصر کو اٹھارہ اقوام کے ٹھکرانے کی اجازت دے دی گئی تو چند مہینوں میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں انقلاب آ جائے گا اور مغرب مشرق وسطیٰ کے تیل سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ 12A

اس طرح ایڈن نے مصر پر انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مشترکہ حملے کا جواز ڈھونڈا۔ یہ بات تعجب خیز ہے کہ اس وقت کے چند عرب اور مسلم لیڈروں نے مسلم عوام کے جذبات کے خلاف برطانوی جارحیت کی نہ صرف حمایت کی بلکہ جیسا کہ ایڈن کی یادداشتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ انگریزوں کو ناصر کے خلاف اقدام کرنے پر اکسایا۔ ان واقعات سے اتحاد اسلامی کی راہ میں حائل عملی مشکلات کی مزید نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض مسلمان اور عرب رہنماؤں نے اپنے مفادات سے مجبور ہو کر مغرب کے اقدام کی حمایت کی تھی۔ اگر یہ درست ہے تو انہیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ عرب اتحاد یا مسلمان ممالک کے مابین تعاون نہ تو زبانی جمع خرچ کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے نہ اسے وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو اپنے عوام کے جذبات کا احترام نہیں کرتے۔

ترقی پسند عرب ہوں یا قدامت پسند، ان کے نزدیک عرب اتحاد، عرب قومیت اور مسلم اتحاد کے مابین کوئی نزاع نہیں ہے۔ انہوں نے انسانی فطرت کے متنوع اظہار پر ایک جیسی توجہ دی ہے۔ نہ وہ اپنے عربی النسل ہونے سے منکر ہیں نہ بطور مسلم یا عیسائی اپنے مذاہب سے اور نہ ہی عربی تہذیب سے۔ اس کے برعکس کسی قسم کے احساس برتری کے بغیر وہ اپنی روایات اور کلاسیکی زندگی کے ہر پہلو پر فخر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہر عرب کو خواہ وہ شامی ہو یا مصری، نجدی ہو یا یمنی ایک ہی خاندان کا فرد ہونے کا شدید احساس ہے۔ حالانکہ ہر ایک اپنے ملک یا قبیلے کی نسبت سے اپنا الگ تشخص برقرار رکھنے پر بھی مصر ہے۔ ان کا یہ نقطہ نظر مذہب کے بارے میں ان کے دلوں میں کوئی انتشار یا کشمکش پیدا نہیں کرتا اور نہ ہی ان کے بلند روحانی مقاصد کے حصول میں رکاوٹ بنتا ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ اتحاد اسلامی کے تصور کو بعض لوگ رجعت پسند طاقتوں سے منسوب کرتے تھے ان کے نزدیک یہ تصور نفرت اور مذہبی جنون کی پیداوار تھا شاید اس رائے کی تشکیل میں پین اسلام ازم کے تصور سے مغرب کی مخاصمت کا بہت ہاتھ ہے۔ حقیقت میں اتحاد اسلامی کے تصور کو اس نیشنل ازم کا قدرتی نتیجہ سمجھنا چاہیے جس میں مذہب ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

لیکن افغانی کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور مسلمانان عالم ان کی نیک خواہشات کے برعکس صیہونی اور نصرانی سازشوں کے نتیجہ میں تقسیم در تقسیم ہوتے چلے گئے انگریزوں نے عرب نیشنلزم اور ترک نیشنلزم کے نام پر عربوں اور ترکوں کو لڑا دیا

اور تمام عرب ممالک پر خود قبضہ کر لیا۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا برصغیر کے مسلمانوں پر بھی بہت اثر پڑا اور وہ زخمی جذبات کے ساتھ انگریزوں کے خلاف سراپا احتجاج بن گئے نہایت زور وشور کے ساتھ تحریک خلافت چلی جس میں اگرچہ انگریزی اقتدار کا تمام رعب ودبدبہ ختم کر کے رکھ دیا۔ لیکن بہت جلد انگریز نے ہندو مسلم تفریق پیدا کر کے اس متحدہ جدوجہد آزادی کو کافی حد تک کمزور کر دیا۔

بیرونی تسلط سے آزادی

جمال الدین افغانی مرد حق اور حق گو تھے اس سے بحث نہیں کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے بلکہ وہ ایک اللہ کا بندہ تھا جو اسود واحمر، صفہان وسمرقند اور عرب وعجم کی قیود سے آزاد تھا۔ جس کے دماغ پر نور ظلمت، اسرار حیات قومی اور کائنات کا نظم ونسق روشن تھا جس کی انگلیاں قوتوں کی نبض دیکھتی تھیں۔ جس کے کان پچھلی اقوام کے افسانوں کے ساتھ ساتھ آئندہ آنیوالی اقوام کی آواز بھی سن سکتے تھے۔ جسے معلوم تھا کہ وطنیت وہ اختیار ہے جو کفر کے چابک دست لوہار نے مسلمانوں کا گلا کاٹنے کے لیے بنا کر تیار کیا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس کے آگے سر جھکا دیا تو ان کی حالت بد سے بدتر ہو جائیگی۔

اس نے امت اسلامیہ کو اس کے فرائض کی طرف متوجہ کیا اور بتلایا کہ تیرا کام قوموں کی امامت کرنا ہے۔ دوسری اقوام کی غلامی نہیں۔ دنیاوی ترقی کے اعتبار سے تجھے وہاں ہونا چاہیے۔ جہاں دیکھ کر دوسری قومیں اپنے اندر حوصلہ پیدا کر سکیں تیری جمعیت اسود واحمر، ابیض واصفر سب کے لیے اپنے اندر جگہ رکھتی ہے۔ تیرا کام ہے کہ دنیا کو عالمگیر برادری اور بین الاقوامی محبت کا سبق دے تو صفاہان وسمرقند کی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ تجھے آزاد رہنا چاہیے۔

اقتدار وحکومت

سید جمال الدین افغانی اقتدار کی اہمیت کو جانتے ہیں وہ اس کو اتنا ہی اہم بتلاتے ہیں جتنا جسمانی زندگی کے لیے غذا اور پانی ہیں ان کے نزدیک قوم کے نظام کی حفاظت اور قوم کی نشو ونما کے لیے اقتدار کے بغیر چارہ نہیں وہ اس کی تشریح میں مزید لکھتے کہ قوم کی نشو ونما اور استحکام کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ دوسرے قوموں پر دست درازی کی جائے اور اس سے ساز وسامان حاصل کیا جائے جس قوم نے ایسا نہ کیا وہ ایک نہ ایک دن وہ مخالف قوتوں سے ملیامیٹ ہو جائیگی۔

سید جمال الدین افغانی حکومت کو ذات کیلئے نہیں چاہتے بلکہ ان کے نزدیک حکومت حفاظت دین کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ شخصی حکومت کے سخت مخالف ہیں اور اسے قوم کے زوال کا سبب بنتے ہیں ان کے نزدیک جس قوم کا اپنے معاملات کے حل وعقد میں کوئی اعتبار نہ ہو۔ حاکم کا ارادہ ہی قانون متصور ہو اس کی خواہش پر ہی نظام حکومت کا دارومدار ہو۔ جو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کیا کرے۔ ایسی قوم کسی حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔

افغانی جمہوری نظام چاہتے ہیں۔ اس نظام کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار بہت حد تک ان افراد پر ہے جن کے سپرد کاروبار مملکت چلانے کا فرض کیا گیا ہے۔ افغانی کے نزدیک اگر قوم کی حکومت خود قوم کے افراد کے ہاتھوں میں ہو قطع نظر اس

کے اورافراد قوم کا کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ البتہ وہ دیانت وامانت بلند اخلاق واعلیٰ کردر کے مالک ہوں۔

سربراہ مملکت کے اوصاف کی نشاندہی کرتے ہوئے جمال الدین افغانی کا کہنا ہے کہ حاکم کا عمدہ اوصاف کے ساتھ متصف ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ تمام اچھے اور برے حالات کا انحصار حکمران پر ہی ہوتا ہے۔ حکمران میں تین اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ صاحب رائے ۲۔ بلند حوصلے کا مالک

۳۔ سلیم الطبع ہو

جو حکمران ان اوصاف سے عاری ہوگا وہ قوم کو نقصان کے گڑھے میں گرائے گا اس کی آنکھوں پر جہالت کے پردے گرا دے گا اور فقر وفاقہ میں مبتلا کر دے گا۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے مجوزہ نظام میں ہندوستان میں فیڈرل سسٹم کی بنیاد پر حکومت قائم کرنے اور شمال مغرب مشرق اور جنوب کو تین قدرتی حصوں میں تقسیم کرنے کا خالہ پیش کیا گیا ہے اور نظام کی بنیاد جمہوریت کو قائم کیا گیا ہے۔ مجلس قانون ساز کے لیے ہر عاقل بالغ، مرد وعورت کو انتخاب کے ووٹ کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن ہر اجتماعی طبقہ یعنی کسان، مزدور، دماغی کام کرنیوالے لوگ مجلس قانون سازی میں اپنے طبقہ سے نمائندے چننے کے مجاز ہوں گے اور اس طرح اس جمہوریت کی پارلیمنٹ میں کسان، مزدور، دماغی کام کرتے والوں کی اکثریت ہوگی۔

فک کل نظام

حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریات میں سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہر نظام کو پہلے توڑا جائے خواہ وہ سرمایہ دارانہ نظام ہو یا وہ ملوکیت وشہنشاہیت ہو۔ وہ ڈکٹیٹرشپ ہو یا سوشلزم وفیشلزم ہو۔ ان سب نظاموں کو درہم برہم کرنا ضروری ہے

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے بھی حضرت شاہ ولی اللہ کے فکر کو بڑھایا ہے اور اپنے انقلاب کے لیے انہوں نے بھی یہی راستہ متعین کیا ہے یعنی فک کل نظام (13)

اس کے بعد جب کہ تمام نظام ٹوٹ جائیں سب سے پہلے فکر کو پاک کرنا ضروری ہے۔ اور وہ ایمان وتوحید کا پاکیزہ عقیدہ اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں وہ رسالت وقیامت پر یقین رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کو یہ جتنے دنیاوی نظام ہیں ان سب کو توڑ کر اپنی فکر کو پاکیزہ بنانا چاہیے۔ توحید، رسالت اور قیامت کے دن پر پکا ایمان ہونا چاہیے (14)۔

باہمی تعاون۔۔ اخوت کی اہمیت اور اختلاف وانتشار کی نفرت

سید جمال الدین افغانی نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر بہت زور دیا۔ شریعت کی رو سے مسلمانوں کے ساتھ بلکہ ان کی امان میں آنے والے اور پڑوس میں رہنے والے دیگر مذاہب کے ساتھ بھی اتحاد واتفاق سے پیش آنا ضروری ہے۔ کیونکہ اسلام رواداری اور اک دوسرے کے تعاون کا درس دیتا ہے۔

اعانت فرض قرار دی ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اتفاق واتحاد کو بہت مقام حاصل ہے جب ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہوگا تو فتنہ وفساد کا مکمل استیصال ہو جائیگا۔

سید جمال الدین اتحاد کے حوالے سے پوچھتے ہیں کہ کیا اختلاف کے ہوتے ہوئے جو آج ہم میں موجود ہیں۔ اور ان مظالم کو آسانی سے برداشت کرتے ہوئے جو ہم پر آج توڑے جا رہے ہیں۔ ہمارے لیے فرائض دین کے پابند ہونے کا دعویٰ زیب دے سکتا ہے خود سید صاحب فرماتے ہیں کہ کبھی نہیں۔ اس کے لیے سید جمال الدین افغانی اخوت و بھائی چارہ کا پیغام دیتے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں اسلامی اخوت کے نظریہ کو پھیلایا جائے اور سب مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے تا کہ اختلاف وانتشار کا خاتمہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا جب قوم ایک ہو جاتی ہے۔ اور نفع ونقصان کی حیثیت ثانوی ہو جاتی ہے تو قوم میں اخوت و بھائی چارہ کے احساسات ابھرتے ہیں اور اختلاف وانتشار ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اختلاف وانتشار سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بھی ہے کہ اتحاد واتفاق سے زندگی بسر کرو اور ان قوموں کے نقش قدم پر مت چلو جو اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اختلاف وانتشار میں پڑے رہتے ہیں۔

اس لیے سید جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ آپس میں بھی باہمی تعاون کرو۔ اخوت کا پیغام دیا اور اختلاف وانتشار سے روکا۔ کوئی قوم اس وقت تک ہلاک نہیں ہوتی جب تک اس قوم میں اختلاف وانتشار نہ رہے۔

قومیت:

مولانا عبید اللہ سندھی کے نزدیک اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا۔ وہ قومیت کی اصلاح ضرور کرتا ہے لیکن اسے مٹاتا نہیں۔ عرب مسلمان ہو کر بھی عرب رہے۔ ایرانی مسلمان ہوئے تو انہوں نے اپنی ایرانی قومیت کو کھویا نہیں۔ اسی طرح ترک اسلام لائے اور بحیثیت ایک مسلمان ترک قوم کے انہوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی۔ عربوں کے بعد ایرانیوں کا آنا اسلام کی سربلندی کی علامت ہے۔ اور عربی زبان کے اثر سے نئی فارسی زبان کا بننا اسلامی فکر کی وسعت پذیری کی دلیل ہے۔ چنانچہ اسی طرح زمانہ گزرتا جائے گا۔ اور نئی نئی قومیں اسلام لاتی جائیں گی۔ خود مولانا کے اپنے الفاظ میں اسلام کے پہلے داعی عرب تھے۔ انہوں نے بڑے خلوص اور تن دہی سے اسلام کو پھیلایا۔ پورے پانچ سو برس تک عرب پیغام اسلام کے محافظ اور داعی رہے (15)۔

مولانا قومیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ہندوستانی بن کر یہاں اس ملک میں اسلام کے اصولوں پر انقلاب کرے اور وہ اپنے ہندوستانی ہونے کو اسلام کی کسی غلط تعبیر کی وجہ سے اسلام کے خلاف نہ سمجھے، بلکہ اس کے برعکس اپنی ہندوستانی قومیت کو اسلام کی صحیح بین الاقوامی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات کے عین مطابق جانے لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ ہندوستانی قومیت اسلام کی بین الاقوامی روح انقلاب سے متضاد نہ ہو۔ غرضیکہ ہندوستانی مسلمان دنیا کی اسلامی برادری کا ایک مستقل رکن رہے۔ اس کا اپنا وطن ہے۔ اپنا کلچر ہے۔ اپنی تاریخ ہے۔ اور اپنی زبان اور اپنا ادب ہے۔

ہندوستانی مسلمان کو اگر اس دنیا میں عزت و اقبال حاصل کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے قومی وجود اور اپنے قومی خصائص کو ترقی دے۔ اور اپنی ہندوستانی قومیت کو اسلام کے بین الاقوامی انقلاب کے رنگ میں رنگ کر اسے خود اپنے لیے۔ اپنے غیر مسلم اہل وطن کے لیے اور دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے لیے خیر و برکت کا باعث بنائے۔ یہ ہیں وہ اغراض و مقاصد جن کے لیے مولانا اپنے خطبوں میں بار بار ہندوستانی مسلمانوں کو نیشنلسٹ بننے کی دعوت دیتے ہیں(16)۔

مولانا سندھی قومیت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان سلطان عالمگیر کے فکر کو نہ بھولیں۔ مگر عالمگیر کی سلطانیت کو اپنا نصب العین نہ بنائیں بلکہ اس کے زمانے میں اسلامی فلسفے کی جو ارتقائی شکل شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد ماجد اور عم بزرگوار نے بتائی اور جسے حضرت شاہ صاحب نے محمد شاہ کے زمانے میں مدوّن کیا۔ اسے عالمگیر کا ورثہ نہ سمجھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بیرونی مسلمانوں کے پریشان کن پروگراموں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ اور وہ اپنے گھر پر اپنا قبضہ جمانے کی کوشش میں برابر مصروف رہیں۔ اگر انہیں اس کام میں سو سال بھی لگ جائیں'۔ انہیں پروگرام تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب کے فلسفے کی روش پر ہم جو پروگرام سوچتے ہیں، اس کے بھی ایک دو حصے واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

ہمارا ہندوستانی ہونا تو اس سے ظاہر ہے کہ ہم انڈین نیشنل کانگریس کے رکن بننا چاہتے ہیں۔ اب دنیا کا سیاسی مرکز یورپ میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہم میں سے کسی ہندوستانی کو یورپ میں تعارف حاصل کرنا ہو تو اس کے لیے کانگریس بہترین عنوان ہے(17)۔

فصل سوم:

معاشی نظریات

نوابوں کی کج عملی و سرمایہ داری کا خاتمہ

جاگیرداری اور سرمایہ داری نے ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے کیونکہ یہ وہ طبقہ ہے۔ جس نے اسلامی اصولوں سے ہٹ کر مال و دولت کے بل بوتے پر ہمیشہ مال و دولت کے لیے اپنے مفادات کا تحفظ کیا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کے انتہائی خطرناک اور فیصلہ کن لحات میں ہمیشہ مسلمانوں کے پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔

سید جمال الدین افغانی نے بھی ان لوگوں کی مخالفت کی ہے۔ ان کے نزدیک انہی لوگوں نے مسلمانوں کو ان ممالک سے محروم کیا جو خدا تعالیٰ نے ان کے قبضہ اقتدار میں دے رکھے تھے اور ان میں وہ زہر پھیلایا کہ وہ اپنے ہی حکمرانوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے لگے اور ایک دوسرے سے متنفر ہو گئے وہ کہتے ہیں کہ اے کاش یہ گمراہ جاگیردار نواب وقار اور عزت کے لالچ میں ڈوبے ہوئے انسان مسلمانوں میں پیدا ہی نہ ہوتے اس وقت مشرق سے لیکر مغرب تک اور شمال سے لیکر جنوب تک مسلمان آپس میں متحدہ ہو جاتے اور سب کے سب ایک اسلامی آواز اور متحدہ اعلان پر لبیک کہتے ہوئے ایک مرکز پر آ جاتے(18)۔

برصغیر میں بھی جاگیرداروں، نوابوں، حریت پسند مسلمانوں سے غداری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کا سب سے بڑا ذمہ دار یہ طبقہ تھا اور اس کے بعد انگریزوں کو برصغیر میں اپنا تسلط مضبوط کرنے میں اس طبقہ نے ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا۔ برصغیر میں مسلمانوں نے جو تحریک آزادی چلا رکھی تھی۔ یہ طبقہ اپنے ذاتی مفادات کیوجہ سے اس کا شدید مخالف تھا اور انگریزوں کا پشتی بان تھا۔ چنانچہ برصغیر کی تحریک آزادی کے سرخیل کی حیثیت سے ان کے بارے میں مولانا سندھی کے تجربات نہایت تلخ تھے۔ جو آئندہ ان کی نظریات کی بنیاد بن گئے ویسے بھی اسلام میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور وہ ریاست کے تمام وسائل پر ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری کو قطعاً ناپسند کرتے ہیں۔ اس حالت میں کہ ریاست کے عوام کی اکثریت غربت اور افلاس کی زندگی گزار رہی ہو۔

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کے سیاسی فلسفہ میں بھی جاگیرداری اور سرمایہ داری ہرگز روا نہیں ہے۔ لہذا مولانا سندھی بھی مجوزہ نظام سرمایہ داری کو قبول نہیں کرتے۔ ان کے مجوزہ نظام میں فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دے دیے جائیں گے اور ذاتی ملکیت محدود کر دی جائیگی۔ مالداروں پر زیادہ ٹیکس لگایا جائیگا۔ ملک کی تمام زمینیں قومی ملکیت تصور ہوں گی اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائیگا۔ اس جمہوریت میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی۔ فاروق اعظم کے فیصلہ کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے اور امام ابوحنیفہ کے فیصلہ کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کیا جائیگا۔ ہر کاشتکار خاندان کو اس قدر زمین دی جائیگی۔ جس قدر وہ خود کاشت کر سکے۔ سرمایہ کاری کی بنیادی سودی لین دین بالکل ختم کر دیا جائیگا اور محنت

کش طبقہ کے تمام پرانے قرض معاف کردیے جائیں گے۔قومی ملکیت میں گئے ہوئے کارخانوں کو مزدوروں کی انجمنوں کے ذریعہ چلایا جائیگا اوراس کے منافع میں مزدوروں کو حصہ دیا جائیگا۔محنت کش طبقہ کوتعلیم اورصحت کی سہولتیں مفت مہیا کی جائیں گی۔ انہیں صاف ستھرے گھر مہیا کیے جائیں گے۔داخلی تجارت کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ہاتھوں میں ہوگی۔لیکن سوداگران کوآپریٹو سوسائٹیوں میں شامل ہوکران کے ممبر بن سکیں گے۔جبکہ خارجی تجارت مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں ہوگی۔

قوم کے متوسط طبقے ہیں کہ روزمرہ کی مادی ضرورتوں اوررسمی مذہب کے چند معمولات کے سوا جن سے انہیں تھوڑا بہت اطمینان مل جاتا ہے۔کسی اور چیز سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔باقی رہے عوام قوم کا غالب حصہ۔قوم کے جسم کے ہاتھ اور پاؤں،ان کوتم نے "عوام کالا انعام" کہہ کرصدیوں سے چوپایوں کے درجہ پر رکھ چھوڑا ہے۔مولانا سندھی فرماتے ہیں۔تم نے اپنی ایک محدود دنیا بنا رکھی ہے۔اس دنیا میں تم شاداں وفرحاں ہو اور کسی اور طبقے ،قوم اور فکر اور خیال کو خاطر میں نہیں لاتے۔تمہیں ساون کے اندھے کی طرح خیر سے اپنے اہل قلم مجددین اور "اصحاب امر" کے طفیل ہر طرف خزاں میں بھی ہریاول ہی ہریاول نظر آتی ہے بہار کا عہد کبھی کا گزر چکا۔تم خوش اعتقادی میں اپنے ہاں اب تک بہاری کا عمل دخل دیکھ رہے ہو۔دنیا میں زلزلے آرہے ہیں لیکن تم گھروں کے اندر آنکھیں بند کیے پڑے ہو۔زندگی کی قہرمانی قوتیں اپنی پوری شدت میں انسانیت کے بطن سے کوہ آتش فشاں کی طرح پھوٹ نکلی ہیں۔ان کے ہاتھوں پرانی دنیا پر جو کچھ بھی گزرے کم ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں۔کہ میں تمہیں آنے والے انقلاب کی خبر دے رہا ہوں، میں یورپ کے ایک بڑے حصے میں اس انقلاب کو بروئے کار آتا دیکھ آیا ہوں۔اس انقلاب نے اس سرزمین کی جس طرح کایا پلٹ دی اور غالب گروہ نے جس سفا کی سے اپنے حکمرانوں کو تہ تیغ کیا۔میں اس کے اسباب اور نتائج خوب سمجھ چکا ہوں۔لیکن یہ انقلاب بس اسی ملک تک محدود نہیں رہے گا۔یہ عالمگیر انقلاب ہے اور یہ ساری انسانیت کو ایک نہ ایک دن اپنی لپیٹ میں لے کر رہے گا۔اور تو اور برطانیہ والے جن کی آج ہمارے ملک پر حکومت ہے خود ان کے اپنے وطن میں اس انقلاب کے سوتے پھوٹ رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ برطانیہ کے حکمرانوں طبقوں کے لیے خود اپنوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوجائے تم اس انقلاب کی قوت،وسعت،شدت اور سفا کی اپنی موجودہ زندگی میں محسوس تک نہیں کر سکتے۔اس انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھو یقیناً یہ "حشر" برپا کرکے رہے گا تا کہ انسانیت کے لیے خدائے ذوالجلال کی طرف سے ایک نئے "بشر" کا سامان ہو سکے (19)۔

مزدور کماتے اور اوپر کا یہ مختصر گروہ ان کی کمائی کو اپنا حق سمجھتا جو کماتے تھے ان کو کھانے کو نہ ملتا اور جو ان کی کمائی پر رہتے تھے وہ کمانا ذلت کا نشان سمجھتے تھے۔نتیجہ یہ نکلا کہ "کماؤ" طبقے پس ماندہ اور ذلیل ہوگئے۔اور "کھاؤ" طبقے دولت اور اقتدار کے نشہ میں انسانی اخلاق سے گر گئے اور مجموعی طور پر ساری انسانیت کو گھن لگا۔غضب یہ ہوا کہ اس دور میں علم،کلچر اور مذہب کے جو معیار بنے۔ان کے پیش نظر بھی بس اس مختصر گروہ کی خوشنودی رہی۔ان سے اگر سکون واطمینان ملتا تو زیادہ تر ان لوگوں کو اور ذہن کی جلا ہوتی تو ان کی۔اور تہذیب وتمدن کی برکتیں پھیلتیں تو صرف ان کے گھروں یا محلوں تک۔کسانوں اور مزدوروں کو اتنی مشقت کرنی پڑتی کہ انہیں کسی بات کا ہوش بھی نہ رہتا اور اگر کبھی کبھار ان کے شعور کی آنکھیں کھل جاتیں تو انہیں سلانے کے لیے خواب

اور داؤں کی کمی نہ تھی ۔ زمانہ مدتوں اسی طرح چلتا گیا اور محنت کش طبقے نسلاً بعد نسلاً اپنے بھائیوں کے ہاتھ سے یہی دکھ اٹھاتے رہے لیکن ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی اور اس سے اپنے بندوں کی یہ بری حالت زیادہ دیر دیکھی نہ گئی۔ چنانچہ انسانی ذہن کو یہ توفیق عطا ہوئی کہ وہ مشین ایجاد کرے۔ اس مشین سے صنعت وحرفت کا دور شروع ہوتا ہے۔ بے شک یہ دور بھی اپنے ساتھ بہت سے مصیبتیں لایا اور مشینوں کو چلانے والوں پر سالہا سال تک مشینوں کے مالکوں نے بڑے بڑے ستم توڑے لیکن اب یہ مشینیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ایک بے پناہ قوت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ مزدور متحد اور منظم ہو رہے ہیں اور آگے چل کر یہ ہوگا کہ زمین پر کام کرنے والے کسان بھی ان کے ساتھ مل جائیں گے (20)۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے جس انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ انسانیت کے ان پسماندہ طبقوں کو للکار رہا ہے۔ کہ اٹھو! غاصبوں سے اپنا حق چھینو اور جو ظلم پر جی رہے ہیں انہیں نیست ونابود کر دو۔ اس انقلاب کا نعرہ یہ ہے کہ مزدورو اور کسانو! محنت کشو! مستقبل تمہارا ہے تم محنت کرتے ہو اور تمہاری محنت ہی کا نتیجہ یہ سر بفلک عمارتیں، رزق کی یہ فراوانی، آرام و آسائش کے یہ ذرائع اور دنیا کی یہ ساری ثروت اور دولت ہے جس سے تم اب تک محروم رکھے گئے ہو در اصل یہ کل متاع تمہاری ہے۔ اٹھو اپنے آپ کو منظم کرو۔ آگے بڑھو اور جو تمہارا حق ہے اس پر قبضہ کر لو۔ اس میں جو شخص آڑے آئے اسے مٹا دو۔ جو علم، کلچر، مذہب اور اخلاق تمہارے سر راہ ہو اس کا انکار کر دو۔ وہ علم نا قابل اعتبار ہے۔ وہ کلچر بے کار اور فرسودہ ہے۔ وہ مذہب غلط ہے اور اخلاق کا وہ نظام بے معنی ہے (21)۔

مولانا نے فرمایا کہ اس انقلاب نے اپنا ایک فلسفہ بھی وضع کیا ہے۔ اس فلسفہ سے محنت کشوں کو ایک ایسا حربہ ہاتھ آ گیا ہے جس کا توڑ بڑے بڑوں سے بھی مشکل سے بن آتا ہے۔ اس فلسفہ کی نظری حیثیت جو کچھ بھی ہے وہ تو ہے ہی لیکن عملاً اس کا مقابلہ اس لیے بھی مشکل ہے کہ گو انقلاب کا یہ فلسفہ خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ لیکن اس کا دعویٰ اور کوشش یہ ہے کہ ساری کی ساری خلق خدا بغیر کسی رنگ، نسل، ملک یا مذہب کی تمیز کے آزادی، مساوات اور اقتصادی خوشحالی کی نعمتوں سے یکساں فیض یاب ہو۔ یہ فلسفہ مظلوموں کو انصاف کی امید دلاتا ہے اس سے ذلیل اور پس ماندہ انسان عزت واقبال کے خواب دیکھنے لگتے ہیں کم ہمتوں میں جرات اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ آج اس زمانے میں ان مظلوموں، پسماندوں اور کم ہمتوں ہی کی کثرت ہے اور خدا کی بیشتر مخلوق دکھوں اور روگوں ہی میں گرفتار ہے (22)۔

مولانا نے بتایا کہ اگر تم نے اپنے ملک کے تباہ حال اور بے کس طبقوں کی خبر نہ لی اور انہیں اس حال میں رہنے دیا جس میں کہ وہ صدیوں سے جان توڑ رہے ہیں اور تمہارے اوپر کے طبقے حسب سابق جونک بن کر ان کا خون چوستے رہے اور ان کو تم نے اب بھی اسی بھوک، جہالت، ذلت اور عفونت کی دلدلوں میں بدستور مرنے سڑنے دیا تو یاد رکھو کہ انقلاب کا یہ لادینی فلسفہ جو آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ تمہارے ملک کے ان بدنصیب طبقوں کو دوسرے ملکوں کی طرح تمہارا جانی دشمن بنا دے گا۔ اور اگر تمہاری غفلت سے ان کی دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی تو اس کے شعلے تمہیں تو جلا کر خاکستر سیاہ کریں گے ہی لیکن اس کے ساتھ تمہارے علم، کلچر اور مذہب کی خیر نہ ہو گی (23)۔

مولانا نے فرمایا کہ اس قسم کے انقلاب اور اس کے لادینی فلسفہ کے ہولناک نتائج سے بچنا چاہتے ہو تو انقلاب کے کسی ایسے دینی فلسفہ کو اختیار کرو جس کے ذریعے تم خدا کو مانتے ہوئے خدا کی مظلوم مخلوق کو خوش حال بنا سکو۔ انسانیت اب زیادہ دیر تک ظلم نہیں سہہ سکتی۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اگر لادینی فلسفہ انقلاب کے علمبردار اپنے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ پس ماندہ انسانیت کو نئی زندگی کی دعوت دیتے ہیں تو تم ساری انسانیت کو خدا کی ایک سی مخلوق ماننے والے اور اسے ہر ذی روح کا رازق اور رب جاننے والے کوئی ایسا فکر کیوں پیش نہیں کرتے جس سے اس کی ساری مخلوق کی بھلائی ہو۔ ہر ظلم مٹ جائے۔ ہر حق دار کو اس کا حق ملے، ذلت و تمکنت کا خاتمہ ہو اور کوئی بندہ اپنے رب کے دیئے ہوئے رزق سے محروم نہ کیا جا سکے۔ اور جس طرح ایک خاندان کے سب افراد آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اسی طرح مجموعی انسانیت جس کی حیثیت فی الواقعہ "عیال اللہ" کی ہے، اللہ کی نعمتوں سے یکساں متمتع ہو (24)۔

مولانا نے اپنے اہل وطن کو بتایا کہ میں انقلاب کے اس قسم کے دینی فلسفہ کا پیغام بر بن کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ انقلاب کا میرا یہ پیغام تمہیں لادینی انقلاب کیمضرت رساں اثرات سے محفوظ رکھ سکے گا۔ محنت کش طبقوں کے ہاتھ میں قوت اور اقتدار کا آنا یقینی ہے تم نے اگر محنت کشوں کے اس انقلاب کو دینی نہ بنایا تو پھر یہ انقلاب حتمی طور پر لادینی فلسفہ کے ذریعہ ہوگا۔

زمینداره نظام کا خاتمہ

مولانا عبیداللہ سندھی زمیندارہ نظام کو ختم کرنے کے حق میں تھے۔ ان کے نزدیک زمینیں قومی ملکیت قرار دی جائیں۔ اس کے حق میں وہ حضرت عمرؓ کے فیصلے اور حضرت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ کے فتوے سے استدلال کرتے تھے۔ مولانا سندھی نے اپنے منشور میں یہ بات شامل کی تھی کہ زمینداروں کو حضرت عمرؓ کے فیصلے مطابق زمینوں کی ملکیت چھوڑنے پر مجبور کیا جائیگا اور حضرت امام ابو حنیفہ کے فتوے کے مطابق مزارعت ختم کر دی جائیگی۔ ایک کاشتکار کے پاس صرف اتنی زمین ہوگی جس پر وہ خود کاشت کر سکے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کے منشور کی اس شق کے مطابق صدر ایوب خاں نے اپنے دور اقتدار میں زرعی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی لیکن زمینداروں نے اس کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے عوامی اصلاحات کے نام پر زمین کی حد ملکیت مقرر کرنے کی کوشش کی تو زمینداروں نے اپنی زمینیں اہل و عیال کے علاوہ اپنے رشتہ داروں کے نام کرا دیں۔ تھوڑی بہت زمین جو کہ سیم زدہ اور بنجر تھی حکومت کے حوالے کر دی کہ اس زمین کو مستحقین میں تقسیم کر دے۔ غرض ایوب اور بھٹو کی اصلاحات ناکام بنا دیں۔ آج بھی غریب کاشتکار زمینداروں کی رعایا کہلاتے ہیں۔

صنعتی کارخانے

مولانا سندھی نے اپنے منشور میں یہ بات بھی شامل کی کہ ان کی پارٹی برسر اقتدار آ کر تمام کارخانے قومی ملکیت میں لے لےگی تو میا ئے گئے کارخانے مزدوروں کی انجمنیں چلائیں گی اور انہیں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے صلے میں منافع میں

سے بونس دیا جائیگا۔

اگر مولانا سندھی کے منصوبے کے مطابق انہیں منافع میں سے حصہ دیا جاتا تو لوگ دل لگا کر کام کریں گے اور پیداوار بڑھائیں گے مولانا کی سرداد جیہ پارٹی مزدور کو رہنے کے لیے صاف ستھرے مکان اور مفت تعلیم دلانے کی ضمانت دیتی تھی یاد رہے کہ ۱۹۲۴ء میں مڈل کا معیار بہت اونچا تھا۔

تجارت

مولانا عبید اللہ سندھی تجارت کو بھی تعاون سے کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعہ چلانے کے حق میں تھے۔ البتہ وہ سوداگروں کو حق دیتے تھے یہ کام حکومت خود کرے گی۔

فصل چہارم:

معاشرتی نظریات

سید جمال الدین افغانی جہاد کے بعد تعلیم کو بہت اہمیت دیتے ہیں افغانی علم اور حکومت کا گہرا تعلق پاتے ہیں ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کے خاتمے کی ابتداء کچھ اس طرح ہوئی کہ خلافت عباسیہ نے خلافت اور علم کو علیحدہ کر دیا انہوں نے علم کو خیر باد کہا اور خلافت پر ہی قناعت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فرقے وجود میں آ گئے ان فرقوں کے باعث خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور اسلامی ممالک تین حصوں میں بٹ گئے۔ بغداد میں عباسی خلافت رہی۔ اندلس میں امویوں کا اقتدار قائم ہو گیا مصر وغیرہ فاطمیوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ جونہی صاحب اقتدار نے علم کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچا تو خلافت کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔

مولانا عبیداللہ سندی فرماتے ہیں کہ تمہارے علماء ہیں کہ ان کی نظریں محض پہلے کی لکھی ہوئی کتابوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں وہ اپنے گرد و پیش دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور اگر کبھی دیکھتے ہیں تو بس "کتابی" نظر سے۔ وہ زندگی سے کٹ چکے ہیں اس لیے جن علوم کو وہ پڑھتے اور پڑھاتے ہیں ان علوم میں اس بناء پر نہ تو خود میں کوئی زندگی کی رمق باقی ہے اور نہ وہ علوم پڑھنے اور پڑھانے والوں میں زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا کرتے ہیں تمہارے سیاست دان بڑی بڑی اسکیمیں بناتے ہیں لیکن ان کی نظر خاص طبقوں سے آگے نہیں بڑھتی، وہ قوم اور وطن کا نام لیتے ہیں، مذہب اور کلچر پر زور دیتے ہیں۔ لیکن ان کی قوم وطن، مذہب اور کلچر کا تصور یا تو سرے سے موہوم ہے یا اس کا اطلاق ایک خاص طبقہ کے اغراض و مصالح پر ہوتا ہے یہ لوگ صرف اپنے آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور دل ہی دل میں یہ سمجھ لیتے ہیں کہ زمانہ ان کے اشاروں پر سدا حرکت کرتا رہے گا۔ اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی طرف ہی تکتے رہیں گے۔

جمال الدین افغانی کے زمانے میں قدیم اور جدید علوم میں سخت رسہ کشی تھی۔ قدامت پرست طبقہ اپنے قدیم علوم معارف سے باہر قدم رکھنے کے لیے آمادہ نہ تھا اور جو لوگ جدید علوم کی طرف مائل تھے ان پر کفر کا فتویٰ جاری کرنے میں اس نے نہایت بے باکی کا ثبوت دیا۔ اسی طرح جدید علوم کے حامیوں کے نزدیک قدیم علوم کی وقعت نہ تھی۔ سید جمال الدین افغانی دونوں طبقوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں وہ قدامت پرست علماء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے علماء شمس بازغہ پڑھ کر اپنے آپ کو فخریہ طور پر حکیم کہتے ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ وہ اپنے سیدھے اور بائیں ہاتھ میں تمیز نہیں کر سکتے اور نہ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور کیوں ہیں ہم کو کیا ہونا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔

سید جمال الدین افغانی یورپ طرح تعلیم کے دلدادہ لوگوں پر بھی شعر یہ نکتہ چینی کرتے ہیں ان کے نزدیک علم سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہونے چاہئیں۔

۱۔ علم کے ذریعہ قوم کی عسکری قوت میں اضافہ ہو۔

۲۔ علم کے ذریعہ ایسے افراد پیدا ہوں جو ملکی مصلحت کو باقی سارے مصالح پر ترجیح دیں۔

۳۔ علم قوم کی مالی حالت کو بہتر بنادے اور قوم کو کم از کم فقر و فاقہ کے پنجے سے نجات دلا سکے۔

۴۔ دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف علم کی روشنی میں تدابیر اختیار کی جاسکیں اور ان کے ناکام بنانے میں کامیاب ہوا جا سکے۔

سید جمال الدین افغانی کے نزدیک علماء پر مندرجہ ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں:

۱۔ عوام کے سامنے خود ایک نمونہ کے طور پر پیش کرنا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے سنانا تا کہ لوگوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکل جائے اور اس کی وعید کو بھی یاد دلانا

۳۔ دینی رابطے کو زندہ کرنے کے لیے رکھنا، اللہ کے عائد کردہ فرائض اور دین کی مقرر کردہ عبادات سے غفلت کرنے والوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانا۔

۴۔ قدیم اقوام کے حالات کے ذریعہ یہ امر ذہن نشین کرانا کہ جب بھی کسی قوم نے خدا کے قوانین واحکام کی خلاف ورزی کی تو وہ ذلیل وخوار ہی ہوئی۔

۵۔ ملکی اختلافات کا تدارک کرنے اور لوگوں میں اتفاق و اتحاد کا شعور پیدا کرنا جس میں مساجد و مدارس میں اتحاد کے مرکزوں کا قیام شامل ہے۔

سید جمال الدین افغانی نے قوم کی ترقی وقومی اتحاد کے لیے قومی زبان کا ہونا نہایت ضروری قرار دیا ہے جن قوموں کی کوئی زبان نہیں ہوتی وہ ایک قومی زبان بنا کے اپنے قومی وجود کو مستحکم کرتے ہیں۔

خوش قسمتی سے برصغیر میں ایک زبان ہے جو پورے ہندوستان کے تمام علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہی زبان مشترکہ قومی زبان بن سکتی ہے۔ انہوں نے قومی زبان کے فروغ اور تعلیمی اصلاح وترقی کے لیے سید جمال الدین افغانی نے ایک اور انقلابی تجویز پیش کی جس پر تقریباً چالیس سال بعد حیدرآباد کی حکومت نے عمل کیا وہ تجویز یہ تھی کہ حیدرآباد میں مسلمانوں کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں پوری تعلیم ان کی مادری زبان اردو میں دی جایا کرے۔ سید جمال الدین افغانی نے جدید تعلیم کی اصلاح کو انتہائی ضروری قرار دیا۔

سید جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کی زبوں حالی مصائب اور تباہی اسلامی اتحاد ٹوٹ جانے کا نتیجہ تھا۔ افغانی کی کوشش تھی کہ اس دینی رشتہ کو پھر سے مستحکم بنا کے مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت وطاقت بحال کی جائے۔

اسلامی وحدت کو فروغ دینے اور اس تصور کی اشاعت کر کے مسلمانوں میں دینی رابطے کو مستحکم بنانے کے لیے افغانی نہایت وسیع پیمانے پر انجمنیں قائم کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

مولانا سندھی کے نزدیک جدید تعلیم یافتہ حضرات بہت اونچے ہو گئے ہیں اور علماء پستی میں چلے گئے ہیں مولانا سندھی چاہتے ہیں کہ علماء کو ذرا اونچا کیا جائے تا کہ دونوں گروہ مل کر انسانیت کی خدمت کر سکیں۔ اس لیے مولانا جدید سائنس اور انگلش زبان کی تحصیل پر بہت زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہر فن کو اس کی اصل زبان اور ان کی مقرر کردہ اصلاحات میں ہی سیکھنا

چاہیے خواہ وہ انگریزی، فارسی، جرمنی، اطالوی، جاپانی، روسی، چینی، ہندی وغیرہ ہو۔

اس عظیم مقصد اور مشرق کے مخصوص سیاسی حالات نے جمال الدین افغانی جیسے جذباتی اور حساس شخص کے لیے سرگرمی جدوجہد اور قوت عملی کا کوئی اور دوسرا میدان باقی نہیں چھوڑا اور وہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں کوئی ایجابی خدمت انجام نہ دے سکے۔ ان کو مغربی تہذیب کے گہرے اور تفصیلی مطالعہ اور اس کی روشنی میں ایک ایسا نظام مکتب فکر تیار کرنے کا موقع نہیں ملا جو بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ چل سکے۔ لیکن جدید تعلیم یافتہ اور ذہین مسلمان نسل کی نگاہوں میں وہ نہایت بلند مقام رکھتے تھے وہ ان چند افراد میں سے ہیں جنہوں نے جدید اسلامی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کی عظمت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مصر کے تعلیم یافتہ اور ذہین طبقہ کو الحاد اور لادینیت کی آغوش میں جانے کے کام میں مزاحمت کی۔

تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے ذہنی و علمی اثرات اور اس کی طرف سے اجمالی حقیقت کے باقی رہنے میں ان کی تحریروں کا ضرور دخل ہے۔ براکلمان لکھتے ہیں۔

مصر کی روحانی زندگی پر پہلے بھی اسلام کی حکمرانی تھی اب تک بھی یہی حال ہے یہ زیادہ تر ایک ایرانی جمال الدین کے باعث ہے۔ جنہوں نے سیاسی وجود سے اس بات کو ترجیح دی کہ اپنے آپ کو اس ملک کیطرف منسوب کر کے جہاں اپنی جوانی گزاری تھی۔

نئی تعلیم سے متعلق جمال الدین افغانی علماء کے خیالات کو رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علماء نے آج کل علم کو دو انواع میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک کو وہ اسلامی علم سے موسوم کرتے ہیں اور دوسرے کو یورپی علم سے اسی بناء پر وہ ایک مفید علم سے اکتساب روک دیتے ہیں وہ اس چیز کو قطعاً نہیں سمجھتے کہ علم جو شرف انسانی ہے کسی خاص گروہ یا قوم سے متعلق نہیں ہے وہ ایک ایسی چیز ہے جس چیزوں کی حقیقت معلوم ہوتی ہے جمال الدین افغانی علماء کے متعلق کہتے ہیں کہ

یہ کتنی انوکھی بات ہے کہ ان علوم کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتے ہیں جو ارسطو سے منسوب کیے جاتے ہیں جیسے ارسطو مسلمان تھا لیکن اگر کوئی نظریہ گلیلیوں اور نیوٹن سے متعلق ہو تو اسے کفر کہہ کر رد کر دیتے ہیں لیکن خود اسلام کے دشمن ہیں سب مذاہب میں سے اسلام علم کے قریب ترین اور حصول علم پر بہت زور دیتا ہے اور اسلام اور نئے علوم کے بنیادی اصولوں میں کوئی تضاد نہیں۔

سید جمال الدین افغانی نئی تعلیم کے خلاف نہیں تھے وہ صرف ان طریقوں اور ذرائع کے خلاف تھے جو مغرب پسند مسلمانوں نے اپنے ممالک میں مغربی تعلیم رائج کرنے میں اختیار کیے تھے انہوں نے مسلمانوں سے تاکیداً کہا کہ مغرب سے نئے علوم سیکھیں لیکن اس نیت سے کہ وہ انہیں اپنے ملک و ملت جن کا اپنا مزاج، تہذیب اور روایات بھلائی میں استعمال کریں۔

شیعہ سنی مفاہمت

انہیں اسلام کے احیا کی مخلصانہ خواہش نے تمام عمر متحرک رکھا انہیں اس کے احیاء کے امکان پر پورا وثوق تھا اور ان کا یہ جذبہ نہایت موثر اور کارگر تھا۔ انہوں نے سنیوں اور شیعوں کو باہم رعایتوں اور مناہمتوں کی بناء پر متحد کرنے کی کوشش کی۔ جس

کی اہمیت ابتداً سیاسی تھی لیکن اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ مذہبی رواداری کو دنیائے اسلام کے دیرینہ ازالے کے لیے بے حد ضروری سمجھتے تھے۔

سید جمال الدین افغانی جب دنیا بھر کے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی بات کرتے ہیں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی لحاظ سے دو بڑے متحارب گروہوں کے اختلافات اور ان کے خاتمہ کی بات نہ کریں۔ چنانچہ شعیہ سنی اختلافات کو سید جمال الدین افغانی نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ محسوس کیا ہے اور اسے مسلمانون کے اتحاد کے لیے زہر قاتل تصور کیا ہے اور انہیں اپنی اپنی حدود میں رہتے ہوئے۔ نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ سلجھانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ان کے نزدیک دونوں طبقہ اسلام کے لیے نہایت اہم اور ناگزیر ہیں انہوں نے شعیہ ایرانی اور سنی ترکی دونوں میں وقت گزارا۔ اور دونوں کو متحد ہو کر انقلاب برپا کرنے کی ترغیب دی وہ مذہبی رواداری کو دنیائے اسلام کے قدیم اختلافات کے ازالہ کے لیے اشد ضروری سمجھتے تھے۔

شاندار ورثے سے واقفیت

سید جمال الدین افغانی اسلام کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی زمانہ میں اس کو ناقابل تسخیر شوکت حاصل تھی اور بادشاہوں نے حکومت ہاتھ میں لے کر سارے کرہ ارض کو اپنی ہیبت اور دبدبہ سے چلایا اور ان بادشاہوں کے لشکروں کو بھی شکست نہ ہوئی۔ مسلمان دنیا میں جہاں بھی چلا جاتا وہاں وہ قلعے چھاؤنیاں بنالیت۔ وادیوں، میدانوں اور پہاڑوں میں ان لگائے ہوئے وسیع اور شاداب کھیت تھے۔ فن تعمیر بہترین طرز کے بنائے۔ ان پر بہت اچھی اچھی دستکاریاں بھی بنائی جائیں۔ غرضیکہ مسلمان اگر اپنی ماضی کے ورثے سے واقفیت پیدا کریں تو پھر اس طرح نہ کوئی اس لشکر کو شکست دے سکے گا اور نہ ہی یہ دنیا میں زیر ہوگا(25)۔

تعلیم:

افغانی کا نظریہ علم ایک اعتبار سے ان کی پوری فکر کا بنیادی عنصر ہے۔ وہ علوم کے ارتقائی مظہر کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ مختلف علوم انسان کی سماجی ضروریات کے جواب کے طور پر وجود میں آئے۔ تہذیبی ارتقا کی مختلف منزلوں پر مختلف علوم تشکیل پاتے گئے۔ دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ انسان نے روح کے تقاضوں پر بھی توجہ دی، کیونکہ اخلاقی فساد کے ساتھ مادی خوش حالی ممکن نہیں۔ چنانچہ فلسفہ اخلاقیات اور فقہ جیسے علوم وجود میں آئے۔

افغانی کا خیال تھا کہ ساری دنیائے انسانی، دنیائے صنعت یا دوسرے الفاظ میں دنیائے علم ہے۔ عالم کی سلطانی علم ہی کے ہاتھ میں ہے۔ تمام سیاسی فتوحات کے پیچھے علم کی کارفرمائی ہے۔ کلدانیوں، یونانیوں یا انگریزوں کی تمام فوجی فتوحات دراصل سائنس کی فتوحات ہیں۔ بالعموم اہل مشرق اور بالخصوص اہل اسلام کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی احیا کے لیے جدید علوم کا حصول شرط اول ہے۔ تمام علوم میں وہ فلسفے کو اولیت دیتے ہیں(26)۔

افغانی کا علماء کے بارے میں یہ خیال ہے کہ ان لوگوں نے علم کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ مسلمانوں کا علم اور

فرہنگیوں کا علم اور بعض مفید علوم سے مسلمانوں کو اسی لحاظ سے دور رکھتے ہیں۔ افغانی کے خیال میں یہ تقسیم مہمل ہے۔ "علم وہ شریف چیز ہے جس کو کسی خاص گروہ سے نسبت نہیں دی جا سکتی۔ وہ کسی شے سے پہچانی نہیں جاتی بلکہ ہر چیز علم سے پہچانی جاتی ہے۔۔۔۔ انسانوں کو علم سے نسبت دینی چاہیے نہ کہ علم کو انسانوں سے"۔ افغانی کی یہ تنقید آج بھی نہایت صحیح ہے۔ ان کا انداز فکر یوں ہے "کیسی تعجب کی بات ہے کہ مسلمان جن علوم کو ارسطو سے منسوب کرتے ہیں ان کو نہایت رغبت سے پڑھتے ہیں گویا کہ ارسطو بھی کوئی مسلمان مصنف تھا۔ لیکن اگر کسی چیز کو گلیلیو، نیوٹن اور کیپلر سے نسبت دی جاتی ہے تو یہ اسے کفر ٹھہراتے ہیں۔ علم کا ملجا و ماوا دلیل ہے اور دلیل نہ ارسطو ہے نہ گلیلیو۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسی جگہ دلائل پیش کریں گے جہاں علوم و معارف کے سیکھنے سے منع کرنا ہوتا ہے، اور بزعم خود اس کو اسلامی دین داری اور حفاظت دین سے تعبیر کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ تو اسلامی دین داری کے دشمن ہیں۔ تمام مذاہب میں علوم و معارف سے قریب تر دین اسلام ہے اور دین اسلام کے اصول اساسی اور علوم و معارف کے درمیان کوئی مخالفت نہیں"۔ افغانی خاص طور سے علمائے ہند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ وہ اپنی نظروں کو علمائے قدیم کی ناقص کتابوں اور دور دراز کار مباحث سے ہٹا کر اپنے اطراف عالم حقائق پر نظر کریں۔ وہ پوچھتے ہیں "کبھی تلگراف کے تاروں پر بھی غور کیا ہے جو جال کی طرح سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اس کے اسباب کے متعلق سوال کیا ہے؟۔۔۔۔ ہر روز تقریر تو کرتے ہیں کہ رویت خروج شعاع سے ہے، لیکن گراما فون جو سارے عالم میں پھیلا ہوا ہے تمھارے ذہنوں میں کوئی تحریک پیدا نہیں کرتا۔۔۔۔ (تم) ریکارڈنگ، فوٹو کیمرہ، رصدی دوربین، جراثیمی خوردبین اور ایسی چیزوں کو اپنا موضوع بحث نہیں بناتے"۔ اور پھر سوال کرتے ہیں "کیا یہ عالم دانا اور حکیم بینا کا عیب نہ ہوگا کہ ساری دنیا تو جدید فنون اور نت نئی ایجادوں اور تازہ بہ تازہ انکشافات سے معمور ہو جائے اور اس کے باوجود ان کے اسباب و علل سے بالکل بے خبر رہے۔ کیا کسی محقق کو یہ زیب دیتا ہے کہ وہ مجہول کے متعلق تو باتیں بنائے مگر معلوم مطلق سے بے خبر رہے" (27)۔

خلاصہ کلام

۱۔ سید جمال الدین افغانی کے تصورِ انقلاب میں سب سے اہم چیز مسلمانوں میں باہمی تعاون کا فقدان ہے۔ انہوں نے اتحاد اسلامی کو اہمیت دیتے ہوئے تمام اسلامی ممالک کے نظام ہائے حکومت کا بغور جائزہ لیا اور یہ نچوڑ/نتیجہ نکالا کہ ساری دنیا کے مسلمان تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ زوال کی طرف جا رہے ہیں۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنے ایک مضمون میں مسلمانوں کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا ہے۔

''مسلمان ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ عوام تو کجا علماء بھی جن کا کام امت کے عقائد کی حفاظت ہے۔ باہم رسم و رواہ اور مراسلت نہیں رکھتے۔ ترکی عالم حجازی عالم سے بے خبر ہے اور ہندی عالم افغانی عالم سے ناآشنا۔ آج پوری دنیا اسلام کی یہی حالت ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی ملک کے علماء بھی آپس میں کوئی ارتباط نہیں رکھتے اور اس قدر دور ہو گئے ہیں کہ قرابت کے پیوند بھی باقی نہیں رہے۔ ہر ایک کو صرف اپنی ذات سے سروکار ہے۔ وہ اپنے وجود سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہ انجام بیگانگی جیسی عادت امت اور علماء میں ہے۔ ویسی ہی حالت مسلمانوں کے ملکوں اور سلاطین کی بھی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ نہ عثمانیوں کی سفارت مراکش میں ہے اور نہ مراکش کی عثمانیوں میں۔ ایک دوسرے سے منہ موڑنے کا رجحان اس نوبت تک پہنچ چکا ہے کہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں کا ایک دوسرے ملک سے اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک کوئی واسطہ نہیں رکھتا اور کبھی حج کے موقع پر ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں سے کچھ واقف ہو جاتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کی یہ حالت اور اس کے ماننے والوں میں ملی احساس کی یہ کمزوری انتہائی افسوس ناک ہے۔

اسی وجہ سے سید جمال الدین افغانی نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے اتحاد کی کوششیں کیں۔ ایران، مصر، ترکی، تمام عرب ممالک اور برصغیر پاک و ہند میں غرض پوری دنیا میں عالم اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ان کا مشن تھا۔ وہ چاہتے تھے سب اسلامی ممالک پر مشتمل اور ایک خلیفہ کی سربراہی کو تسلیم کرنیوالی خلافت قائم ہو جائے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے انقلابی نظریات/تصورات پیش کیے ہیں ان کا زیادہ تر تعلق برصغیر پاک و ہند سے ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا دور ۱۸۷۲ء سے ۱۹۴۴ء تک کا ہے۔ اس دوران جب سلطنت عثمانیہ ختم ہوئی۔ خلافت باقی نہیں رہی تو انہوں نے برصغیر کے اتحاد کی کوششیں کیں۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان متحد ہو جائیں اور برصغیر میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیں۔ اس کیلئے مولانا سندھیؒ نے ۱۹۲۲ء میں ایک مسودہ مرتب کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کو متحد کرنے کے لیے کوشاں تھے۔

۲۔ سید جمال الدین کے خیال میں مسلمانوں کے تشخص کے احیاء کے لیے بیرونی تسلط سے آزادی بے حد ضروری ہے۔ تمام مسلم ممالک سیاسی طور پر خود مختار اور آزاد ہوں وہ فوری سیاسی انقلاب کے خواہشمند رہے ہیں۔

جمال الدین افغانی کے تصور انقلاب میں بین الممالک مسلم اتحاد کے ساتھ ساتھ شیعہ سنی اتحاد پر بھی زور دیا گیا ہے۔
جمال الدین شیعہ سنی اختلاف کے حامی نہیں بلکہ وہ دونوں فرقوں کے اتحاد کے ذریعے اسلام کو تقویت اور مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔
مولانا عبیداللہ سندھی سیاسی طور پر وفاقی نظام حکومت کے حامی نظر آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ برصغیر میں ایک وفاقی نظام حکومت ہو۔ جس میں مسلمانوں کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا جائے۔ اس کے علاوہ وہ کمزوروں کے حقوق کے بھی علمبردار نظر آتے ہیں۔

۳۔ سید جمال الدین افغانی کا دور ۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۷ء تک کا ہے۔ اس وقت سلطنت عثمانیہ بھی موجود تھی۔ سید جمال الدین افغانی رنگ ونسل کی تعریف اور قوم و وطن کے اختلاف و تعصب پر مبنی مغربی تصور قومیت کے سخت مخالف تھے۔ وہ تصور ملت کے قائل تھے۔ چنانچہ سید جمال الدین افغانی نے اپنے مضمون میں اس کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

افراد سے جماعتیں بنتی ہیں۔ ایسی جماعتوں کے خیالات میں اتحاد ہوتا ہے۔ ان کے مفادات مشترک ہوتے ہیں۔ پھر یہ جماعتیں لالچ میں آجاتی ہیں اور آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ اس طرح قومیت کا جذبہ وجود میں آجاتا ہے اور یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ فلاں روسی ہے۔ فلاں چینی ہے، فلاں ہندی ہے۔ یہ عصبیت ضرورت سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ضرورت باقی نہ رہے تو عصبیتیں بھی ختم ہوجاتی ہیں۔ مسلمان ان تمام عصبیتوں سے بالاتر ہوکر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ جب افراد اسلام کے فرزند بن جاتے ہیں تو وہ صرف ایک قومیت رکھتے ہیں۔ اسلام کی قومیت میں تمام قومیتیں گم ہوجاتی ہیں اور وہ قوم، قبیلہ اور نسلی بندھنوں سے بالکل آزاد ہوجاتا ہے۔ اس طرح وہ عالمگیر رابطہ قائم کر لیتا ہے۔

مولانا سندھی نے جو مسودہ ۱۹۲۲ء میں مرتب کیا۔ وہ اس وقت کابل سے روس ہوتے ہوئے ترکی پہنچتے ہیں اور عصمت پاشا کمال اکابر کو بتانا چاہتے تھے۔ حصول آزادی اور انقلاب حکومت کے بعد ہندوستان کے مسلمان آزاد اور فعال قوم کی طرح رہ سکیں گے۔ اس غرض کیلئے مولانا عبیداللہ سندھی کسی وحدانی یا مرکزی حکومت کی بجائے برعظیم کو مختلف آزاد ممالک میں تقسیم کرنا اور صرف سیاسی اتحاد کے ذریعے متحد رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سفرنامہ کابل اور ذاتی سوانح میں بھی جو علیحدہ چھپ کر شائع ہوچکے ہیں۔ صاف صاف تحریر ہے کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں محض ایک اقلیت میں رہ جانے پر قابض نہیں۔

۴۔ جمال الدین افغانی نظریات اور عقائد کو ٹھوس بنیادوں پر قائم کرنے کے خواہش مند رہے ہیں۔ اس میں عقیدہ توحید پر خاصا زور دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

جمال الدین افغانی کی طرح مولانا عبیداللہ سندھی نظریات اور عقائد میں نظریہ توحید کے زبردست حامی ہیں۔ ان کے خیال میں توحید پر ایقان اور ایمان کے بغیر مسلمانوں کا اتحاد ممکن نہیں۔

۵۔ تقویٰ کے اعلیٰ درجات کے حصول کے ساتھ جمال الدین افغانی تعمیر سیرت و کردار پر بھی زور دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں سیرت اور کردار کے بغیر مسلمانوں کے لیے اپنا وجود برقرار مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ جس کے لیے انہوں

نے عقائد کی تعلیم مدلل انداز میں پیش کی۔ اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کے لیے تمام پہلوؤں سے تعلیم کی افادیت اور اہمیت پر بھی زور دیتے نظر آتے ہیں۔ اس تعلیم کے بعد باہمی تعاون کی فضا قائم کی جائے۔

۶۔ مولانا عبیداللہ سندھی سیاست میں انقلاب کے ساتھ معاشی طور پر بھی استحکام کے لیے کوشاں ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق معاشی استحکام کے بغیر سیاسی استحکام ممکن نہیں۔ انھوں نے اس استحکام کے لیے سب سے پہلے جس بات پر زور دیا وہ سرمایہ داری نظام کا خاتمہ ہے۔ ان کے خیال میں سرمایہ داری نظام مسلمانوں کی ترقی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس موضوع پر مولانا افغانی نے تفصیلی اور واضح نظریات نہیں دیئے۔

۷۔ سید جمال الدین افغانی اور مولانا عبیداللہ سندھی میں ایک چیز یہ بھی مشترک تھی کہ دونوں نے اپنی اپنی تحریکوں کو کامیاب کرنے کیلئے تقریباً پوری دنیا کا سفر کیا۔ وہاں کی انتظامی کارروائی دیکھی۔

ان دو حضرات نے اپنے اپنے دور میں مختلف ممالک کے سفر کیے۔ جن کا ذکر دوسرے اور تیسرے باب میں کیا گیا ہے۔ لیکن مختصر یہ کہ افغانستان، روس، جرمنی، ہندوستان، مصر، ترکی اور حجاز کے سفر کیے۔

سید جمال افغانی نے درج ذیل ممالک کے سفر کیے:

ہندوستان، روس، مصر، ترکی، ایران، یورپ، جرمنی، بغداد اور حجاز۔

مولانا سندھی نے جن ممالک کے سفر کیے۔ وہ درج ذیل ہیں:

افغانستان، روس، ترکی، حجاز

۸۔ جمال الدین افغانی کے تصورِ انقلاب میں مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے شاندار ماضی پر بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ ان کے خیال میں کامیاب انقلاب کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے ورثہ سے واقف رہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی طرح جمال الدین افغانی بھی جاگیرداروں سے ناخوش ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی کج عملی ان انقلابات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

افغانی تصورِ انقلاب میں ایران اور افغانستان کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان کے بقول ایران اور افغانستان کے بغیر اس انقلاب کے قابل ذکر نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا یہ دونوں ممالک اس خط کی اہم اکائی ہیں۔

۹۔ جمال الدین افغانی نے اپنے نظریہ تعلیم میں اس بات پر زور دیا ہے۔ تعلیمی اصلاح کے سلسلے میں علامہ افغانی دینی تعلیم کے طریقے میں اصلاح کو انتہائی ضروری خیال کرتے تھے اور اس بارے میں اپنے خیالات کو بغیر کسی جھجک کے صاف صاف ظاہر کر دیتے تھے۔ چنانچہ اپنے ایک مقالے میں جو "معلم" (حیدرآباد) میں شائع ہوا تھا، تعلیم کی خرابیوں اور خامیوں اور علمائے دین کی بے علمی و بے خبری کا حال بیان کرتے ہوئے بہت ہی واضح طور پر لکھا کہ "فی زمانہ مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ شروع سے آخر تک بگڑا ہوا ہے۔ مثلاً عربی کو لیجئے۔ عربی کی تعلیم کا مفہوم علم نحو کو حاصل کرنا سمجھا جاتا ہے۔ علم نحو کے حاصل کرنے کا اصل منشا اور مقصد یہ ہے کہ صحیح طور پر زبان کا بولنا اور لکھنا پڑھنا آ جائے اور بس۔ لیکن مسلمان طلباء کا تمام وقت اس کی لایعنی بحثوں میں اور

فلسفیانہ موشگافیوں میں صرف ہو جاتا ہے اور عمر بھر عربی پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو عربی میں دو جملے صحیح بول سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔حتیٰ کہ دو سطر بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔کیونکہ تعلیمی میدان میں واقفیت کے بغیر عمل ممکن نہیں اور جب تعلیمی انقلاب برپا ہو جائے گا تو سیاسی انقلاب کے نتائج جلد رونما ہوں گے۔

مولانا عبیداللہ سندھی بھی تعلیمی میدان میں جدید تعلیم کے حامی نظر آتے ہیں اور اس نکتہ پر جمال الدین افغانی کے ہم خیال ہیں کہ جدید تعلیم بے حد اہم کردار ادا کر سکتی ہے کہ سیاسی انقلاب رونما ہو سکے۔

۱۰۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے تصورِ انقلاب میں جہاد اور آزادی فکر کو فوقیت دی گئی ہے۔ان کے خیال میں قوموں کے وجود کی بقاء جہاد کے بغیر ممکن نہیں اور فکری طور پر آزادی ہی قوموں کو آزاد اور خود دار بناتی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنے انقلاب کی بنیاد قرآن حکیم کو ٹھہراتے ہیں اور قرآنی فکر کے داعی کے طور پر قرآن مجید کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کراتے ہیں کیونکہ اصل کامیابی قرآنی تعلیمات کی روشنی میں انقلابی لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔

۱۱۔ سید جمال افغانی نے جو سہ نکاتی لائحہ عمل دیا ہے وہ درج ذیل ہے:

مسلمانوں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے تین اصولی چیزوں کی ضرورت ہے:

۱۔ ان تدابیر کو اچھی طرح سمجھ لینا جن کے ذریعہ خطرات کی مدافعت کی جا سکتی ہے۔

۲۔ خطرات پیش آتے ہیں ان کی مدافعت میں ہمہ تن مشغول ہونا اور اس مہم میں اتفاق رائے سے کام لینا۔

۳۔ آنے والے خطرات کا حقیقی احساس کر کے ایک دوسرے کے ساتھ دلی ہمدردی رکھنا اور اخوت کے رشتہ میں منسلک ہو جانا۔

جبکہ مولانا عبیداللہ سندھی کا لائحہ عمل انقلاب کے سائنسی اصولوں پر مبنی ہے، وہ کہتے ہیں:

انقلاب کا طریقہ کار یہ ہے کہ خرابی پیدا کرنے والی مقتدر جماعت کے خلاف کوئی صاحب فکر دعوت و تبلیغ شروع کرتا ہے اور وہ اپنے گرد ایسی جماعت پیدا کر لیتا ہے جو اپنے نصب العین پر اپنا سب کچھ جان و مال، عزیز و اقارب اور اپنی ہر محبوب شے قربان کرنے کو تیار ہوتی ہے۔ جماعت صاحب اقتدار جماعت سے وہ اگر اقتدار چھیننے کی کوشش کرتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ کمزور جماعت سے انتفاع کر رہی تھی۔ یہ طریق اکثر اوقات تبدیلی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔اس انقلابی طریق کار کے تین ضروری جزو ہیں:

۱۔ نصب العین (Objective) ۲۔ جماعت (party)

۳۔ لائحہ عمل (Line of Action)

نصب العین سے مراد یہ ہے کہ کوئی جماعت اپنے سامنے سوسائٹی میں ایک غلط نظام پاتی ہے۔وہ جماعت اسے برباد کر کے اس کی جگہ صحیح نظام لانا چاہتی ہے۔تو یہ تخریب اور اس کی جگہ صحیح نظام کے قیام کا ارادہ اس کا نصب العین کہلاتا ہے۔

جماعت سے مراد یہ ہے کہ چند لوگ جو ہم فکر ہیں وہ اپنے فکر کے مطابق عمل کرنے پر جمع ہو جاتے ہیں اور اس میں کوئی

اونچ نیچ نہیں ہوتی۔ وہ اپنے نصب العین کو جانتے ہیں اور اس کی خاطر ہر خطرات برداشت کرتے ہیں۔ وہ ایک جسم کی طرح کام کرتے ہیں۔ اس حیثیت میں وہ جماعت کہلاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کل قومی پیمانے پر انقلابی تحریک پیدا کرنی چاہتا ہے۔ اس کا ایک نصب العین یا مرکزی فکر ہے۔ وہ اس فکر کو ایک جماعت کی مکمل تیاری کے ذریعے سے انسانی سوسائٹی کے ایک حصے اور ملک کے ایک خطے میں خاص شکل میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ کوئی جماعت ضبط کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی اور جتنا بڑا انقلاب ہوگا۔ اتنے ہی زبردست ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔

جو جماعت بہت سخت ضبط کی مالک ہوتی ہے۔ وہ صلح اور جنگ میں اپنی مرکزی جماعت کے فیصلے کی پوری پوری فرمانبرداری کرتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ نے جو جماعت پیدا کی وہ جنگ میں ضبط کے مظاہرے کئی بار کرچکی۔ صلح کرنے میں ضبط کے بہترین مظاہرے کا موقعہ حدیبیہ میں پیش آیا۔ جب آنحضرت ﷺ نے کمزور دشمن کی بدترین شرطیں صرف اس لیے مان لیں کہ وہ بنیادی طور پر ان اصول کی حفاظت چاہتا تھا۔ جن کی حفاظت کے لیے یہ انقلاب برپا کیا جارہا تھا یعنی دین حنفی کے مرکز۔ کعبۃ اللہ کا احترام۔ آپ کی جماعت نے اس اصول کو پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی اس صلح کو صرف اس لیے مان لیا کہ وہ ایک زبردست ضبط میں آئے ہوئے تھے۔ اس ضبط کی انتہا یہ تھی کہ جب آپؐ نے اس جماعت سے موت پر بیعت لینی چاہی تو ہر ایک شخص نے ٹھنڈے دل کے ساتھ یہ سمجھ کر بیعت کی کہ یہ موت یقینی ہے اور جو شخص بھی اس وعدے کو توڑے گا۔ اسے ضبط توڑنے کی بڑی سے بڑی سزا بھی مل سکتی ہے۔

لائحہ عمل سے مراد یہ کہ وہ جماعت جس کا نصب العین متعین ہے۔ اپنے مقصد کا حاصل کرنے کے لیے ایک طریق کار سوچتی ہے۔ اس پر خوب غور وفکر کرتی ہے اور آخر کار سب افراد اسے تسلیم کر کے اس پر گامزن ہونا قبول کر لیتے ہیں۔ جب تک کسی جماعت میں یہ تینوں اجزاء نہ پائے جائیں وہ انقلابی نہیں کہلاسکتی۔ اس جماعت کا فکر شروع سے آخر تک ایک ہی رہتا ہے۔

چونکہ صاحب اقتدار جماعت لڑے بھڑے بغیر اپنا اقتدار نہیں چھوڑ سکتی۔ اس لیے انقلاب میں عموماً جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ اس لیے انقلابی جماعت جنگ کو بطور ایک ضرورت کے جائز سمجھتی ہے مگر لڑنے اور نہ لڑنے کا فیصلہ حالات کے مطابق کرتی ہے۔ ابتداء میں وہ خاموشی کے ساتھ کام کرتی ہے اور رائے عامہ کو اپنے ساتھ ملاتی ہے۔ یہاں تک کہ زمام اقتدار سنبھالنے کے قابل ہوجاتی ہے۔ اس تیاری کے زمانے میں وہ مخالف کی طرف سے ہر قسم کے اشتعال کے باوجود وہ کھلم کھلا لڑائی سے پرہیز کرتی ہے اور بطریق احسن طرح دیتی جاتی ہے اور سب حملوں کو نہایت استقامت اور استقلال کے ساتھ برداشت کرتی ہے۔ اس کے ارکان کو اپنے نصب العین کا پورا پورا علم ہوتا ہے اور سب میں وحدۃ فکری ہوتی ہے۔ اس لیے دشمن کا پروپیگنڈہ یعنی "فکری حملہ" ان کو گمراہ نہیں کرسکتا۔ ان کی وحدۃ فکری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں وحدۃ عملی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے نفع ونقصان کو مشترک سمجھتے ہیں۔ اس لیے دشمن کا "اقتصادی حملہ" بھی انہیں منتشر نہیں کرسکتا۔

سفارشات وتجاویز

قال اللّٰہ تبارك و تعالیٰ فی القرآن المجید والفرقان الحمید:

ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين"(28)

ترجمہ: (پست ہمت نہ بنو اور غمگین بھی نہ ہو، اگر تم مومن ہو تو تم ہی برتر و بالاتر رہو گے)۔

اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ اور آخری کتاب قرآن حکیم کے ماننے والوں کو دنیا میں ذلیل وخوار اور محکوم و مجبور بنا کر نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اُن کو ہر قسم کی برتری اور فضیلت عطا کر کے قیام حق کیلئے دنیا پر حکمرانی عطا کرنا چاہتا ہے تا کہ یہ لوگ دوسروں کیلئے نمونہ، رہنما اور اللہ تعالیٰ کے نائب بن کر اس کے دین کی سربلندی کا باعث بنیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے ماننے والوں کو اس دنیا میں بھی برتر و کامیاب، معزز و مکرم اور آخرت میں بھی انتہائی عیش و آرام کے مقام پر پہنچانا چاہتا ہے۔

"واتبع فيما اتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصيبك من الدنيا وأحسن كما أحسن الله إليك"(29)

ترجمہ: اللہ نے جو کچھ تجھ کو دے رکھا ہے اس میں آخرت کے گھر کی بھی فکر کر اور دنیا میں سے اپنے حصّے کو بھی فراموش نہ کر اور جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو دوسروں کے ساتھ احسان کر)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ماننے والوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ اُن کو دنیوی عز و جاہ عنایت فرمائے گا لیکن اس کے لیے ایمان اور عمل صالح کی کڑی شرط رکھی ہے۔ گویا ایمان اور عمل صالح کی موجودگی دیکھتے ہی وہ اپنا وعدہ پورا فرما دے گا۔ وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔

"وعد الله الذين امنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم فی الأرض كما استخلف الّذين من قبلهم"(30)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے، اُن کو ضرور ملکوں کی سلطنت وحکومت عطا کرے گا جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں کو حکومت وسلطنت عطا کی تھی۔

دوسری جگہ پر ارشاد فرمایا:

"ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا(31)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کافروں کو مومنوں پر ہرگز حاوی نہ ہونے دے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو غالب وحکمران دیکھنا چاہتا ہے اور ان کی خصوصیات کو اس انداز میں بیان فرماتا ہے۔

"الذين إن مكناهم فی الأرض أقاموا الصلاة وآتو الزكوة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر ولله عاقبة الأمور(32)

ترجمہ: ان مسلمانوں کو اگر ہم زمین میں حاکم بنا دیں گے تو یہ نمازیں پڑھیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور اچھے کاموں کا حکم

دیں گے اور بُرے کاموں سے لوگوں کو منع کریں گے اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ قوم کا بڑا حصہ نماز روزہ وغیرہ یعنی عبادات سے بالکل ہی متنفر ہے۔ جو لوگ نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں ان کی نمازیں اور روزے محض رسمی ہیں جو بغیر روح کے جسم کی مانند ہیں۔ نہ نمازوں میں خشوع ہے نہ اُن نمازوں میں تنھی عن الفحشاء والمنکر کا کوئی اثر پایا جاتا ہے۔ ماہ رمضان میں لوگوں کی تنگ مزاجی، بزدلی اور بدکلامی اکثر دور سے نظر آتی ہے۔

ایثار، قربانی، قومی فائدے کو ذاتی فائدے پر ترجیح دینا وغیرہ ضروری صفات کا نام و نشان بھی مسلمانوں میں نظر نہیں آتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ آیت استخلاف میں موجود وعدے کو پورا ہونے کے منتظر ہیں حالانکہ یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اگر افراد علیحدہ علیحدہ اپنے مفادات کو پیش نظر رکھیں اور قومی مشترکہ مقاصد کو نظر انداز کر دیں تو کبھی قوم کو کامیابی و سرفرازی حاصل نہیں ہو سکتی، یہی حالت موجودہ دور میں مسلمانوں کی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ من حیث القوم مسلمانوں میں سلطنت و فرمانروائی کی قابلیت وصلاحیت موجود نہ ہو اور وہ خلیفہ و فرمانروا بن جائیں۔

امت مسلمہ کے عروج و زوال کی داستان ہمیں یہ سبق دے رہی ہے کہ جب مسلمانوں نے قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل کیا، اتحاد و اخوت کو برقرار رکھا اور بزدلی، منافقت، خود غرضی و مفاد پرستی سے پہلو بچاتے ہوئے اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پابندی کو اپنے لئے لازم ٹھہرایا تو فرانس سے لے کر چین و ہندوستان تک اسلام کا پرچم لہرا دیا اور توحید کا پیغام عام کر دیا۔ لیکن جب اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کی خلاف ورزی کی، علم و صنعت کی طرف توجہ نہ کی اور مذہب کے قوانین بھول گئے تو مغربی اقوام کے غلام بن گئے اور ذلت و پستی کی گہرائیوں میں جا پڑے۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اگر ممکن ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن و سنت کی اصلی تعلیمات کی سچی پیروی سے ہی ممکن ہے۔ اسلام اپنے اندر وہ تمام خصوصیات رکھتا ہے جو کسی قوم کے عروج میں انتہائی اہم کردار کی حامل ہیں۔ ضرورت ہے تو بس اتنی کہ مسلمان اپنے اندر یہ خصوصیات پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یہ اپنا فرض پورا کریں، اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کریگا۔

موضوع تحقیق پر کیے گئے تحقیقی کام کی روشنی میں اُمت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے استحکام اور عروج کیلئے درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ اقوام کی تقدیر افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے امت مسلمہ کے ہر فرد کو اپنی قومی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے۔ اگر ایک فرد قوم و ملت کیلئے کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا تو یہ عمل بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنے ذمے تمام فرائض کی ادائیگی کی کوشش کرے۔ اپنے اور گھر والوں کے عمدہ اخلاق اور اپنے روزمرہ کے فرائض کی بجا آوری سے بھی ایک فرد امت کی مضبوطی و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ احساس ذمہ داری کو اجاگر کیا جائے اور اپنی موجودہ حالت کو بہتر مقام پر لے جانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔

۲۔ احساس ذمہ داری اور فرائض کی بجا آوری کی خصوصیات کسی قوم کے افراد میں تب ہی آ سکتی ہیں۔ جب اس قوم میں

تعلیم و تربیت کا اعلیٰ نظام موجود ہو۔ اگر تعلیمی نظام کو مربوط اور قومی و ملی ضروریات سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو اس سے قوموں کے انفرادی و اجتماعی کردار پر بھرپور اثر پڑتا ہے۔ تعلیم کی اشاعت میں وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دینی تعلیم کی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

دینی و دنیوی تعلیم میں فرق رکھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ دین کو پس پشت ڈال کر مسلمان دنیا کی طلب و جاہت میں غرق ہو چکے ہیں۔ امت مسلمہ کی ترقی کیلئے اگر سائنس کی تعلیم ہو تو وہ بھی دینی ہی کہلائے گی اور اگر ذاتی اغراض و مقاصد اور روزی کمانے کی غرض سے قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا جائے تو وہ بھی دنیاوی علوم میں شامل ہوگا۔ لہٰذا تعلیم کے نظام سے دنیاوی حرص و طمع کو ختم کرنے کی اشد ضرورت ہے اور تعلیم کا بنیادی مقصد کردار کی تعمیر و ترقی ہونا چاہیے۔

۳۔ قومی کردار کی تعمیر و ترقی میں سب سے زیادہ ذمہ داری علماء، اساتذہ اور محققین و مفکرین پر عائد ہوتی ہے۔ علماء کا کردار اس حوالے سے بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ علماء ہیں جو قوم کی افراد کی درست سمت میں رہنمائی کر سکتے ہیں اور اخلاقیات و اعلیٰ کرداری خصوصیات کی ترویج و اشاعت میں بھرپور حصہ لے سکتے ہیں۔ اساتذہ کا اپنے دائرہ کار میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اہم مقام ہے۔ اساتذہ کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو صرف معلومات منتقل نہ کریں بلکہ طلبہ کی انفرادی صلاحیتوں کو اجاگر بھی کریں۔ اساتذہ اپنے طلبہ میں وہ قوت پیدا کر سکتے ہیں کہ جس کی وجہ سے آگے آنے والی نسلیں اخلاقی انحطاط اور انتشار و افتراق سے اپنے آپ کو بچاسکتی ہیں۔ اس ضمن میں محققین اور مفکرین کا کردار بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ آج کا دور کافی حد تک آزادی رائے کا دور ہے اور مفکرین اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کے اجتماعی مسائل اور انکے حل کیلئے اپنے افکار و نظریات لوگوں تک پہنچاسکتے ہیں۔ ضرورت ہے تو اس امر کی کہ ان کے درمیان باہمی رابطے اور اتفاق کے ماحول کو پروان چڑھایا جائے تا کہ یہ لوگ اپنی قوتوں کو یکجا کر کے ایک نصب العین کے حصول کی طرف قوم کی رہنمائی کر سکیں۔

۴۔ اگر علماء، اساتذہ اور مفکرین قوم کی صلاحیتیں بھرپور طریقے سے اپنے اپنے دائرہ عمل میں مصروف کار ہو جائیں تو یہ رہنما قوم کے سیاسی شعور کا باعث بن سکتے ہیں۔ سیاسی شعور کی بیداری اور ہر فرد کو اس کی اہمیت اور کردار کے مثبت و منفی نتائج سے آگاہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

۵۔ جب عوام میں سیاسی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو ان کیلئے اتفاق و اتحاد حاصل کرنا مشکل نہیں رہتا۔ اندرونی طور پر مسلمانوں میں علاقائی، مذہبی، نسلی اور لسانی تعصبات نے قوم کے شیرازے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اتفاق و اتحاد کے فضائل و برکات سے اس قوم کے افراد آگاہ نہیں ہیں۔ کہیں علاقائی تعصب کی بنا پر الگ حکومت کا مطالبہ ہے تو کہیں لسانی تعصب کو ہوا دے کر چند افراد اپنے مذموم اغراض و مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ مذہبی میدان میں اس سے بھی زیادہ خطرناک صورتحال ہے۔ علمائے امت جو کہ مسلمانوں کے اتحاد کی علامت بن کر اپنا کردار ادا کر سکتے تھے، ایک محلے کے لوگوں میں اتفاق کرانے کے قابل نہیں رہے بلکہ ان علماء سوء کی وجہ سے فرقہ در فرقہ مسلمان تقسیم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ ایسے علماء کی تربیت اور اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ علماء اسلام کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو ایک نکتہ اور مرکز پر جمع کریں جو قرآن و سنت ہے اور جسے ''حبل اللہ'' یعنی اللہ کی رسی

سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۶۔ جب کسی قوم میں اتفاق کی روح کارفرما ہوتو اس کو عروج کی جانب لے جانے کیلئے چند سرکردہ افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ان افراد کے انتخاب اور خصوصاً سربراہ قوم کے تعین کیلئے انتہائی سوجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔اراکین حکومت کی خصوصیات میں دین کو بنیادی اہمیت دینی چاہیے۔اسکے علاوہ معاملہ فہمی، سخت کوشی، اخلاص اور اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کو دیکھ کر اراکین سلطنت کا انتخاب کرنا چاہیے کیونکہ جب کسی سلطنت کیساتھ دینی عصبیت مل جائے تو اسکی مضبوطی واستحکام اور عزت وافتخار کا باعث بنتی ہے۔مذہبی جوش وخروش قوم کے نقطہ نظر کو ایک پہلو پر مرتکز کرنے کا باعث بنتا ہے۔ایسی بصیرت رکھنے والی قوم کو شکست دینا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

۷۔ جس طرح سیاسی سطح پر ایک قوم کا ہونا ضروری ہے اسی طرح مذہبی سطح پر بھی جدید ذرائع ابلاغ کے استعمال اور کانفرنسوں کے ذریعے متفقہ لائحہ عمل انتہائی ناگزیر ہے۔انٹرنیٹ اور ٹیلی کمیونیکیشن نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ دینی مسائل میں یگانگت کیلئے علمائے امت پر مشتمل ایک اجتہادی کونسل بنائی جائے جس میں شریک ممبران اپنے اپنے علاقے کے سربراہ ہوں اور مشترکہ فیصلوں کی ترویج واشاعت میں اپنا کردار بخوبی ادا کر سکتے ہوں۔اس مقصد کیلئے ایک نیٹ ورک کی ضرورت ہے جس میں ہر شہر، ہر صوبے اور ہر ملک کی سطح پر علماء کی کونسلیں قائم کی جائیں جن کے ذریعے مکمل باہمی رابطے اور اجتماعی مفادات پر متفقہ ردعمل کو ممکن بنایا جاسکے۔

۸۔ جدید ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے پوری دنیا تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی بھی ضرورت ہے اور اسلام کے حقیقی تصور کو اجاگر کرنے اور اسلام پر عائد اعتراضات کا جواب دینے کی بھی ضرورت ہے۔لیکن اس حوالے سے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے اور جہاد جیسے اہم فرائض سے بیزاری ظاہر کرنے کی گنجائش قطعاً نہیں ہے۔

۹۔ مذہب وسائنس کا دراصل کوئی تقابل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان دونوں کا دائرہ کار ہی مختلف ہے لیکن اگر سائنسی ومنطقی دلائل کو مذہب کی تائید کیلئے استعمال کیا جائے تو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اہمیت وقطعیت بہر حال وحی سے حاصل شدہ احکامات کو دی جائے۔ایک اور ضروری امر یہ بھی ہے کہ مذہب وسائنس پر وہی لوگ بحث کریں جو گہرا مذہبی علم اور سائنس پر بھی کافی حد تک عبور رکھتے ہوں۔جو لوگ صرف مذہب یا صرف سائنس کا گہرا علم رکھتے ہیں وہ انفرادی کی بجائے مشترکہ کمیٹیاں بنا کر متفقہ تحقیقات سے بہتر نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔اس طرح افراط وتفریط سے بچتے ہوئے ایسا معتدل اندازِ فکر اختیار کیا جاسکتا ہے جس کے مثبت اثرات زیادہ سے زیادہ اور منفی اثرات کم سے کم ہوں۔

۱۰۔ اسلامی تعلیمات کو پوری تحقیق اور علمی جستجو کے بعد جدید ترین اسلوب میں پیش کرنے کی بھی ضرورت ہے اور جدید مسائل کے حل کیلئے تحقیقات کے دائرہ کار کو اور وسیع کرنے اور باہم مربوط کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ہر ادارے اور ہر ملک میں مقامی نیٹ ورک اور پھر ان سب کو عالمی نیٹ ورک کے ساتھ منسلک کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ تحقیقی میدان میں مشترکہ کاوشوں سے مفید نتائج سامنے آسکیں۔تحقیق سے منسلک افراد کی حوصلہ افزائی اور تمام ضروری سہولتوں کی فراہمی کو بھی ممکن بنانے

کی ضرورت ہے۔

۱۱۔ عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کیلئے تحقیقی کام کو مزید بڑھانے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر سید جمال الدین افغانی اور مولانا عبیداللہ سندھی کے نظریات سے متاثر ہونے والے طبقوں اور تحریکوں پر بھی تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی کامیابی و ناکامی کی اصل وجوہات تک پہنچ کر اپنے لیے کسی واضح اور درست لائحہ عمل کا انتخاب کیا جاسکے۔

حوالہ جات

1۔ ابوالحسن علی، سید، مولانا ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، کراچی ۱۹۷۴ء، ص ۱۳۳-۱۳۹۔

2۔ مولانا عبیداللہ سندھی، قرآنی دستور انقلاب، ادارہ نشریات اسلام، اردو بازار لاہور، ص ۷۱۔

3۔ محمد سرور، مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات زندگی، تعلیمات وسیاسی افکار، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۵۸۔

4۔ ایضاً، ص ۵۹۔

5۔ محمد سرور، مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات زندگی، تعلیمات وسیاسی افکار، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، جولائی ۱۹۷۶ء، ص ۶۵۔

6۔ ایضاً، ص ۶۶۔

7۔ ایضاً۔

8۔ ایضاً، ص ۶۷۔

9۔ عبدالحمید الخطیب، الاحید الذاہبی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۸۷۔

10۔ رسالہ التوحید، پہلا ایڈیشن، قاہرہ، ۱۳۱۵ھ، ص ۲۳۔

11۔ ایضاً۔

12۔ محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، اردو بازار لاہور، ص ۸۸۔

12(a)۔ جمال الدین افغانی (اتحاد عالم اسلامی کا نقیب) مرتبہ محمد اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ص ۵۳۷، ۲۰۰۵ء

13۔ عبدالحمید سواتی، مولانا، مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم وافکار، ادارہ نشر واشاعت بدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ، ص ۲۶۲۔

14۔ ایضاً۔

15۔ محمد سرور، مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات زندگی، تعلیمات وسیاسی افکار، ص ۶۴۔

16۔ ایضاً، ص ۱۷۔

17۔ ایضاً، ص ۱۸۹۔

18۔ ایضاً۔

19۔ محمد سرور، مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات زندگی، تعلیمات وسیاسی افکار، ص ۱۴۔

20۔ ایضاً، ص ۱۵۔

21۔ ایضاً، ص ۱۶۔

22۔ ایضاً، ص ۱۷۔

23۔ ایضاً۔

24۔ ایضاً، ص ۱۸۔

25۔ ایضاً، ص ۱۹۔

26۔ محمد عبدالقدوس قاسمی، مضامین جمال الدین افغانی، ادارہ فروغ اردو، اردو بازار لاہور، ص ۵۹۔

27۔ ضیاء الحسن فاروقی، فکر اسلامی کی تشکیل جدید، مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور، ص ۳۹۷۔

28۔ آل عمران، ۱۳۹:۳۔

29۔ القصص، ۷۷:۲۸۔

30۔ النور، ۵۵:۲۴۔

31۔ النساء، ۱۴۱:۴۔

32۔ الحج، ۴۱:۲۲۔

قرآنی آیات

۱۔ وما اللّٰہ بغافل عمّا تعملون، ص۱۷۳۔

۲۔ واللّٰہ یھدی من یّشاء، ص۱۷۳۔

۳۔ ولا تکونوا کالّذین تفرّقوا اختلفوا من بعد ما جاء ھُم البیّنات واولئک لھم عذاب عظیم، ص۱۹۶۔

۴۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن کنتم مؤمنین، ص۲۸۳۔

۵۔ الّذین قال لھم النّاس انّ النّاس قد جمعوا الکم فاخشوھم فزادھم ایمانًا وّقالوا حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل فانقلبوا بنعمة مّن اللّٰہ وفضل لّم یمسسھم سوءٌ واتّبعوا رضوان اللّٰہ واللّٰہ ذو فضلٍ عظیم، ص۱۶۲۔

۶۔ ومن یّشاقق الرّسول من بعدِ ما تبیّن لہ الھدی ویتّبع غیر سبیل المؤمنین نولّہ ما تولیٰ ونصلہ جھنم وسائت مصیرًا تعاونوا علی البرّ والتّقوی، ص۱۷۳۔

۷۔ "الذین إن مکناھم فی الأرض أقاموا الصلاة وآتو الزکوة وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبة الأمور، ص۲۸۳۔

۸۔ "ولن یجعل اللّٰہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا، ص۲۸۳۔

۹۔ تعاونوا علی البرّ والتقوی، ص۱۷۴۔

۱۰۔ الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم واقیموا الصلوة واتوا الزکوة. فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیة اللّٰہ او اشد خشیة وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لو لا اخرتنا الی اجل قریب، ۱۶۴۔

۱۱۔ رضوا بان یّکون مع الخوالف وطبع اللّٰہ علی قلوبھم فھم لا یفقھون، ص۱۷۲۔

۱۲۔ وقل اعملوا فسیری اللّٰہ عملکم ورسولہ والمؤمنون ثمّ تردّون الی عالم الغیب والشّھادة فینبّئکم بما کنتم تعلمون، ص۱۷۰۔

۱۳۔ "واتبع فیما اتاک اللّٰہ الدار الآخرة ولا تنس نصیبک من الدنیاوأحسن کما أحسن اللّٰہ إلیک، ص۲۸۲۔

۱۴۔ "وعد اللّٰہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الأرض کما استخلف الّذین من قبلھم"، ص۲۸۳۔

۱۵۔ وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احدهما علی الاخری فقاتلوا الّتی تبغی حتّی تفیئی الی امر اللّٰہ، ص۱۷۳۔

اشاریہ شخصیات

الف

ب

پ

ت

ث

ٹ

ع

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

و

ہ

اماکن

الف

ب

بھ

پ

ت

ن

و

ھ

ی

کتابیات

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	پبلشر	سال
۱۔	ابوالحسن ندوی	تاریخ دعوت وعزیمت	ادارہ ثقافت اسلامیہ، کراچی	
۲۔	ابوالحسن ندوی	ہندوستانی مسلمان	مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنؤ	۱۹۶۱ء
۳۔	ابوالحسن ندوی	مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	مجلس نشریات اسلام، کراچی	۱۹۷۴ء
۴۔	ابوسلیمان، ڈاکٹر	مقالات عبیداللہ سندھی	مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی کراچی	۱۹۹۴ء
۵۔	ابو الفضل (مترجم) وجاہت حسین شیخ	انشائے ابوالفضل	مطبع برقی اعظم، حیدرآباد	۱۰۴۷ھ
۶۔	احسان الحق	تحریک وتاریخ پاکستان	علمی کتاب خانہ لاہور	۱۹۸۰ء
۷۔	احمد حسین، ڈاکٹر	علمائے حق	الحمود اکیڈمی، اردو بازار لاہور	۱۹۸۷ء
۸۔	احمد شلبی، ڈاکٹر	تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ	ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور	۱۹۸۹ء
۹۔	احمد میاں اختر، قاضی	علم اور اسلام	معارف پریس، اعظم گڑھ	۱۹۳۵ء
۱۰۔	ادیب اسحاق	الدرر	مصر	ت۔ن
۱۱۔	اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر	ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (مترجم بلال احمد زبیری)	کراچی	۱۹۶۷ء
۱۲۔	اصغر حیات	شیخ الہند	دار الکتب اصغریہ دیوبند ضلع سہارنپور	۱۹۴۸ء
۱۳۔	افضل حق	تاریخ احرار	دہلی	۱۹۸۶ء
۱۴۔	افضل محمد میاں	سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکہ تک	مجاہد اکیڈمی لاہور	۱۹۹۹ء
۱۵۔	اکبر شاہ خان، نجیب آبادی	تاریخ اسلام	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۸۶ء

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سن
۱۶۔	امداداللہ صابری	فرنگیوں کا جال	امداد صابری پبلشرز، محلہ چوڑی دلاں، دلی	۱۹۴۹ء
۱۷۔	ایم این رائے (مترجم) گوپال	انقلاب کی تاریخ	قتل، مطبعہ اردو لاہور	ندارد
۱۸۔	ثروت وصولت	تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ	اسلامک پبلیکیشنز لاہور	۱۹۷۲ء
۱۹۔	ثناءاللہ امرتسری	مقدس رسول	ندوۃ المحدثین، گوجرانوالہ	
۲۰۔	جرجی زیدان، علامہ	مشاہیر الشرق	مصر	
۲۱۔	جرمانوس عبدالکریم، ڈاکٹر (مترجم) پروفیسر محمد سرور	مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	س۔ن
۲۲۔	جمال الدین افغانی	الرد علی الدھرین (فارسی سے عربی ترجمہ، مفتی عبدہ)	مطبع رحمانیہ، قاہرہ	۱۹۲۵ء
۲۳۔	جمال الدین افغانی	حقیقت نیچری و نیچریان	شعر وادب لاہور	ندارد
۲۴۔	جمال الدین افغانی	تمتہ البیان فی تاریخ افغان	مصر	۱۹۰۱ء
۲۵۔	جمال الدین افغانی محمد عبدہ	العروۃ الوثقیٰ	دار العرب، قاہرہ	۱۹۵۷ء
۲۶۔	حسین احمد مدنی	تحریک ریشمی رومال	کلاسک دی مال لاہور	۱۹۸۸
۲۷۔	حسین محی الدین، الجبال	مضامین عروۃ الوثقیٰ	مصر	۱۹۱۰ء
۲۸۔	حیدر رضا صدیقی	اگر پاکستان نہ بنتا	بیکن ہاؤس، گلگشت کالونی ملتان	۱۹۹۳
۲۹۔	خلیق احمد نظامی	سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات	نگارشات، لاہور	۱۹۹۰
۳۰۔	دائرہ معارف اسلامیہ	پنجاب یونیورسٹی	لاہور	
۳۱۔	رشید احمد	افکار شاہ ولی اللہ	ایم وائی پرنٹرز بیگم روڈ لاہور	۱۹۸۶
۳۲۔	رفیق زکریا، ڈاکٹر	محمد اور قرآن	خلیق انجم حرف آغاز، نکسن بک ہاؤس لاہور	۱۹۶۶
۳۳۔	زاہد منیر عامر	نقوش جاوداں	المحمود اکیڈمی اردو بازار لاہور	۱۹۸۷

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سن
۳۴۔	زبیر احمد ڈاکٹر	عربی ادبیات پاک و ہند کا حصہ	ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور	۱۹۸۷
۳۵۔	تخی احمد ہاشمی	شبلی کا ذہنی ارتقاء	مجلس یادگار ہاشمی، کراچی	س۔ن
۳۶۔	سعید احمد اکبر آبادی	عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد	المحمود اکیڈمی، اردو بازار لاہور	۱۹۴۶
۳۷۔	سعید احمد اکبر آبادی	مولانا عبیداللہ سندھی کے چند مشاہدات	رسالہ نئی دنیا، دہلی	۱۹۵۹ء
۳۸۔	سعید احمد مولوی	رسوم دہلی	مطبوعہ رام پور	۱۹۶۵ء
۳۹۔	سلیمان ندوی علامہ	شخصیت و ادبی خدمات	المحمود اکیڈمی اردو بازار لاہور	س۔ن
۴۰۔	سلیمان ندوی سید	نقوشِ سلیمانی	اردو اکیڈمی، سندھ کراچی	۱۹۶۷
۴۱۔	شاہد حسین رزاقی	سید جمال الدین افغانی	ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ لاہور	
۴۲۔	صادق حسین قریشی (مترجم)	ہمارے ہندوستانی مسلمان (W.w. hunter, our indian Muslims)	قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ	۱۹۵۵ء
۴۳۔	صباح الدین عبدالرحمٰن سید	ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد	
۴۴۔	صلاح الدین اقبال	تاریخ پنجاب	عزیز پبلشرز لاہور	۱۹۷۳
۴۵۔	ضیاء الحسن فاروقی	فکر اسلامی کی تشکیل جدید	مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور۔	
۴۶۔	ظفر حسن ایبک	آپ بیتی	منصور بک ہاؤس، لاہور	
۴۷۔	عبدالحمید خان	مولانا احمد علی کے حالات	فیروز سنز لاہور	۱۹۶۴ء
۴۸۔	عبدالحئی	نزھۃ الخواطر	حیدر آباد دکن	۱۹۷۰ء
۴۹۔	عبدالحئی فاروقی	بصائر	المحمود اکیڈمی، اردو بازار لاہور	۱۹۸۹ء
۵۰۔	عبدالخالق	خطبات و مقالات عبیداللہ سندھی	ادارہ تحقیق و اشاعت، شاہراہ فاطمہ جناح سنٹر، لاہور	ندارد

۵۱۔	عبدالرحیم، مولانا	سید جمال الدین افغانی	محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی، کراچی نمبر ۵	س۔ن
۵۲۔	عبدالرشید ارشد	برصغیر پاک و ہند کے بیس بڑے مسلمان	کلاسک دی مال لاہور	۱۹۶۹
۵۳۔	عبدالغفار، قاضی	آثار جمال الدین افغانی	انجمن ترقی اردو، دہلی	۱۹۴۰ء
۵۴۔	عبدالقادر بدایونی (مترجم) محمود احمد فاروقی	منتخب التواریخ	شیخ غلام رسول اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور	۱۹۶۲ء
۵۵۔	عبدالقدوس ہاشمی	مضامین جمال الدین افغانی	ادارہ فروغ اردو لاہور	س۔ن
۵۶۔	عبداللہ بٹ	جمال الدین افغانی	قومی کتب خانہ لاہور	۱۹۵۰ء
۵۷۔	عبدالمجید سواتی	مولانا عبیداللہ سندھی کے علوم و افکار	ادارہ نشر و اشاعت، مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ لاہور	۱۹۹۰ء
۵۸۔	عبیداللہ سندھی مولانا	قرآنی دستور انقلاب	ادارہ نشریات اسلام، اردو بازار لاہور	۱۹۴۷
۵۹۔	عبیداللہ سندھی مولانا	قرآنی فکر انقلاب اور جنگ انقلاب	ادارہ حکمۃ اسلامیہ لاہور	۱۹۸۲
۶۰۔	عبیداللہ سندھی مولانا	سورح فتح کی تفسیر	ادارہ حکمۃ اسلامیہ لاہور	۱۹۸۲
۶۱۔	عبیداللہ سندھی مولانا	انقلاب	مکتبہ بیت الحکمت لاہور	۱۹۴۰
۶۲۔	عبیداللہ سندھی مولانا	قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے	المحمود اکیڈمی، اردو بازار لاہور	۱۹۲۹
۶۳۔	عبیداللہ سندھی مولانا	قرآنی عنوان انقلاب سورۃ فتح کی حکیمانہ انقلابی تفسیر	مکتبہ بیت الحکمت لاہور	۱۹۴۶
۶۴۔	عبیداللہ سندھی مولانا	المقام المحمود	سندھ یونیورسٹی پریس حیدر آباد سندھ	۱۹۵۹
۶۵۔	عبیداللہ سندھی	کابل میں سات سال	سندھ ساگر اکادمی، لاہور	۱۹۸۷ء

۶۶۔ علی بن حامد	چچ نامہ ترجمہ قلیچ فریدون	کراچی	۱۹۰۰
۶۷۔ غلام مصطفیٰ ڈاکٹر	مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگزشت کابل	قومی ادارہ تحقیق اسلامی آباد	۱۹۸۰
۶۸۔ غلام مصطفیٰ قاسمی	خلاصہ قرآن	عزیز اللہ پبلی کیشنز نشتر آباد پنو عاقل سندھ	۱۹۶۲
۶۹۔ فیوض الرحمٰن حافظ وقاری	مشاہیر علمائے دیوبند	المکتبہ عزیزیہ اردو بازار لاہور	۱۹۶۲
۷۰۔ کامران	تحریک پاکستان	فیروز سنز لاہور	۱۹۶۷
۷۱۔ کنہیال ہندی	تاریخ پنجاب	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۸۱
۷۲۔ گستو لیبان (مترجم حسن بلگرامی)	تمدن ہند	مقبول اکیڈمی لاہور	۱۹۶۲
۷۳۔ لطف اللہ مرزا	شرح حال وآثار سید جمال الدین	برلن	۱۳۰۴ھ
۷۴۔ محمد ادریس ایل	تحریک ریشمی رومال	المحمود اکیڈمی، اردو بازار لاہور	۱۹۸۷ء
۷۵۔ محمد اسحاق بھٹی	فقہائے ہند	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	س۔ن
۷۶۔ محمد اسماعیل	تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ	مکتبہ نذیریہ، لاہور	۱۹۶۶ء
۷۷۔ محمد اکرام شیخ	موج کوثر	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	س۔ن
۷۸۔ مبارز الدین رفعت	مقام جمال الدین افغانی	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۴۹ء
۷۹۔ مجدد الف ثانی	نور اسلام	المکہ پریس، فاطمہ جناح روڈ، لاہور	۱۹۸۸ء
۸۰۔ مجدد الف ثانی	مکتوب ربانی	مدینہ پبلشنگ کمپنی، بندر روڈ کراچی	۱۹۸۷ء
۸۱۔ محمد رفیق	تحریک تاریخ پاکستان	مکی سنٹر لاہور	۱۹۷۷ء
۸۲۔ محمد سرور	خطبات ومقالات	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	۱۹۸۱
۸۳۔ محمد سرور	تحریک پاکستان کا ایک باب	المحمود اکیڈمی اردو بازار لاہور	۱۹۸۹

۸۴۔	محمد سرور	مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات زندگی وسیاسی افکار	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	ت۔ن
۸۵۔	محمد سرور	افادات وملفوظات	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور	۱۹۸۷
۸۶۔	محمد سعید	آہنگ بازگشت	۹۔سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی	۱۹۷۹ء
۸۷۔	محمد سلیم	مولانا عبیداللہ سندھی کے سیاسی مکتوبات	ندوۃ المصنفین لاہور	۱۹۵۵ء
۸۸۔	محمد عبدالقدوس قاسمی	مضامین جمال الدین افغانی	ادارہ فروغ اردو بازار لاہور	س۔ن
۸۹۔	محمد عبداللہ سید	سید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	س۔ن
۹۰۔	محمد عبدہ، علامہ	سید جمال الدین افغانی	محمد علی ایجوکیشن سوسائٹی، کراچی	س۔ن
۹۱۔	محمد علی قصوری	مشاہدات کابل	یاغستان، کراچی	س۔ن
۹۲۔	محمد علی چراغ	تاریخ پاکستان	سنگ میل، لاہور	۱۹۸۶ء
۹۳۔	محمد عمر، ڈاکٹر	ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	پاک اکیڈمی کراچی	
۹۴۔	محمد لطیف	تاریخ پنجاب	سنگ میل لاہور	۱۹۸۴ء
۹۵۔	محمد میاں سید	علماء ہند کے مجاہدانہ کارنامے	مکتبہ رشیدیہ کراچی	۱۹۹۴ء
۹۶۔	محمد میاں سید	علمائے حق	مراد آباد	۱۹۴۶ء
۹۷۔	محمد میاں سید	تحریک شیخ الہند	مکتبہ رشیدیہ کراچی	۱۹۷۵ء
۹۸۔	محمد میاں سید	مسلمانوں کا روشن مستقبل	مکتبہ رشیدیہ کراچی	س۔ن
۹۹۔	محمود قاسم	جمال الدین افغانی، حیات وفلسفہ	قاہرہ	۱۹۱۵ء
۱۰۰۔	مرزا ادیب	جمال الدین افغانی	آئینہ ادب لاہور	۱۹۶۶ء
۱۰۱۔	مطلوب علی زیدی	شعور وآگہی	المحمود اکیڈمی اردو بازار لاہور	۱۹۸۹
۱۰۲۔	مطلوب علی زیدی	دعوت فکر وعمل	المحمود اکیڈمی اردو بازار لاہور	۱۹۸۹
۱۰۳۔	مناظر احسن گیلانی	سوانح قاسمی	مکتبہ رحمانیہ، ۱۸ اردو بازار لاہور	س۔ن
۱۰۴۔	موسیٰ جار اللہ	الہام الرحمٰن فی تفسیر القرآن	دہلی	ت۔ن

English Books

1. Jawahar Lal Nehroo, An Autobiography John Lane, London, 1936.
2. Brockelmann Carl Gescblchate Der. Arabisc hem Literatwre, 5 vols, Weimas and Leyde1898.

3.MuhammadYousaf Maulana, A short History of India (Translated by Sadiq Hussain Qureshi) Qaumi Kutab Khana, Railway Road Lahore, 1955.

4. Sattar Mian, History of Indian Nationalism, Madras,1936.
5. Sir Sharma, The Religions Policy of the Moghals, Orient Publishers and Book Sellers, Indise Lohari Gate Lahore, 1975.
6. Sitaramayya B Pittabhi, History of Indian National Congress, Madras, 1936.
7. Razi wasti Syed, Lord Minto and the Indian National Movement, People Publications, Lahore 1976.

اخبار ورسائل:

۱۔ رسالہ الولی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۸۶ء۔

۲۔ رسالہ تاریخ وسیاست، کراچی، فروری ۱۹۵۴ء۔

۳۔ مارننگ نیوز، کلکتہ، عید نمبر ۱۹۴۳۔

۴۔ ماہنامہ معلم شفیق، حیدرآباد دکن، ۱۸۸۰ء۔

۵۔ مجلہ جامعہ علی گڑھ، ۱۹۲۴۔

۶۔ مجلہ مہران، حیدرآباد، ۱۹۵۷ء۔